



آخری دیدار



نماز جنازہ



صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان باقاعدہ بابائے اردو
کی آخری آرام گاہ پر پھول چڑھا رہے ہیں ۔



کیا قافلہ جاتا ہے .....



آخری منزل



صدر پاکستان کے اے ڈی سی اور بحریہ پاکستان کے باشندے
پھولوں کی چادر ڈال رہے ہیں



چالیسویں کے روز انجمن کے معتمد جناب اے۔کے صوفی
اور پرنسپل اردو کالج کرنل عطاء الرحیم مرقد بابا پر
پھول چڑھا رہے ہیں



اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

بیادگار بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم و مغفور

پندرہ روزہ

قومی زبان

کراچی

کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا پندرہ روزہ ترجمان

جلد ۱۹ شمارہ ۴ تا ۱۲

۱۵ اگست سنہ ۱۹۶۱ء

تا

۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء

قیمت سالانہ: پانچ روپے — دس شمارے کی قیمت

فی پرچہ: ۲۵ پیسے — ایک روپیہ پچھتر پیسے

کل پاکستان انجمن ترقی اردو

اردو روڈ۔ کراچی ۱

فہرست

[illegible] اسلامیہ دہلی

کیا قافلہ جاتا ہے!

لکھنے والوں پر کبھی کبھی یہ حادثہ بھی گذرتا ہے کہ وہ لفظ و معنی کے باہمی تعلق کو سمجھنے سمجھانے سے قاصر رہ جاتے ہیں یعنی کبھی مفہوم و مطالب کے لئے الفاظ نہیں ملتے اور کبھی الفاظ سے وہ معنی پیدا نہیں ہوتے جن کا اظہار مطلوب ہوتا ہے۔ ان سطور کے راقم کو بھی اس وقت کچھ ایسا ہی معاملہ درپیش ہے اور وہ یہ سوچ رہا ہے کہ مولوی صاحب کی رحلت کے بارے میں وہ کیا کہے اور کس طرح کہے۔ مولوی صاحب کی موت اگر صرف ایک فرد کی موت ہوتی تو چند تعریفی کلمات سے انہیں یاد کر کے تعزیت کا حق ادا کیا جا سکتا تھا لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ یہ موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک عظیم الشان عہد کا خاتمہ، ایک عدیم النظیر تحریک کا دمِ واپسیں اور ایک فقید المثال ادارے کا سکوت دائمی ہے ——— "عبدالحق" ایک فرد کا نام سہی لیکن یہی نام ہماری اعلیٰ ترین ثقافتی قدروں کی علامت بھی بن گیا ہے۔ یہی علامت گذشتہ ایک صدی کی علمی ادبی اور سماجی روایات کا آئینہ ہے۔

مولوی عبدالحق اگر صرف ایک نقاد اور محقق ہوتے تو ان کی دائمی مفارقت کا غم اتنا شدید نہ ہوتا کیونکہ رسم دنیا یہی ہے کہ جب ایک فرد اٹھتا ہے تو اس کی جگہ کے لئے اور کئی افراد پیدا ہو جاتے ہیں لیکن مولوی عبدالحق ایک عظیم ثقافتی رہنما تھے اور اسی لئے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جو جگہ خالی کی ہے وہ شاید کبھی پر نہ ہو سکے اس بات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فوق البشر تھے بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ عام انسانوں کی طرح وہ بھی گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان تھے اور ان میں بھی وہ سب کمزوریاں ہو سکتی ہیں جو عام انسانوں میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں جو خوبیاں تھیں وہ عام انسانوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خوبیوں کی وجہ سے اُن کی

ذات ہم سب کے لئے مشعل راہ تھی ۔

مولوی صاحب ہمارے ماضی اور حال کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے تھے جو سرسید کو آج کے دور سے ملاتی تھی ۔ اور اب یہ کڑی موجود نہیں رہی ۔ بزم سید کی یہ آخری شمع گل ہو گئی ، وہ زندہ تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بزم سید ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ، مولوی صاحب ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے ہیں تو سرسید ، حالی ، وقار الملک اور محسن الملک جیسے مشاہیر کا غم بھی تازہ ہو گیا ہے ۔

مولوی صاحب نے ایک عظیم مقصد کو سامنے رکھ کر زندگی گذاری اور جو لوگ کسی مقصد کی خاطر زندگی گزارتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے ۔ اگرچہ وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں لیکن ان کے عظیم الشان کارنامے ہمیشہ ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے ۔

مرنے والے کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس کے پس ماندگان کا تذکرہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ مولوی صاحب کے پس ماندگان میں ان کے اعزہ اقارب ہی شامل نہیں ––––– اردو زبان بھی ہے ––––– اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس سے کیا سلوک کرتے ہیں !

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اقبال)

کچھ اس شمارے کے بارے میں

"قومی زبان" کا یہ شمارہ بابائے اردو کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں صرف وہی مضامین شامل کئے گئے ہیں جو بابائے اردو کی وفات کے بعد مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔ ہماری کوشش تو یہی کہ حتی الامکان تمام مطبوعہ مضامین کو یکجا کر دیا جائے لیکن ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ مضامین کی فراہمی کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ چونکہ پرچے کی اشاعت میں مزید تاخیر مناسب نہیں اس لئے جو کچھ فراہم ہو سکا وہ شامل کر دیا گیا ہے۔

جب اس رسالے کی ترتیب کا پروگرام بنایا گیا تو خیال تھا کہ تمام تعزیتی پیغامات، قراردادیں اور خطوط بھی اس میں شامل کر دئے جائیں لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہ ہو سکا کیونکہ یہ تمام مواد کئی سو صفحات میں آتے گا۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ تمام تحریریں "قومی زبان" کے آیندہ شماروں میں بالاقساط شائع کر دی جائیں۔

بہت سے اخبارات و جرائد کے اداریے اور دیگر تحریریں جو مولوی صاحب مرحوم سے متعلق شائع ہوئیں وہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ ہم اپنے معاصرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی تمام تحریروں کے تراشے ہمیں ارسال فرمائیں تاکہ انہیں "قومی زبان" میں شائع کیا جا سکے۔

"قومی زبان" کے اس تعزیتی نمبر کو کسی اعتبار سے بھی مرحوم بابائے اردو کی عظیم شخصیت کے شایان شان نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ اول تو یہ تمام تحریریں مطبوعہ ہیں دوسرے ان کا تعلق اس فوری جذبے سے ہے جو مولوی صاحب کی وفات سے اہل علم کے دلوں میں پیدا ہوا۔ بابائے اردو کی شخصیت اور افکار سے متعلق جامع مضامین کی ابھی ضرورت ہے ——— ہمارا تو یہ ارادہ ہے کہ مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر رسالہ "اردو" کی ایک بلند پایہ اشاعت خصوصی شائع کی جائے جو صحیح معنوں میں "عبدالحق نمبر" کہلانے کی مستحق ہو۔ اس سلسلہ میں اہل قلم اور خاص طور پر ان حضرات سے جنہیں مرحوم کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے، ہماری درخواست ہے کہ وہ توجہ فرمائیں تاکہ یہ نمبر بہتر سے بہتر ہو سکے۔

"قومی زبان" کا گزشتہ شمارہ یکم اگست ۱۹۶۱ء کو شائع ہوا تھا۔ زیر نظر شمارہ ۱۶ اگست سے ۱۶ دسمبر ۱۹۶۱ء تک مشترکہ شمارہ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ پرچہ پابندی سے شائع کرنے سے قاصر رہے۔ یہ بے قاعدگی آئندہ نہ ہوگی، اور پرچہ وقت پر شائع ہوگا۔

بابائے اردو کی وفات پر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

صدر پاکستان کا

تعزیتی پیغام

مولوی عبد الحق کی وفات ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ ان کے انتقال سے ہم علم و ادب کے ایک عظیم پرستار سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک مضبوط اور غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے ان کی ذات، برصغیر پاک و بھارت کے گزشتہ ایک سو سال کے اسلامی کلچر کی مظہر تھی۔ ان کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک عظیم ادارے کے ختم ہو جانے کے برابر ہے۔

ذاتی طور پر میں ایک گہرے دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔ اپنے مقصد سے انہیں جو گہرا لگاؤ تھا میں ہمیشہ اس سے فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

بابائے اردو کی وفات پر

قدرت اللہ شہاب

سکریٹری جنرل

پاکستان رائٹرز گلڈ

کا

تعزیتی پیغام

علم و حکمت کے سر سے ایک بزرگ مشفق کا سایہ اٹھ گیا جو لوگ کچھ سیکھنا اور کچھ کرنا چاہتے تھے مولوی عبدالحق ان کے لئے پورے ایک دور کا تجربہ پیش کرسکتے تھے۔ اگر اردو کے مقصد کو کسی طرح بھی فائدہ پہنچایا جاسکتا تو اس مقصد کی راہ میں وہ نہ تو کسی چیز کو معمولی سمجھتے تھے اور نہ کسی کمترین حیثیت کے شخص کو ناقابل توجہ سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق کی شخصیت منفرد تھی۔ علم و فن کی حیرت ناک صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان میں حد درجہ بذلہ سنجی اور علمی فراست بھی تھی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے رجسٹر پر انہوں نے سب سے پہلے دستخط کئے جو ہمارے لئے ہمیشہ ایک قابل فخر یادگار رہیں گے۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی انتھک محنت کا جذبہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ پورے ادب و احترام کے ساتھ انہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمیں علم کی شمع بلند رکھنے کی توفیق دے جسے انہوں نے اس قدر بہادری اور جرات کے ساتھ روشن کیا تھا۔

انجمن ترقی اردو کی قرار داد تعزیت

۱۸ اگست ۱۹۶۱ء کو انجمن کے دفتر میں مجلس انتظامیہ کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں تمام اراکین نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی گئی:

کل پاکستان انجمن ترقی اردو کی مجلس انتظامیہ کا یہ ہنگامی اجلاس انجمن کے صدر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ بابائے اردو کی جامع حیثیات شخصیت نہ صرف ہماری علمی و ادبی قدروں کی علم بردار تھی بلکہ پوری ایک صدی کی تہذیبی علامت تھی۔ اس انسانی پیکر میں علم و فضل کی ایک وسیع دنیا آباد تھی اور اس وسیع دنیا کا اجڑ جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ بابائے اردو نے ہر اعتبار سے برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار سرسید احمد خان کے تربیت یافتہ ہونے کا حق ادا کیا، اور ایک طویل عرصہ تک علم و ادب کی خدمت کرکے یہ ثابت کر دیا کہ کسی ایک مقصد کی لگن کسی فرد واحد سے بھی وہ کام لے سکتی ہے جو بڑے بڑے اداروں کے امکان میں بھی نہیں ہوتا۔ دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا کہ جس نے تمام زندگی زبان کی ترویج و اشاعت میں صرف کی ہو۔ اس اعتبار سے اردو زبان یقیناً خوش قسمت ہے کہ جسے بابائے اردو جیسا ادیب، ادیب گر، محقق، نقاد اور رہنما ملا۔ انہوں نے

اردو زبان کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کو واضح کیا اور اپنی تمام توانائیوں کو صرف کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ اردو اور صرف اردو ہی برصغیر کی واحد عوامی زبان ہے۔

بابائے اردو کی دائمی مفارقت پوری اردو دنیا اور خاص طور پر پاکستان کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ انجمن ترقی اردو انہیں کی ساختہ و پرداختہ ہے یہ انہیں کے خون جگر کے طفیل ہند و پاکستان کا سب سے بڑا علمی ادارہ بن سکی انجمن کی مجلس انتظامیہ کے اراکین اس جانکاہ واقعہ پر اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ اگرچہ بابائے اردو کا وجود مادّی طور پر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے، لیکن ان کی زندگی اور شخصیت انجمن ترقی اردو کی صورت میں اب بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اراکین مجلس انتظامیہ اپنے اس فرض سے بخوبی واقف ہیں کہ بابائے اردو سے عقیدت کا اظہار ایک اور صرف ایک ہی طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مقاصد کی تکمیل کی جائے۔

●

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

کیا قافلہ جاتا ہے گر تو بھی چلا چاہے

مولانا عبدالماجد دریابادی

بابائے اردو

یونانیوں کے مذاق مذہب کے موافق اردو زبان اگر دیوی ہوتی تو شاید اس کے مندر کے سب سے بڑے پجاری اور پروہت ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہی ہوتے۔ اپنے کو اس کی خدمت میں ایسا لگایا، لگایا کیا یہ کہیے کہ مٹایا، کہ عرف ہی بابائے اردو پڑ گیا۔ اور اس عرفیت کی شہرت رفتہ رفتہ اصل نام پہ غالب آ گئی۔

سنہ غالباً ۱۹۰۳ء تھا کہ وقت کی سب سے بڑی ملی و تعلیمی مجلس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ شعبۂ علمیہ کے نام سے قائم ہوئی اور اس کے سکریٹری مولانا شبلی قرار پائے۔ پھر جب وہ ندوہ وغیرہ کے مشغلے میں پڑ کر اس عہدے سے سبکدوش ہوئے تو ان کی جانشینی مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے حصہ میں آئی۔ اور جب وہ بھی ہٹ گئے تو قرعۂ انتخاب علی گڑھ کے ایک بڑے ممتاز اولڈ بوائے، عزیز مرزا دہلوی کے نام پڑا، سنہ غالباً ۱۹۱۱ء ہوگا۔ جب وہ حیدرآباد کے ایک بڑے عہدے سے الگ ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے اور مستقل قیام لکھنؤ میں اختیار کیا تھا۔ انہیں کے سپرد یہ خدمت شعبۂ علمیہ کی بھی ہوئی اور اب اس شعبہ نے بجائے کانفرنس کا ایک ماتحت شعبہ ہونے کے خود ایک مستقل ادبی و علمی انجمن کی شکل اختیار کرنا شروع کی۔

عزیز مرزا مرحوم بڑے ذہین و طباع بڑے فرض شناس اور بڑے مسلمان آدمی تھے۔ لیکن بیچارہ کی عمر نے وفا نہ کی اور ابھی کام قابل ذکر کرنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک معمولی سے آپریشن کے سلسلہ میں (میڈیکل کالج اسپتال لکھنؤ کے ایک وارڈ میں مقیم تھے) زہرباد ہو گیا اور سفر آخرت کو روانہ ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۱۲ء تھا کہ کانفرنس کا زبردست سالانہ اجلاس میجر سید حسن بلگرامی کی زیر صدارت لکھنؤ قیصر باغ بارہ دری میں منعقد ہوا، اور اس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم کی تجویز پر شعبہ کی نظامت پر بالاتفاق تقرر مولوی عبدالحق کا ہوا۔ مولوی صاحب جوانی سے اتر چکے تھے۔ لیکن داڑھی اب تک تقریباً

بالکل سیاہ تھی۔ تن دہی، فرض شناسی، کارگزاری، انہماک اور علم و ادب کی خدمت کے ذوق و انہماک کی شہرت اس وقت بھی تھی ـــــ میرا سن ۲۰ سال کا تھا کالج سے گریجویٹ ہو کر اسی سال نکلا تھا۔

مولوی صاحب کا وہ بھرا ہوا، متین و سنجیدہ چہرہ اب تک دل پر جما ہوا ہے لوگ ان کی تعریفیں لکا رہے تھے اور وہ جیسے کسی گہرے سوچ میں ڈوبے ہوئے یہ سب گویا سن ان سنی کر رہے تھے۔ ڈائس پر انہیں جگہ بہ آسانی مل سکتی تھی اور وہ اپنی شخصیت کو بے کھٹکے نمایاں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے راہ خود نمائی کی نہیں خود فراموشی کی اختیار کی اور اسی افتاد طبیعت نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا ـ ڈائس سے بہت دور عام سامعین کی صف میں ایک کرسی پر بیٹھے۔

موصوف اس وقت حیدرآباد میں ہیڈ ماسٹری وغیرہ کی منزلیں طے کر کے قسمت اورنگ آباد کے انسپکٹر آف اسکولز کے خاصے معزز و مشغول عہدے پر تھے اور اس پر فضا شہر کے ایک پر فضا بنگلے میں خوشنما مقبرہ ملکہ رابعہ درانی کے متصل رہ رہے تھے۔ خیال یہ تھا کہ اپنے سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ اس آنریری قومی خدمت کو (جس کے لئے کوئی معمولی الاؤنس تک نہ تھا) محض ضمنی طور پر اور حسب فرصت انجام دے سکیں گے۔ لیکن عملی تجربہ اس خیال کے برعکس ہوا۔ کام ان کے ہاتھ میں آتے ہی جیسے کام میں بجلی لگ گئی۔ کام اس تیزی، مستعدی اور باقاعدگی سے شروع ہو گیا کہ کوئی تنخواہ دار اور پورا وقت دینے والا مستقل سکریٹری بھی ہوتا تو وہ بھی شاید اس سے زیادہ نہ کر سکتا اچھی اچھی کتابیں، کیا ترجمہ اور کیا تصنیف، فلسفہ و تاریخ، سائنس و سوانح عمری، ادب ہر فن پر نکلنے لگیں۔ میری ابتدائی کتابیں "فلسفۂ جذبات"، "فلسفۂ اجتماع اور ترجمۂ "تاریخ اخلاق یورپ" اور "تاریخ تمدن انگلستان" سب انجمن ہی کی چھپوائی ہوئی، اور اس وقت کے معیار سے معقول معاوضہ پر، موصوف ہی کی لکھوائی ہوئی ہیں۔ چند ہی سال کے اندر انجمن ترقی اردو نے ایک مستقل ادارہ کی حیثیت رکھی اور اب وہ کانفرنس کی شاخ باقی نہ رہی وقت کچھ اور رکھتا اور اب انجمن کی طرف سے ایک شاندار ضخیم بلند پایہ سہ ماہی رسالہ اردو کے نام سے نکلنے لگا۔ موصوف کی شہرت ایک اہل قلم کی حیثیت سے اب تک مقدمہ نگار ہی کی تھی۔ ایک دو نہیں چند در چند کتابوں کے وہ مفصل، ضخیم اور مبصرانہ مقدمے لکھ چکے ہیں اور اردو کے نکلنے کے بعد علاوہ مقالوں کے وہ تبصرے بھی اسی پیمانے پر لکھنے لگے۔ سرسید کے رفیق مولوی چراغ علی مرحوم کی کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ بھی تحقیق الجہاد یا اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام کے نام سے شاید اسی زمانے میں کر چکے تھے۔ قواعد اردو کی بھی تصنیف کا غالباً یہی زمانہ ہے ـــــ کچھ روز بعد انہیں خیال انگریزی کی مشہور کنسائز آکسفرڈ ڈکشنری کا آیا، اور اس کے مختلف اجزا انہوں نے ترجمہ کے لئے مختلف لوگوں میں تقسیم کر دئے۔ چناں چہ انگریزی حرف "E" کی ردیف کا ترجمہ اس خاکسار کے حصہ میں آیا۔ اس کتاب کی

بابائے اردو کو شعرا کا خراجِ عقیدت

(اے۔ ڈی۔ اظہر)

اگلے وقتوں کا تھا اک بابا سو وہ بھی چل بسا — اپنے ہاں پہلے ہی پہلی سی وہ باتیں تھیں کہاں
تاکہ بھولیں ورثۂ تہذیب ملت کے ادیب — چارسو تھی طبیبوں کی تھیں چارہ سازیاں
کہتے تھے انگلش ہو رومن ہو لیں اک اردو نہ ہو — الغرض جتنے تھے منہ اتنی یہاں تھیں بولیاں
ایسے منہ زوروں کو اب ایک اور آزادی ملی — شرم بابا کی اٹھی اب ٹوکنے والا کہاں

جب کہا ہم نے کہو بابا کی تاریخ وفات
"شامِ غم" کہتا ہوا اظہر اٹھا نوحہ کناں

۱۳۸۱ھ

(سیفی زید آبادی)

سینکڑوں دشمن تھے اردو کے لئے — خشم چشمی طارمِ ازرق کی تھی
ناخدا ناپید ساحل ناپدید — حالت اک طوفاں زدہ زورق کی تھی
مٹ ہی جاتی دہر سے اردو زباں — شانِ احساں قادرِ مطلق کی تھی
دستِ قدرت سے حفاظت جس نے کی — دست قدرت شکل عبدالحق کی تھی

سالِ رحلت اس طرح سیفی لکھو
عمرِ اردو، عقل عبدالحق کی تھی

۱۳۸۱ھ

(بشیر فاروق)

گئے خلدِ بریں بابائے اردو — برہنہ سر ہوئی اب ہائے اردو
نظر آتا نہیں وہ جس نے برسوں — سنوارے گیسوئے لیلائے اردو
وہ ساقی اٹھ گیا محفل سے اپنی — جو تھا مست مئے صہبائے اردو
گیا وہ پاسباں علم و ادب کا — جو تھا فخرِ ادب شیدائے اردو
وہ دیدہ ور نہیں ہے انجمن میں — جو تھا اک دیدۂ بینائے اردو
نہیں ملتی کسی جامِ ادب میں — سرور و مستی مینائے اردو
وطن کو ناز تھا جس شخصیت پر — وہ تھا نازِ وطن دانائے اردو
یہ تھا ارشاد اس جانِ سخن کا — غزل ہے غازۂ زیبائے اردو
کہاں اب دل کشی حسنِ بیاں میں — کہاں وہ شوخیٔ سلمائے اردو
وہ مردِ حق مگر ہم میں نہیں ہے — وہ عبدالحق کہ تھا دانائے اردو
ابھی تو زخم تازہ تھا جگر کا — کہ رخصت ہو گئے بابائے اردو

کہاں سے لائے گا فاروق کوئی
جوابِ خدمتِ آقائے اردو

(محمد یونس قریشی)

وابستگانِ اردو آنسو بہا رہے ہیں — اک حشر فرطِ غم سے ہر سو اٹھا رہے ہیں

وہ پیار وہ محبت وہ التفات ان کے — یاد آ رہے ہیں ہم کو آنسو بہا رہے ہیں
اوجھل سہی نظر سے بیش نظر ہیں لیکن — علم و عمل کے نغمے اب بھی سنا رہے ہیں

یونس دفورِ غم سے یہ سلسلہ ہے جاری
اٹھ اٹھ کے اشک دل سے آنکھوں میں آ رہے ہیں

★

(نیرنگ نیازی)

گلستاں کو نئے پھولوں سے سنوارا تو نے — راہ دشوار کو آساں بنایا تو نے
بخش کر لفظ و معانی کا ذخیرہ تو نے — ادب خاص کو پھیلا دیا ہر جا تو نے
تیری کوشش ہی نے یہ رنگ دیا اردو کو
آج دنیا نے جو پہچان لیا اردو کو

وہ ترا طرز بیاں وہ تری ہر بات کا پیچ — کوئی کیا جانے ترے طرفہ خیالات کا لوچ
دُر مضموں کی چمک، نثر میں جذبات کا پیچ — نظم میں کیفیتیں، شعر میں نغمات کا لوچ
روح افکار کا بہتا ہوا دریا تو تھا
یعنی مجموعۂ اوصاف ثریا تو تھا

شعر اک نور ہے گنجینۂ انوار ہے تو — دائرہ علم ہے اور مرکز پرکار ہے تو
غالب و میر کی میراث کا حقدار ہے تو — دشمنوں کے لئے چلتی ہوئی تلوار ہے تو
تو نے اردو کو سر بام فلک پہنچایا
اور ہر حال میں اردو ہی کے غم کو کھایا

جان مغموم تھا تو، روح نگاراں تو تھا — بحر میں ایک امنڈتا ہوا طوفاں تو تھا
غم ہستی سے بھی سنتے ہیں گریزاں تو تھا — جس کا ایمان تھا اردو وہ مسلماں تو تھا
پاس جو کچھ تھا ترے وار دیا اردو پر
بابا اردو کے سبھی ہار دیا اردو پر

(آرزو اکبر آبادی)

تیرا دم تھا یادگار غالب و میر و نظیر — فخر اردوئے معلیٰ، خوش بیاں زریں رقم
تیری فکر عرفانی سے زباں پائی عروج — تیری دانائی سے نکلے گیسوئے اردو کے خم
عالم یکتا، صریر آرائے ملک نظم و نثر — تو سدھارا ایسے نازک وقت میں سوئے عدم
جبکہ تھی تیری ضرورت طالبان علم کو — اور لغات تازہ پر تھیں تیری نظریں مرتسم
دل سلگ اٹھے تری رحلت سے بابائے زباں
چشم ملت سے بہے ہیں آج ازحد اشک غم
۱۳۸۱ھ

(سید لیاقت علی نیر سعیدی)

رو رہے ہیں فدایانِ اردو ۔۔۔ یاد میں تیری اے جانِ اردو
تیرے جاں باز، تیرے فدائی ۔۔۔ ہونے دیں گے نہ کم شانِ اردو
سچّے دل سے تجھے زندگی بھر ۔۔۔ سب نے مانا ہے سلطانِ اردو
تیری عظمت کے سب معترف ہیں ۔۔۔ جس قدر ہیں ثنا خوانِ اردو
جگمگاتا رہے گا ہمیشہ ۔۔۔ آج کی طرح ایوانِ اردو
آج افسردہ و مضمحل ہیں ۔۔۔ سب کے سب جاں نثارانِ اردو
کم نہ ہوگی کبھی اس کی وسعت ۔۔۔ اور پھیلے کا دامانِ اردو

کیا اٹھے نیرِ خستہ جاں سے
تیرا غم اے نگہبانِ اردو

•

(غضنفر امروہوی)

اے غضنفر وصف کیا بابائے اردو کے لکھوں ۔۔۔ ذاتِ والا فخرِ پاکستان و صد عظمت نشاں
صاحبِ نقد و نظر بھی صاحبِ اسلوب بھی ۔۔۔ آفتابِ نثرِ اردو بالیقین و بے گماں

تلخ شیریں زندگی کا کس قدر انجام ہے
"شامِ غم" سے ہے سن ترحیلِ عبدالحق عیاں
۱۳۸۱ھ

•

(ارشاد دہلوی)

بخشی چراغِ علم سے جس نے کہ روشنی
خورشید چھپ گیا وہ اُجالا چلا گیا
اہلِ ادب میں غوغۂ آہ و بکا ہے آج
اردو زباں کا چاہنے والا چلا گیا

•

پروفیسر رشید احمد صدیقی

بابائے اردو

بابائے اردو (عبدالحق) نے ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں ۹۱ سال کی عمر پاکر رحلت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی بے لوث و بے نظیر خدمات کو ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے اچھے اور بڑے مقاصد کے حصول میں امید اور امنگ کا لازوال سرچشمہ بنائے۔

موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن جو لوگ اعلیٰ مقاصد کی تائید و حصول میں تا دم آخر کام کرتے رہتے ہیں، وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں، ان کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ پہلی صورت طبعی اور ارضی ہے۔ دوسری اخلاقی اور ماورائی۔ تقدیر الٰہی نے صرف نوع انسان کو مؤخر الذکر اقدار کے تحفظ و ترفیع کے لئے انتخاب کیا ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی اور وفات دونوں میں اس کی تعبیر ملے گی۔

مولوی صاحب ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کے طالب علم ہوئے اور ۱۸۹۶ء میں یہیں سے بی اے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غدر کے بعد سرسید، ہندی مسلمانوں کی معاشی، ذہنی و تہذیبی آبادکاری کے منصوبے کو کامیاب بنانے میں اپنے عقیدے اور عمل کی پوری توانائی و تابناکی کے ساتھ علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کے عظیم ادارے کے وسیلے سے اس عہد کی نزع بہ نزع دشواریوں اور نزاکتوں سے نبرد آزما تھے۔ اس تحریک اور ادارے کو مستحکم و موثر بنانے اور فروغ دینے میں دور اور نزدیک کے عام و خاص، مسلم، ہندو، سکھ، یورپین نیز مدرسۃ العلوم کے اساتذہ اور طلبا جن میں ہر ملت و مسلک کے پیرو شامل تھے۔ یکساں طور پر

نہایت تن دہی اور خلوص کے ساتھ سرسید کے شریک کار تھے۔ حالات کے یکسر منقلب ہو جانے کے باوجود ادارے کا یہ امتیاز آج تک باقی ہے اس وسیع پیمانے پر اتنی مدت تک ہندوستان کے شاید ہی کسی اور ادارے کو اتنی بے لوث وہمہ جہت تائید ملی ہو اور جس نے اس فراخ دلی وجرات سے اپنی ذمہ داری پوری کی ہو۔

عنفوان شباب کی بے پایاں اور بسا اوقات تند صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب اور ان کو صحیح راستے پر لانے اور رکھنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب یقیناً بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کو سرسید کا سایہ اور سہارا اور ان کے نادرہ روزگار رفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں ان کو سرسید سے بڑا رہنما، مدرسۃ العلوم سے بہتر ادارہ اور علی گڑھ تحریک سے زیادہ مفید مقتضائے وقت اور جامع پروگرام اور کہاں مل سکتا تھا۔ ان کی غیر معمولی ذہنی استعداد، ثابت قدمی، اور کام کرنے کی لگن کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ علی گڑھ میں اتنی معقول و موثر نظری و عملی رہبری نہ میسر آتی تو کیا معلوم وہ کدھر نکل جاتے اور جتنے کارہائے عظیم جتنی طویل مدت تک انہوں نے جس خوبی سے انجام دئے وہ دے بھی سکتے یا نہیں: یہ اس لئے کہنا پڑا کہ آج کل بیشتر ذی استعداد اور ہونہار نوجوانوں کو مناسب و معقول رہبری اور ماحول نہ ملنے سے بے راہ ہوتے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس عالم گیر بے راہ روی نے دنیا کو جس انتشار، مایوسی اور بے زاری سے دوچار کر رکھا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہے جس کو دور کرنے میں ہماری بہترین مساعی اب تک ناکام رہی ہیں۔ خدا نہ کرے یہ سرکشی و گمرہی اپنا تاوان لئے بغیر نہ رہے، جیسا کہ تاریخ بتاتی چلی آرہی ہے، جس کے آثار روز بروز نمایاں ہو رہے ہیں۔

جس طرح غدر سے کچھ پہلے دہلی میں دین و دانش، تہذیب و شائستگی علم و فن کے اتنے ہنرور جمع ہو گئے تھے جتنے "گردوں پر نجوم" اسی طرح اس کے بعد جیسے مردان کار رشتہ دماغ اور ملک وملت کے خیر اندیش سرسید کی قیادت میں اکٹھا ہوئے۔ اس کی بھی مثال ہندوستان میں کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ دہلی کے جتنے ارباب کمال غدر میں ادھر ادھر ہوئے ان میں سے کسی نے کہیں جاہ و اقتدار کا سکہ چلایا، کہیں رشد و ہدایت اور خیر و برکت کے آستانے قائم ہوئے کہیں ارباب کسب و ہنر نے اپنا اپنا کاروبار سنبھالا۔ اس طرح سارے ملک میں فن اور فضائل کے ستارے روشن ہو گئے۔

سرسید نے علی گڑھ سے ایک نئے افق کا ظہور ایک نئی زندگی کے افتتاح اور ایک نئے چیلنج کے قبول کرنے کا اعلان کیا۔ چنانچہ انہوں نے ان کے رفقا نے اور ان کے بعد آنے والوں نے

زندگی اور زمانے کے ہر نئے تقاضے سے نبرد آزما ہونے اور گذشتہ سے پیوستہ اور آئندہ سے ہمدوش و ہم عنان رہنے کی روایت قائم کی۔ جس طرح اچھا خیال اور اچھا استعارہ ہم کو بے اختیار غالب اور اقبال کے یہاں سے دستیاب ہوتا ہے اسی طرح نیا مقصد، نئی منزل اور نئے حوصلے کی نشان دہی علی گڈھ میں اور علی گڈھ سے ملتی ہے۔

مولوی صاحب علی گڈھ کے غیر معمولی ذہین طلبا میں بھی ممتاز اور اپنے ساتھیوں اور اساتذہ دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ وہ اپنے دور کے برخود غلط یا سر پھرے طلبا میں نہ تھے۔ اس زمانے میں کالج کے نظم و نسق پر اعتراض یا احتجاج کرنا اتنا آسان، تفریحی یا سود مند مشغلہ نہ تھا جتنا کہ اب ہے۔ لیکن مولوی صاحب جس بات کو نامناسب سمجھتے اس پر اختلاف کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ ان کی اس صفت پر سرسید اعتماد کرتے اور مولوی صاحب نے برملا و صاف گوئی ہی نہیں اچھے کام کرنے کی دھن، خطرہ و خسارہ، مایوسی و بیزاری در طعن اغیار کو خاطر میں نہ لانے کا سبق بھی سرسید ہی کی گرامی ذات و زندگی سے سیکھا تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "سرسید کی بڑی تمنا تھی کہ مدرسۃ العلوم کے طلبا ہمت، جرات اور شریفانہ اخلاق سے متصف ہوں۔ اور جب کسی طالب علم سے اخلاقی جرات یا خودداری کا فعل صادر ہوتا تو بہت خوش ہوتے!" انہوں نے طبیعت کی اس افتاد کو نہ صرف بحیثیت طالب علم، کالج کے انگریز ممبران اسٹاف کے مقابلے میں برقرار رکھا بلکہ حیدرآباد دکن کی فضا میں بھی ترک نہیں کیا جہاں مدتوں "وظیفہ خوار" کی حیثیت سے وہ مطلق العنان حکمران اسی طرح کے امرائے دولت اور ان دونوں سے زیادہ طاقت ور و خطرناک جماعت، انگریز حکام سے قریب رہے۔ ایسے عہد میں مولوی صاحب کا نہ کبھی "شاہ کو دعا دینا" نہ ریاست کے اعیان و اکابر کا ثناخوان ہونا معمولی بات نہیں ہے!

مولوی صاحب کو شروع سے آخر تک وقت کے گرانمایہ شخصیتوں کی صحبت و رفاقت نصیب رہی۔ مدرسۃ العلوم میں سرسید، سید محمود، شبلی، حالی، محسن الملک، وقار الملک، پروفیسر بک، پروفیسر مارلین، پروفیسر آرنلڈ حیدرآباد میں افسر الملک، سید علی بلگرامی، نواب عماد الملک، مہاراجہ کشن پرشاد، عزیز مرزا، علی حیدر طباطبائی، عنایت اللہ، ظفر علی خان، وحید الدین سلیم، سر اکبر حیدری، سر راس مسعود۔ ان کے علاوہ خواجہ غلام الثقلین، ڈاکٹر اقبال، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، عبد الرحمٰن صدیقی (سندھی) وغیرہ یہ ایسی ہستیاں تھیں جنہوں نے ہمارے قدیم کی اعلیٰ روایات و

اقدار کو جدید کے اہم تقاضوں سے روشناس کرانے اور ساز گار بنانے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے ہماری علم دوستی، تہذیب و شائستگی، فرض شناسی، محنت کوشی، ایمانداری اور دلیری کے کارنامے روشن ہیں۔ انہوں نے ایک نازک اور پر آشوب زمانے میں قدیم کا اعتبار ووقار جدید کی تاخت و تاراج میں محفوظ بھی رکھا اور روشن بھی قدیم و جدید کو ایک دوسرے کی روش و روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا اور ان کی خوبیوں کو قبول، اور خرابیوں کو ترک کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ یہ صرف خاصانِ عصر کر سکتے ہیں۔

اس بات کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہم یا تو پرانے کو فی الفور اور یک قلم ترک کر کے نئے کو قبول کر لیتے ہیں یا نئے کو کسی بھی قیمت پر اپنانے کو تیار نہیں ہوتے، اور ستم ظریفی یہ کہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ تقاضائے فطرت اور آئین زندگی دونوں کا منافی ہے۔ اس سے انسانی ترقی و تہذیب میں نہ ربط باقی رہتا ہے نہ تسلسل اور انسانی معاشرے میں بڑا انتشار و اختلال واقع ہوتا ہے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد تلاش معاش و ملازمت میں مولوی صاحب کو بمبئی جانا پڑا جہاں وہ براہ راست محسن الملک کی غیر معمولی شخصیت کے زیر اثر آئے، جن کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں

"ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی کہ کوئی ہو، کہیں کا ہو، ان سے چھوا نہیں اور کندن کا ہوا نہیں!"

یہاں کرنل افسر الملک بہادر کی نظر انتخاب مولوی صاحب پر پڑی جن کو وہ اپنے ہمراہ حیدر آباد دکن لائے اور مدرسۂ آصفیہ کا صدر مقرر کر دیا۔ ۱۸۹۵ء میں یہیں سے مولوی صاحب نے رسالہ افسر کا اجرا کیا۔ اسی وقت سے اردو اور مولوی صاحب نے ایک دوسرے کی تقدیر پہچانی اور اپنائی۔ مولوی صاحب نے عمر کا بیشتر غالباً بہترین زمانہ حیدر آباد میں اردو کی عملی، تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں میں گزارا۔ انجمن ترقی اردو کو جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک معطل و رہ مضمحل جزو تھی ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ سے دکن کی سرزمین پر لائے، اور آنریری سکریٹری کی حیثیت سے یکہ و تنہا اس کو اتنی ترقی دی کہ وہ اردو کی بے شمار اعلیٰ صلاحیتوں کا آئینہ، ان کو بروئے کار لانے کا وسیلہ اور اردو کی حفاظت و حمایت کا معتبر کل ہند محاذ بن گئی۔

قدیم اردو کا گہوارہ ہونے کی حیثیت سے دکن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ مسلم ہے لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ دکن کی اس اہمیت کو ترقی دینے اور فعال بنانے میں مولوی صاحب کی بیش قرار خدمات کو بہت بڑا دخل ہے۔

انہوں نے دکن کو اپنی گوناگوں علمی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنایا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اردو کی تاریخ و تحقیقات کا کام اتنا ترقی نہ کرتا بلکہ دکن کو شاید وہ بے مثل فضیلت بھی نصیب نہ ہوتی جو عثمانیہ یونی ورسٹی اور سررشتۂ ترجمہ و تالیف کے طفیل اسے حاصل ہوئی۔ یعنی دکن میں دیسی زبان (اردو) کی ایک ایسی یونی ورسٹی قائم ہوئی جو اپنی مختصر مدت حیات میں ہندوستان کی معیاری انگریزی، اور سرکاری یونی ورسٹیوں کی ہم پلہ ہوگئی۔ جس کی تصدیق کرنے والوں میں آج بھی سر رادھا کرشنن اور شری راج گوپال آچاری موجود ہیں۔ اردو کی اس رہنمائی سے ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کی تقدیر روشن ہوگئی۔ دکن میں قدیم اردو کی تصانیف کا سراغ لگاکر مولوی صاحب نے اردو کے ماضی میں تقریباً ۴۰۰ سال کا، اس کے حال میں ایک معیاری یونی ورسٹی کا اور اس کے مستقبل میں اردو کی تہذیبی تسخیر کے امکانات کا بڑا پائدار، بیش قرار اور بے نظیر اضافہ کیا۔

اس میں شک نہیں جدید علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم اردو زبان میں دینے کا کامیاب تجربہ پہلے پہل دہلی کالج میں ہوا اور اردو یونیورسٹی کا خیال سب سے پہلے سرسید کو آیا۔ جنہوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سکریٹری تھے اس بارے میں ایک عرضداشت گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی جسے وزیر ہند نے بھی پسند کیا لیکن اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔

عثمانیہ یونی ورسٹی کے بانیوں میں مولوی صاحب، سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود سب سے زیادہ ممتاز اور پیش پیش تھے۔ لیکن اس کو مستحکم کرنے اور ر رکھنے کے لئے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا۔ مولوی صاحب نے جس دور اندیشی، قابلیت اور محنت سے اردو قواعد، وضع اصطلاحات، تحقیق و تدقیق، تالیف و ترجمے، تنقید و لغت کے کاموں کا جدید معیار کے مطابق آغاز کیا۔ اور ترقی دی وہ انہیں کا کارنامہ ہے، جس کے بغیر بے مثل اور عظیم الشان تجربہ کامیاب نہ ہوتا۔ مولوی صاحب کی ان گرانقدر خدمات سے اردو کی اہمیت مسلم ہوئی اور اس کی ترقی کے امکانات تیزی سے برگ و بار لانے لگے۔ ان خدمات کے طفیل اردو کی اولین یونی ورسٹی ہندوستان میں قائم ہوئی۔ ایسے بڑے کام میں تنہا ایک شخص کی علمی و ادبی خدمات اور اس مسلسل جدوجہد کا شاید اتنا گرانقدر نمونہ کہیں اور نظر آئے! جہاں تک اردو زبان کے جاننے، پرکھنے اور ہر سطح اور نوعیت کے کاموں میں مفید و مستند اضافے کا تعلق ہے مولوی صاحب کا ثانی کوئی نہیں۔ اردو کے بارے میں سرسید نے جو خواب دیکھا تھا،

اس کی تعبیر مولوی صاحب کی خدمات میں ملتی ہے۔
کسی زبان کے مکمل و مقبول ہونے کی ایک
پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی معیاری بولی و رسمی
ہو۔ تقسیم سے پہلے کا ہندوستان جتنی اور جن
مارح کی دیسی زبانوں اور بولیوں پر مشتمل تھا اور
آج بھی ہے اس کی مثال کہیں اور کم ملے گی ان
میں سب سے کم عمر لیکن اپنی ترکیب، ظہور و نفوذ
کے اعتبار سے سب سے عجیب۔ سب کی حلیف
اور بہتوں کی نمائندہ اردو ہے۔ اس میں کام کرنے
والے، اس سے کام لینے والے اور اس سے نام پانے
والے ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، یورپین سبھی ہیں
لیکن پچھلے کم و بیش سو سال سے اس کو جس مخالفت کا
سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو اب مخاصمت کی حد تک پہنچ
گئی ہے، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مولوی
صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو کی سرشت
اور اس کی شخصیت کو واضح و متعین کیا اور ہر طرف سے
منہ موڑ کر ہر انعام و دشنام سے بے نیاز ہو کر
اردو کی حفاظت و حمایت کی، وہ بھی اس طریقے سے
جو سب کے بس کا نہ تھا۔ یعنی اردو کے سرمائے میں اپنے
گرانقدر مضامین و مقالات کے اضافے سے!
یہ ستم دیدنی ہے کہ اردو کی دوستی میں اپنے
اور پرائے دونوں کی دشمنی بھی مولوی صاحب کے
حصے میں سب سے زیادہ آئی۔ اردو کا ایسا محسن و
مجاہد جس نے ہر خطرے و رسوائی اور ہر لذت و
الم سے منہ موڑ کر تمام عمر قلمے، قدمے، سخنے، درمے
ہر سطح سے، ہر محاذ پر صرف اردو کی خدمت کی
ہو اور جس کی خدمات سے اردو اتنی ممتاز و معتبر
ہوئی جتنی مولوی عبدالحق کی خدمات سے اردو
کی تاریخ میں نہ ملے گا، شاید کسی اور ادیب کی
تاریخ میں بھی نہ ملے!
خیال ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی نے
کچھ اور وفا کی ہوتی تو وہ کراچی میں اردو یونیورسٹی
قائم کر دیتے جس کے لئے وہ کتنے مضطرب اور کس درجہ
کوشاں تھے۔ وقت کا تقاضا بھی تھا اور حالات
بھی سازگار ہو چلے تھے۔ لیکن انسان کی زندگی
اس کے مقاصد جلیلہ کی زندگی سے ہمیشہ کم
ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائے بالآخر
مرے گا۔ بڑے مقاصد کی بھی زندگی ہوتی ہے لیکن
ہوتی ہے ہمارے آپ کی زندگی سے علیحدہ جس پر
کبھی موت بھی نہیں طاری ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ
یہ مقاصد عظیمہ وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کا کچھ
حصہ ہمارے آپ کے حوصلے اور استعداد
کے مطابق ہم کو ودیعت کرتے رہتے ہیں۔ اسی
کے بقدر ہم کام کرتے ہیں پھر دوسروں کے
لئے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ مشیت الٰہی، اس
لئے تقدیر انسانی بھی ہے۔ کراچی میں اردو
کا جو منصوبہ مولوی صاحب کے پیش نظر تھا اور
جس کو عملی جامہ پہنانا وہ اپنا سب سے بڑا

اور محبوب مقصد سمجھتے تھے، وہ آج ورنہ کل پورا ہو کر رہے گا۔ اور اس کی ترقی کے نئے منازل سے آشنا اور نئے تقاضوں سے عہدہ برآ کرانے کے لئے ہم میں عبدالحق آتے رہیں گے۔ ہر آدمی اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مادے کی طرح عمل بھی لازوال ہے۔ ایک طبعی دنیا میں دوسرا اور حالی و اخلاقی زندگی میں، اس بڑے فرق کے ساتھ کہ خیر و شر کتنے ہی اضافی کیوں نہ قرار دئے جائیں خصوصیت و خاصیت کے اعتبار سے ایک بہرحال خیر اور دوسرا بہرحال شر ہے!

آج کل روپے پیسے یا ریاست کے حکم ناموں سے شبانہ روز یونیورسٹیاں وجود میں آتی رہتی ہیں، جس طرح بعض ممالک میں حکم ناموں سے شعر و ادب کی نوعیت متعین کی جاتی ہے اور اس کے رخ و رفتار کو بدلتے اور موڑتے رہتے ہیں لیکن دانش گاہیں دراصل طالب علم و استاد کی مدتوں کے علمی ریاض و روایت سے ظہور میں آتی ہیں، حکومت کی مرضی و مصلحت کے مطابق دفعتاً جہاں تہاں نمودار نہیں ہوجایا کرتیں۔ بیشتر تعلیم گاہیں اب بنائی نہیں ڈھالی جاتی ہیں۔ اس میں کسی کا بھی قصور نہیں ہے وقت کا تقاضا اور زندگی اور زمانہ کی رفتار ایسی ہی ہے۔ لیکن مولوی صاحب کی مجوزہ یونیورسٹی ان کی علمی و ادبی خدمات پر تعمیر کی جائے گی جس کے لئے انہوں نے اپنی عمر کا سارا حصہ اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا تمام سرمایہ وقف کر رکھا تھا۔ ایسی یونیورسٹی کی فضیلت کا کیا کہنا۔

مولوی صاحب کے بیشتر اور بہترین حصہ عمر کی کوششوں اور شرفائے فن و ادب کی امیدوں کا لہلہاتا ہوا باغ جو دکن میں اجڑ گیا کیا عجب وہ کراچی میں نمو پائے اور برگ و بار لائے مولوی صاحب کی اس میں کتنی بڑائی نکلتی ہے کہ انہوں نے حکومت سے منہ موڑ کر جامعہ عثمانیہ کا بدل اپنی قوت بازو سے کراچی میں کرنا چاہا۔ اس کے لئے دن رات ایک کر دئے۔ کیسی کیسی دشواری اٹھائی۔ بدنامی مول لی۔ اور آخر دم تک کام کرتے رہے انہوں نے اس کے لئے مرن برت نہیں جیون برت رکھا۔ جو بڑی کٹھن چیز ہے۔ اس لئے بہت کم لوگ حوصلہ کرتے ہیں اور اس کو نباہ سکتے ہیں۔ تمام عمر ہر طرح کی آزمائش میں مبتلا اور اس پر ثابت قدم رہنا۔ چند دن کی تکلیف میں مبتلا رہ کر جان دینے یا بچ رہنے سے بہرحال مشکل، اس لئے افضل ہے! مردِ خیر و شر میں مرنے کا نہیں، مقابلہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مرن برت ممکن ہے کسی دن ممنوع قرار دے دیا جائے۔ جیون برت کا مقابلہ کوئی مادی قوت کبھی نہیں کر سکتی ہے۔

مولوی صاحب کی نظر میں حالی کی سیرت و شخصیت کا جتنا احترام تھا شاید ہی کسی اور کا رہا ہو

حالی کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں جیسے مرید اپنے مرشد کا کرتا ہو۔ یہ بات خاص طور پر اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ مولوی صاحب کا انداز گفتگو بالعموم ایسا نہیں ہوتا۔ سرسید کی بھی ان کی نظر میں بڑی منزلت ہے جس کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے لیکن اس اظہار کا انداز اور ہے اور اس احترام و عقیدت کا اور جو حالی کے لئے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے مولوی صاحب دونوں میں کسی سے مشابہ نہیں۔ البتہ ان کے لکھنے کا اسلوب سرسید کے اسلوب کی نہایت ترقی یافتہ شکل ہے۔

سرسید نے سب سے پہلے اردو نثر کو ایسے اسلوب سے متعارف کرایا جس میں ہر طرح کے خیالات و جذبات کا اظہار و ابلاغ کیا جا سکتا تھا۔ مولوی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سرسید کے اسلوب کی ابتدائی ناگزیر ناہمواریوں کو دور کرکے اس میں ادبی خوبیاں پیدا کردیں۔ سبب یہ ہے کہ مولوی صاحب، انگریزی، فارسی اور ہندی انداز خیال، انداز فکر و انداز بیان کے رموز سے واقف تھے۔ ان اسالیب کو انہوں نے اردو نثر میں اس سلیقے سے سمویا کہ وہ سلیقہ اردو کا سلیقہ بن گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب کی نثر میں مشکل سے کوئی ٹکڑا ایسا ملے گا جس کو علیحدہ کرکے آپ یہ بتا سکیں کہ یہ انگریزی، فارسی یا ہندی کا چربہ ہے برخلاف اس کے ہمارے اچھے سے اچھے نثر نگاروں کے یہاں آپ اس طرح کے ٹکڑوں پر آسانی سے انگلی رکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک بتا سکتے ہیں کہ فلاں نے کسی اردو نثر نگار کو نہیں، فلاں اردو شاعر کے انداز بیان کو اپنی نثر کا جز بنا لیا ہے۔ انداز بیان ہی نہیں جہاں تہاں وہ خود اس کی شاعری کو۔ حالانکہ اردو نثر میں اردو شاعری کا رنگ و آہنگ اب مقبول نہیں رہا۔ ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو نثر کا نثر جس کو خالصتاً اردو کا کہا جا سکے غالب، سرسید اور حالی کے بعد مولوی صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے۔

مولوی صاحب کو دکن میں کافی عرصہ تک کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی علمی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے اچھے سے اچھے نمونے وہیں کے قیام کے نتائج ہیں۔ دربار دکن، امرائے کبار اور ریزیڈنسی کی آویزشوں اور ان کے متعلقین و متوسلین کی ریشہ دوانیوں سے بچا رہنا اور اپنی آن قائم رکھنا، مولوی صاحب کا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ مطلب کتنا ہی ضروری اور مخاطب کیسا ہی صاحب اثر و اقتدار کیوں نہ ہو مولوی صاحب گفتگو میں تکلف و تملق کو راہ نہیں دیتے تھے۔ لبعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی مستحق شخص، مفید ادارے یا ضروری اسکیم کے لئے چندہ یا عطیہ نہیں بلکہ جزیہ یا

چھتا وصول کر رہے ہوں۔ یا آج کل کے صحیفۂ اخلاق یا اصلاح میں کسی کی یادگار قائم کرنے یا الکشن لڑانے کے لئے استحصال بالخیر یا بالجبر کے در پے ہوں۔

اچھے مقصد کی حمایت کرنے میں مولوی صاحب بڑے سے بڑے آدمی کے جبر و قہر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس صفت میں وہ بہتوں سے بہت ممتاز بھی تھے، اور بدنام بھی۔ یہ سب اس لئے ممکن تھا کہ مولوی صاحب کے خلوص نیت اور حسن عمل کا ہر شخص قائل تھا۔ کسی کے دل میں یہ وسوسہ نہیں گزرتا تھا کہ علمی و تعلیمی مشاغل کے علاوہ ان کا کسی مشتبہ سرگرمی یا ذات گرامی سے تعلق تھا۔ حیدرآباد کے تمام چھوٹے بڑے غیر ملکی متوسلین میں شاید مولوی صاحب ہی کی ذات ان چند مستثنیات میں ہے جو وہاں کے کوچے سے بے آبرو ہو کر نہیں نکلی۔ اردو دوستی کی روایت مولوی صاحب کو سر سید اور محسن الملک نے دی اس روایت کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں انہوں نے جیسی مسلسل اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں ان میں ان کا ثانی نامعلوم مدت تک شاید کوئی اور نہ پیدا ہو۔

اردو کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں مولوی صاحب کی تحقیقات کیا ہے، اس کی حفاظت و اشاعت میں ان کا کیا حصہ ہے، اس کی کن اصناف کو انہوں نے کس طرح آراستہ و استوار کیا اور ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچایا۔ ان امور کی تلاش ان کی تحریر و تقریر میں کرنا چاہیے جن کے جستہ جستہ نمونے ان سطور کے آخر صفحات میں ملیں گے بمشکل اردو لکھنے کی جتنی مذمت اور آسان لکھنے کی جتنی تعریف و تبلیغ مولوی صاحب نے کی ہے ان کے پائے کے کسی دوسرے اردو شناس اور اردو نگار نے نہ کی ہوگی، نہ ان پر کاربند ہوئے ہوں گے۔

ہم میں کس کو اس بات کا علم نہ ہوگا کہ تقریباً پچھلے سو سال سے اچھے اردو نگار کی پہچان ہی یہ رکھی گئی ہے کہ وہ ہر طرح کے خیالات و جذبات کو سلیس و عام فہم اردو میں ادا کر سکتا ہو۔ سب سے پہلے یہ صفت غالب میں اس کے بعد سر سید میں پھر حالی میں، ان کے بعد انہیں مولوی عبدالحق میں پائی اور سراہی گئی۔ اس کے برخلاف خطیبانہ یا شاعرانہ اسلوب بیان کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اور اتنی سی بات بتلانے کے لئے غالباً کسی پیغمبر کی ضرورت نہ محسوس کی جائے گی کہ سہل و سلیس اردو اگر کسی زبان سے سب سے قریب ہے تو وہ ہندی ہے اور جن زبانوں سے دور ہے وہ فارسی اور عربی ہیں یہ اور بات ہے کہ ہندی خود سلیس و سہل اردو سے نہیں سہل و سلیس ہندی سے بھی دور بہت دور چلی جا رہی ہو۔

مولوی صاحب پر یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کے زمانے میں اردو کو دو قومی نظریے کی تائید کا آلہ بنایا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے اثر و اقتدار کے ساتھ ہی ہر چیز ہندو مسلم رنگ میں دیکھی اور پرکھی

جاتے گی۔ اس میں انگریزوں نے اپنا فائدہ دیکھا۔ مسلمانوں نے اپنا، ہندوؤں نے اپنا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوا انگریزوں کے سب نے غلط دیکھا۔ ظاہر ہے جہاں غلط یا صحیح، انگریز، ہندو، مسلمان سب کو اپنا فائدہ مدنظر ہو یا دکھائی دیتا ہو وہاں غلطی پر ہونے کا الزام کون قبول کرے گا۔

●

مذہب، فرقہ، زبان، علاقے، اکثریت و اقلیت کے اختلافات انگریزی حکومت کے عہد سے آج تک جس شکل و شدت سے جن مواقع پر سر اٹھاتے رہے ہیں یا ان کو شہ دی گئی ہے اس سے کوئی بے خبر نہیں۔ ان کے اسباب و انسداد کے تدابیر بھی دریافت کئے جا چکے ہیں۔ ان پر بے شمار صفحات پر روز سیاہ کئے جاتے ہیں کتنے مباحثے منعقد اور کمیشن کمیٹیاں مقرر ہوتی رہتی ہیں اور کیسے کیسے محراب و منبر ان کی تلقین یا تصفیہ کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں، وہ بھی پوشیدہ نہیں لیکن جو بات کسی کے بس کی نہیں وہ یہ ہے کہ انسداد یا اصلاح کے تدابیر پر عمل کون کرے اور کیسے کرے۔

اردو کا بیشتر مسلمانوں کی مادری زبان ہونا اتنا اردو کا گناہ نہیں معلوم ہوتا جتنا شاید مسلمانوں کا۔ یہ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اردو بے شمار ہندوؤں کی بھی مادری زبان ہے جس کا وہ بڑی منصفی و جرات سے برابر اظہار و اعلان کرتے رہتے ہیں اپنے حسن و افادیت کے اعتبار سے اردو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی اتنی ہی مقبول و کارآمد نہ ہوتی جتنی کہ رہی ہے اور اب بھی ہے تو اس کو سارے ملک میں اتنی وسیع و وقیع شہریت (CITIZENSHIP) کیسے نصیب ہوتی جو کسی دوسری ہندوستانی زبان کو نہیں ہے۔ اس غیر معمولی امتیاز کے لئے اردو ہندوستان کی دور و نزدیک کی تمام بولیوں اور ان کے بولنے والوں کی احسان مند بھی اور محسن بھی! یہ ایک سانحہ ہے کہ اردو جو کسی وقت ہندوستان میں ہندو مسلمان کو یکجا کرنے اور رکھنے کے لئے وجود میں آئی تھی اور اس نے اس فریضے کو حسن و خوبی سے انجام بھی دیا تھا۔ آج ہندو مسلمانوں میں نفاق و افتراق پیدا کرنے کا سبب قرار دی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی اردو کو اپنی مادری زبان قرار دے اور اس بنا پر اس کی توقع رکھے کہ اس زبان کی حفاظت و ترقی میں اس کی مدد کی جائے گی تو اس میں کیا قباحت ہے جبکہ وہ ہر طرح اور ہمہ وقت ہندی کو قومی، ملکی، حکومتی زبان اور حکومت کو سیکولر جمہوریہ حکومت مانتا ہو۔ اسی طرح اگر وہ یہ بھی کہے کہ اردو اس کی تہذیبی، علمی اور ادبی زبان ہونے کے ساتھ مذہبی زبان بھی ہے اس لئے اردو کی حمایت کی جائے اور اس کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے تو اسے قومی و ملکی مفاد و مقاصد کا منافی کیوں قرار دیا جائے؟

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی مادری زبان وہاں کے باشندوں کی مذہبی، تہذیبی، علمی اور ادبی زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس لئے اگر کسی جماعت یا قبیلے کی مادری زبان اور مذہبی و تہذیبی زبان ایک ہی ہو تو یہ گمان نہ ہونا چاہئے۔ نہ اس زبان سے کام لینے والوں سے! چنانچہ اردو کی حمایت اس بنا پر کی جاتی ہے کہ وہ بیشتر ہندی مسلمانوں کی مادری زبان ہونے کے علاوہ ان کی مذہبی، تہذیبی، علمی، ادبی زبان ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ ہندوستانی قوموں کے مقابلے میں اردو کا یہ امتیاز بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی زبان نہ ہونے کے باوجود ان میں سے بیشتروں کی وہ مادری، تہذیبی، ادبی و علمی زبان بھی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ اردو بولنے والے جب اپنی زبان کے لئے وہ سہولتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں جو عام طور سے کسی زبان کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں تو اس سے محض ایک زبان کو باقی رکھنے کے فطری جذبے کی تسکین مقصود نہیں ہے۔ اردو کی حفاظت و ترویج کا بنیادی مقصد اس تہذیب کی بقا اور ترقی سے عبارت ہے جو ہندوستان ہی کی مختلف قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کی باہمی مفاہمت و یگانگت سے وجود میں آئی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اردو آج بھی ہندوستان کے مختلف تہذیبی عناصر میں اس جذباتی ہم آہنگی کو پیدا کرنے میں غیر معمولی حد تک معین ہو سکتی ہے جس کی ملک کو ضرورت ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا سب سے نمایاں امتیاز یہ ہے کہ وہ مختلف تہذیبی عناصر کی موجودگی اور ان کے اثرات کے خوشگوار و خوش آئند امتزاج سے عالمی تہذیب کا مظہر بن گئی، اور اس طور پر ہندوستانی ریاست قومی ہوتے ہوئے ایک عالمی ریاست کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

اس عالمی ریاست کے قیام کے سلسلہ میں جو مسائل اور ذمہ داریاں در پیش ہیں کم و بیش اسی قسم کے مسائل اور ذمہ داریاں، ہندوستانی ریاست، کی تشکیل میں بھی سامنے آ رہی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس کا اثر دنیا کے آئندہ نقشے پر بہت گہرا پڑے گا۔ ہم آج عالمی مسائل کے حل میں جو مدد دے رہے ہیں اس کا ثبوت ہم کو خود اپنے ملک کے اندر عملی طور پر دینا چاہئے۔ سچی وطن دوستی اور سچی انسان دوستی میں کوئی فرق نہیں۔ انسان دوستی بغیر وطن دوستی ایک واہمہ اور وطن دوستی بغیر انسان دوستی ایک مغالطہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے خیر خواہ اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شیدائی تاریخ کے اس چیلنج کو قبول کریں گے جو اس نے ہندوستان کے سامنے رکھا ہے اور جدید ہندوستانی تہذیب کی صحت مند اور دلکش تشکیل میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے۔

دو تین سال ہوئے مولوی صاحب نے پاکستان

رائٹرس گلڈ میں ایک خطبہ دیا جو بڑی اہم و فکر انگیز دستاویز اور دستور العمل ہے۔ اس میں زبان و ادب اور اس کے خدمت گزاروں سے متعلق کتنی بیش بہا باتیں جو صدیوں کے تجربے پر مشتمل تھیں، بڑے پُر درد اور عالمانہ انداز میں کہی گئی ہیں اور ان ادبی و تہذیبی میلانات کی نشان دہی کی گئی ہے جن کو ترقی دینے کی ذمہ داری ادیبوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے ادب کی نشو ونما کو نہ صرف قومی تہذیب و تمدن کو مالا مال کرنے کی کوشش پیہم قرار دیتے ہیں بلکہ بالواسطہ عالمی ادب اور عالمی یگانگت میں قابل قدر اضافے کا وسیلہ بھی مانتے ہیں!

اس سلسلے میں مولوی صاحب نے خاص طور پر فرانس اور ہندوستان کی دو عظیم علمی، تہذیبی تحریکوں اور ان کے عظیم معماروں کا نام لیا ہے۔ ایک فرنچ انسائی کلو پیڈسٹ تحریک کے روح رواں ڈینس دیدرو (DENIS DIDEROT-1713 – 84) اور دوسرے علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خان کا۔ ایک کو تاریخ کی وساطت سے جانتے تھے، دوسرے کو انہوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس سے فیض یاب ہوئے تھے۔ اپنے اس مشاہدے و مطالعے سے انہوں نے جو گہرا اثر قبول کیا تھا اور جس طور اپنی خدا داد ذہنی و عملی صلاحیتوں کو اردو کی بڑائی اور بھلائی میں صرف کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اردو کی حفاظت و حمایت کو کسی محدود جماعت یا کسی مخصوص سیاست کی بے جا پاسداری کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ ان تہذیبی اقدار و عوامل کی تائید و اشاعت کی جائے جن کی ترجمانی و تبلیغ اردو کرتی تھی۔ اتنا تو سب مانتے ہیں کہ اردو جغرافیائی، نسلی، مذہبی اور تہذیبی اختلافات کو جنم دینے کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے، نہ اس کو کسی مطلق العنان بادشاہ یا حکومت نے کوئی "فرمان واجب الاذعان" جاری کر کے نافذ کیا تھا۔ یہ تو اختلافات کو دور کرنے اور ذہنی یک رنگی و جذباتی یگانگت پیدا کرنے کی بہترین کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ملک کے عوام و خواص، امیر و غریب، عالم و عامی کے آزادانہ اتحاد خیال، اتحاد مقاصد اور اتحاد رسم و راہ سے ایک بنیادی جمہوری تقاضے کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی۔ اس زبان نے جس ادب اور تہذیب کو پیدا کیا اس نے نہ صرف ہند و پاکستان میں کروڑوں بسنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا بلکہ دوسری ہمسایہ تہذیبوں کو باہم دگر ربط دیا اور ان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کی۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کے کام کا ہمارے عہد میں وہ درجہ اور ہماری نظر میں وہی منزلت ہے جو متذکرہ صدر دو تحریکوں اور ان کے بانیوں کا دنیا کی تہذیبی تاریخ میں ہے۔

●

اس میں شک نہیں کہ باوجود ان مصیبتوں کے

جو تقسیم ملک کے آشوب میں مولوی صاحب کو
پیش آئیں اور اس نقصان کے جو ان کے کام اور
انجمن کے کتب خانے کو پہنچا ، وہ بدستور ہندوستان
میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتے تھے ، ان کے
ارادے و استقامت میں سرمو فرق نہیں آیا تھا بمشورہ
کرنے علی گڑھ تشریف لائے تھے ۔ اونٹر ڈائز لاج میں
قیام تھا ۔ اضطراب و عزم کی ملی جلی وہ کیفیت اب
تک نہیں بھولی جو ان کے مردانہ نورانی سراپا پر طاری
اور رگ رگ میں پیوست نظر آتی تھی ۔ تصور میں نقشہ
اس لئے واضح و پائدار ہے کہ اس زمانے میں تقسیم ملک
کی عالم گیر ہولناکی اور آس پاس کے سانحات قتل ،
و غارت نے ہر چھوٹے بڑے کو بے قرار و بے بس
کر رکھا تھا ۔ بوڑھے مجاہد کا یہ جلال و جمال دیکھ کر محسوس
ہونے لگتا جیسے آزمائش کا سامنا ہو تو جان ، مال ،
ناموس ، احباب ، اقربا کسی کی پروا نہ کرنا چاہیے ،
صرف اپنا فرض بجا لانا چاہیے ۔ پھر یہ یاد آتا ہے کہ اس
مایوسی کو مٹانے اور ہمت و حوصلے کو زندہ رکھنے
اور اس سے کام لینے کے لئے غیب سے کیسے
مردان کار ، مامور و مبعوث ہوتے رہتے ہیں
اور اسلاف کے بارے میں جو کچھ بزرگوں سے سنا
ہے یا کتابوں میں پڑھا ہے وہ بے کم و کاست صحیح ہو
تو کیا عجب !

کئی دن تک گفت گو رہی ۔ بالآخر مولوی صاحب
مایوس و ملول اس "متاع کنعان" (اردو) کو لے کر
"بازار مصر" (پاکستان) پہنچے ۔ ہندوستان اور
پاکستان دونوں میں اس یوسف کے یعقوب بھی ہے
زلیخا بھی ۔ اردو کی پذیرائی پاکستان میں کیسی ہوئی ،
اور ہندوستان میں اس کا کیا حال ہے ، کھلی ہوئی
داستان ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ۔

مولوی صاحب کراچی پہنچے ، تو اردو کالج
کی بنیاد رکھی ۔ انجمن ترقی اردو کی از سر نو تنظیم کی ۔
اردو یونیورسٹی کی مہم کا آغاز کیا ۔ اردو کو پاکستان
کی قومی و ملکی زبان قرار دئے جانے کی تحریک
چلائی اور اپنے تصنیفی ، تحقیقی اور تبلیغی کاموں میں اس
طرح منہمک ہو گئے جیسے کراچی میں نہیں ، حیدرآباد
دکن اور دہلی میں کام کر رہے ہوں ۔

ـــ منعم بہ دشت و کوہ و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت ، خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم ہی پر نہیں مولوی صاحب پر بھی صادق آتا ہے !

کوئی مہم آج تک فرزانوں سے سر نہ ہوئی
اس کے لئے دیوانوں ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے ،
اردو کی "وادی پر خار" اپنے کانٹوں کی پیاس
بجھانے کے لئے ہمیشہ کسی "آبلہ پا" کی منتظر رہے
گی اور مولوی صاحب جیسا بے زنہار آبلہ پا اس
وادی سے اب تک نہیں گذرا ۔

تمام عمر مولوی صاحب سے زیادہ واضح
و مدلل طور پر اردو کے ہندی نژاد ہونے کی شاید
ہی اردو کے کسی اور مستند اسکالر نے وکالت کی ہو

ان کی تمام عمر یہی بتانے میں گذری کہ اردو باہر سے نہیں لائی گئی۔ اس نے یہیں جنم لیا اور پروان چڑھی۔ کسی نے اس کو کسی کے سر نہ تھوپا، یہ جہاں گئی جس زبان، قوم اور ماحول سے سابقہ پڑا اس کی خوبی لی، اپنی خوبی دی۔ تمام ملک کو جو مدتوں سے طرح طرح سے بٹا ہوا تھا اس نے متحد و مضبوط کیا۔ اس ملک کو آزادی دلانے میں وہ ملک کی کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ مختصر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی مشترک تہذیب و رسم و راہ کی بڑی دل آویز تصویر ہے۔

اردو کی ان صفات کی طرف پچھلے سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کا ذکر اس لئے آ گیا کہ ایک زمانے میں یہ باتیں بالخصوص اردو کا ہندوستان کی مشترک تہذیب کا بڑا صحت مند۔ مبارک قابل نمونہ ہونا اس کی سب سے بڑی صفت سمجھی جاتی تھی اور اس بنا پر ہر طرف محبوب و مقبول تھی لیکن اس کا یہی سب سے بڑا ہنر اب اس کا سب سے بڑا عیب خیال کیا جانے لگا ہے یہاں تک کہ اردو کی ان صفات پر آج کل زور دینا یا ان کی طرف اشارہ کرنا مخالف عناصر کو اشتعال دینے کا موجب ہوتا ہے! بہ بیں تفاوت رہ!

مولوی صاحب پر چاہے جتنے اور الزام عائد ہوتے ہوں، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اردو ہندی کے مسئلے میں فرقہ دارانہ ذہنیت رکھتے تھے، بڑی ناانصافی ہوگی۔ مولوی صاحب سے اس بنا پر بدگمان رہنے والوں کو کیسے یقین دلایا جائے کہ بعض حلقوں سے یہ آواز اکثر سنائی دی ہے کہ مولوی صاحب اس طرح کے یا اتنے مسلمان بھی تھے یا نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے۔ مولوی صاحب کا مسلک اردو تھا۔ اور شاید وہ خود ان لوگوں میں تھے جو مذہب سے زیادہ اپنے مسلک کے پابند ہوتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم جیسے پکے مسلمان اور کھرے انسان تھے، سب جانتے ہیں۔ مولوی صاحب سے بڑی دوستی و بے تکلفی تھی۔ اردو، اسلام، تہذیب، ثقافت اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر دونوں میں بڑے لطف کی گفتگو ہوا کرتی۔ مولوی صاحب جب بھی علی گڑھ آتے "خانقاہ سلیمانیہ" میں مولانا کے یہاں چائے پیتے اور ان کی بے تکلف و دلچسپ گفتگو سننے کے لئے حلقہ نشین جمع ہو جاتے۔ عربی کے صفات پر مولانا زور دیتے۔ مولوی صاحب اردو کے گن گاتے۔ یہ صحبتیں سالہا سال رہیں۔ مولانا نے مولوی صاحب کو "کالا کافر" کا لقب دے رکھا تھا اور ہم لوگوں کو اپنے یہاں کی نشست کی دعوت ہی یہ کہہ کر دیتے تھے، فلاں وقت آ جانا "کالا کافر" آیا ہوا ہے۔

مولوی صاحب امرا و شرفا کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اچھی جگہ، اچھا مکان، اچھا ساز و سامان، اچھا کھانا، اچھی صحبت۔ مہمانوں کی

تواضع و تکریم، سیر و سفر کا شوق، احباب کے دکھ درد کے شریک، علما کا احترام، ارباب اقتدار سے مساوی سطح پر ربط و ضبط، دھن کے پکے، عمدہ چیزوں کو حاصل کرنے، نایاب نسخوں اور کتابوں کو حاصل کرنے کا شوق، غرض ان میں وہ تمام خصائص و خوبیاں ملتی ہیں جو اس عہد کے اکابر میں عام تھیں۔

مولوی صاحب نے علی گڑھ کے عہد طالب علمی سے قیام دکن و دہلی کے زمانے تک کم و بیش ۷۰ سال جس ماحول میں زندگی بسر کی اور کام کیا وہ امیرانہ و آزادانہ تھا جس کو یکسر بدلے ہوئے حالات میں نباہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ تقسیم ملک کے بعد کراچی تشریف لے گئے تو غیر متوقع طور پر ایسے گرد و پیش سے دوچار ہوئے اور ایسے حالات و حوادث کا سامنا ہوا جن سے تمام عمر سابقہ نہیں پڑا تھا۔ آمرانہ مزاج عوامی مطالبے کا متحمل نہ ہوا۔ مولوی صاحب کی زندگی کا یہ بڑا اندوہناک باب تھا۔ اسے ملٹری حکومت کے حسنات میں سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نے مولوی صاحب اور ان کی انجمن کو از سر نو سرفراز و بحال کیا۔

بہت دن ہوئے یونیورسٹی یونین میں ایک جلسہ تھا۔ تقریب یاد نہیں رہی۔ مولوی صاحب موجود تھے خلاف معمول کسی قدر مضمحل و فکرمند۔ حاضرین نے تقریر کی فرمائش کی، تیار ہوئے، بڑے تیکھے اور غمگین لہجے میں کہنا شروع کیا، اے صاحبو! کیا تقریر کروں، معلوم نہیں آپ کیا سننے کے مشتاق ہیں۔ مجھے تو تمام عمر ایک ہی رنگ رنگتا رہا اور وہ اموا رنگ ہے یعنی اردو۔ اتنا کہہ کر تھوڑی دیر کھڑے رہے۔ جیسے یادوں کے کھنڈر یا تجربات کے خارزار میں کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ اس کے بعد تقریر شروع کر دی۔ 'اموا رنگ رنگنے' کا فقرہ جس درد و درماندگی سے کہا تھا کہ آج تک ذہن میں گونج رہا ہے۔

مشرقی پاکستان میں اردو کو لازمی یا حکومتی زبان قرار دیے جانے کی جو کوشش مولوی صاحب یا دوسروں نے کی اس میں جس ناخوشگواری کا سامنا ہوا وہ سب جانتے ہیں۔ حالات میں اعتدال آئے گا تو اس کو وہیں آنا پڑے گا جہاں مولوی صاحب لانا چاہتے تھے مشرقی پاکستان ہو یا مغربی، مولوی صاحب کی تحریک کو قبل از وقت تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں۔ مشرقی بنگال کو دیر یا سویر علاقائیت کی تنگنائے سے اپنے کو باہر نکالنا پڑے گا۔ جہاں اچھے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوتے ہوں، وہاں حدود و حصار دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔

یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جو قومیں کسی بیرونی طاقت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہیں وہ تھوڑی سی کوشش سے جلد رہائی حاصل کر لیتی ہیں لیکن جو اپنے ہی بنائے اور اختیار کیے ہوئے طوق و سلاسل میں گرفتار ہوں، وہ بڑی مدت میں

بعد از خرابی بسیار" ان سے نجات پاتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان بندشوں سے کون کب رہائی حاصل کرتا ہے! سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق پاکستان میں اردو کو جو درجہ دلانا چاہتے تھے، وہی منصب ہندوستان کی حکومت ہندی کے لئے ہندوستان میں حاصل کرنا چاہتی ہے اور دونوں حق بجانب ہیں اس لئے کہ ریاستوں کی زبانیں اپنے حدود کے اندر اپنے باشندوں کے لئے اپنے اپنے طور پر کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں اور حکومت کو ان کی اہمیت کو من وعن تسلیم بھی کرنا چاہیے۔ جس حکومت پر وہ ریاستیں مشتمل ہیں اس کی (سرکاری) زبان کے رشتے میں ان تمام ریاستوں اور زبانوں کو یقیناً منسلک ہونا چاہیے، خواہ حکومت یا مرکز کی زبان تمام دوسری زبانوں سے مختلف اور علیحدہ کیوں نہ ہو، اس کے بغیر وہ مختلف النوع اور نہایت درجہ اہم گرفت نہیں قائم رکھی جا سکتی جو مشمولہ ریاستوں پر مرکز کی ازبس ضروری ہے اور وہ ربط بھی بروئے کار نہیں آسکتا، جو ریاستوں کا ایک دوسرے سے ہونا چاہیے۔ اس طرح ایک ایسی زبان کو بھی اختیار کرنا لازم آتا ہے جو بین الاقوامی و بین ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے موزوں و مناسب ہو۔ یہی نہیں اگر کبھی دنیا کا کاروبار آسمان پر بھی پھیل گیا تو آسمان والوں کی بھی کسی نہ کسی ایک زبان کا سیکھنا ہم پر لازم آئے گا۔ اور ہم سے زیادہ شاید آسمان والوں کو ہماری زبان کے سیکھنے میں اتنا نہیں جتنا سیکھنے کے لئے کسی ایک زبان کے انتخاب کرنے میں دقت پیش آئے تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ بہر حال ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی زبان بدیسی نہیں ہے اگر وہ دیس کے کاموں کے لئے مفید و کارآمد ہو

مولوی صاحب میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں جو اس مزاج و ماحول کا خاصہ ہیں جو مولوی صاحب کا تھا۔ لیکن ان کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھتا۔ انسانی ذہن اور آئندہ نسل میں انسان کی فضیلتوں ہی کی یاد باقی رہے تو اچھا ہے۔ خوبیوں کو جتانا اور کمزوریوں کو نظر انداز کرنا اور آئین کے مطابق ہو نہ ہو، آئین سیرت نگاری کے مانے ہوئے ضوابط کے خلاف یقیناً ہے جہاں ہر شخص کے کھرے کھوٹے کو علیحدہ کرکے دکھاتے ہیں میں سیرت نگاری کے فرائض انجام دینے کے منصب پر فائز ہونے یا کئے جانے کا خواہش مند بھی نہیں ہوں کسی کی خوبیوں کو جتانے اور کمزوریوں کو چھپانے کے طریقے کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا لیکن عملاً اس کو غلط بھی نہیں قرار دیتا، اس لئے کہ دیکھا اکثر یہ جاتا ہے، کہ برے اور بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر ان کی صرف ایک آدھ کمزوریوں کو اپنی بد اعمالی و بے راہ روی کے جواز میں جتا لیتے ہیں:

یہاں ایک عزیز کا ستایا ہوا لطیفہ یاد آتا

ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی ضخیم انگریزی ڈکشنری شائع ہوئی تو چند دنوں بعد موصوف کی خدمت میں ایک خاتون تشریف لائیں اور فرمایا: "ڈاکٹر صاحب آپ نے اس لغت میں فحش الفاظ کثرت سے شامل کر دئے ہیں" ڈاکٹر جانسن نے جواب دیا "محترمہ آپ نے تلاش ہی ایسے الفاظ کئے!"

کسی کے عیب نکالنے سے بہتر مشغلہ چپ رہنا ہے اور دونوں سے بہتر اس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے۔ اس طریق کار سے فن کا حق ادا ہوتا ہو یا نہیں یہ فن کار اور ان کے مربی یا محتسب جانیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ انسان اور انسانیت کے تقاضے فن اور فن کار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں اس لئے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسانی زندگی کی تمام خامیوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کرنے ہی کی نہیں ان کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرنے کی وکالت کی جاتی ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے انکشافات ان کی دریوزہ کے حق میں ہیں لیکن اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ سائنس اور فلسفہ کے علاوہ انسان ہی کے مدون کئے ہوئے کچھ اور علوم و انکشافات بھی ہیں جو انسان کے حیوانی تقاضوں کو قابو میں رکھنے اور ان کو عمل صالح میں ڈھالنے کے حق میں ہیں۔ نباتات کا ماہر کسی اچھے پھل پھول کے درخت کو اصل کی طرف لوٹ جانے (یعنی جنگلی ہو جانے) کے حق میں نہ ہوگا بلکہ طرح طرح کے ترکیبوں اور تجربوں سے اس کی کوشش کرے گا کہ اس پھل یا پھول کی جنگلی صلاحیتیں مزید خوب صورتی اور افادیت کی صلاحیتوں کا باعث بنتی جائیں، اور وہ پھل یا پھول بہتر سے بہتر ہوتا جائے جانوروں میں بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ صرف انسان ایسا ہے جس کو انسان دور وحشت کی طرف رخ کرنے اور مائل رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے لئے سائنس اور مشین کی تمام برکتیں فراہم کرتا رہتا ہے۔

موجودہ دنیا کی بے یقینی و محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم فن اور فن کار، سائنس اور سائنس کار کو انسان و انسانیت پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا گمان ہونے لگتا ہے، جیسے انسانیت کو فن اور سائنس کی غلامی میں دے دیا گیا ہو۔ حالانکہ ان دونوں کو ہر حال میں انسانیت کا تابع رہنا چاہئے۔ جہاں خاک نشینی نہ آتی ہو وہاں عرش پروازی زبردست خطرہ ہے۔ اس سے سائنس یا فن کی تنقیص یا توہین منظور نہیں ہے اس لئے کہ یہ دونوں بھی انسان کی بہترین صلاحیتوں کا ثمرہ ہیں۔ مقصود دراصل دونوں کے لئے مناسب مقام و حفظ مراتب کا تعین ہے۔

۴۔ ۳۵ سال اُدھر سب سے پہلے علی گڑھ میں مولوی صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس وقت بھی سن رسیدہ ہی معلوم ہوتے تھے لیکن ذہانت و زندہ دلی محنت و مستعدی کا جو عالم اس وقت تھا وہ ان میں آخر دم تک قائم رہا۔ توانائی کا معلوم نہیں کیسا لازوال خزانہ

ان میں ودیعت تھا۔ تھکنا۔ مایوس ہونا، ہار ماننا تو جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔ چھوٹے بچوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں انرجی (توانائی) بے اندازہ، خرچ کم ہو پاتی ہے، اس لئے نچلا نہیں بیٹھ سکتے۔ ہر کام میں بلند آہنگی، تیزی اور قوت آزمائی کا مظاہرہ۔ نہ خود چین سے بیٹھیں گے نہ دوسروں کو بیٹھنے دیں گے۔ اس کے بعد بھی توانائی کا پورا کوٹا خرچ نہیں کر پاتے! مولوی صاحب کا بھی کچھ اسی طرح کا حال تھا۔ بچوں ہی کی مانند ان میں شوخی و شگفتگی تھی۔ کسی بات کا کھلا ری خیال ہوتی الفور اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ بچوں ہی کی طرح جلد خفا اور جلد خوش ہو جاتے۔ بچپن کی نعمتوں کا کیسا اور کتنا عجیب و قیمتی اندوختہ مولوی صاحب کے حصے میں آیا تھا کہ اس نے ان کو اکیانوے (۹۱) سال تک بوڑھا نہ ہونے دیا۔

اردو سے ان کا یہ شغف دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غریب ماں اپنی تنہا لڑکی کے جہیز کے لئے ہر طرح کا اچھا اور کارآمد سامان جلد سے جلد جہاں جس سے جس قیمت پر بن پڑے فراہم کر لینا چاہتی ہو اور اپنی لڑکی کے بارے میں پاس پڑوسی کو کوئی ایسی ویسی بات مشہور کرتے سُن پائے تو بپھر جائے اور اس کی بریت میں وہ سب کر گزرے جو صرف ایک ماں اپنی لڑکی کے لئے کر سکتی ہے اور اسی بنا پر تعریف کے بھی قابل ہوتی ہے اور درگزر کی مستحق بھی!

مولوی صاحب کے تیور اور طور طریقوں کا عکس ایک واقعے یا لطیفے سے اندازہ لگائیے حیدرآباد کے اعیان و اکابر کے لئے لازم تھا کہ مقررہ سرکاری لباس میں دربار یا سرکاری تقریبوں میں حاضر ہوا کریں۔ ایسے ہی ایک موقع پر ہز اگزالٹڈ ہائینس نے مولوی صاحب کو ان کے اپنے معمولی لباس ترکی ٹوپی اور شیروانی میں موجود پایا دوسرے دن ندیم سلطانی نے حاضر ہو کر مولوی صاحب کو اعلیٰ حضرت کی ناگواری خاطر کی اطلاع دی اور فرمان سلطانی سے آگاہ کیا کہ آئندہ دربار کے مقررہ لباس میں حاضر ہوا کریں۔ مولوی صاحب نے تامبر کر اپنی ناگواری خاطر نہیں، برہمی مزاج سے نوازا، اور آخر میں فرمایا: جاؤ کہدینا میں اپنے لباس کو ترک نہ کروں گا، اس نے معلوم نہیں وہاں جا کر کیا کہا اور کیسے کہا۔ کچھ دنوں بعد اسی طرح کی ایک تقریب میں پھر سامنا ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت نے ندیم خاص سے جو ہمرکاب تھے پوچھا "کیوں یہ وہی مولوی ہے؟" اس نے سر جھکا کر عرض کیا "حضور وہی" پھر زبان سے نکلا، "مجذوب دکن" اپنے اپنے راستے پر ہو لئے۔

پچھلے سطور میں کہیں اقرار کر آیا ہوں کہ اس مضمون کے آخر میں مولوی صاحب کے فرمودات سے جستہ جستہ اقتباسات پیش کروں گا، مقصد یہ تھا کہ اس سے ان کی سیرت، شخصیت، نقطۂ نظر وحت

علم، اصابت فکر اور دوسرے صفات کے
مختلف پہلو سامنے آتے اور اندازہ ہو سکتا کہ
جن خیالات، جذبات و افکار کے اظہار کے
لئے انہوں نے جو زبان، لہجہ اور اسلوب اختیار
کیا ہے وہ موقع ومحل کے اعتبار سے کتنا حسب
حال ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی کہ
علمی شخصیت اور اعلیٰ انشا پردازی کس طرح
ایک دوسرے سے نشو ونما پاتے اور ایک
دوسرے کو جلا دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ یہ کام
اتنا مشکل نہ ہوگا جتنا کہ اس وقت معلوم ہوا
جب ان اقتباسات کے انتخاب و ترتیب کا
مرحلہ آیا۔ متوقع کتابوں اور تحریروں کے
نہ ملنے پر مایوسی بھی ہوئی لیکن جو دستیاب ہوئی
تھیں وہ بجائے خود اتنی تھیں کہ ان کو پڑھ کر مَتاع
حال ادب پاروں کا انتخاب کرنا مشکل معلوم ہونے
لگا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی تھا کہ مضمون
بہت طویل ہو جائے گا۔ یہ دشواریاں اس طرح
ہجوم کرکے اس شکل میں آئیں کہ بڑی خوشی اور
آسانی سے ہمت ہار بیٹھا! اور اسی آسانی
سے یہ بھی یقین کر لیا اور خوش ہوا کہ اپنی
ہی یونیورسٹی کا اردو کا کوئی اچھا طالب علم
اس کام کو شوق محنت اور قابلیت سے
مجھ سے کہیں بہتر طور پر انجام دے گا۔

یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مولوی
صاحب طالب علموں کو بہت عزیز رکھتے تھے
اکثر ان کے پیچھے دوستوں سے بگاڑ کرنے میں
بھی تامل نہ کرتے۔ مولوی صاحب اردو میں
جدید تحریکات و تجربات کرنے والوں میں اس
وقت بھی نوجوانوں سے زیادہ نوجوان
تھے جب بوڑھوں میں بھی ان جیسا بوڑھا مشکل سے
ملتا تھا۔ جدید کے تحریکات کچھ ہی ہوں۔ مولوی
صاحب کو اردو کے لئے نفع ہی نظر آتا تھا
جوانی اپنے اوپر بڑھاپے کا کوئی حق نہیں تسلیم
کرتی لیکن مولوی صاحب جیسے بوڑھے کا حق
نوجوانوں کی آئندہ نسلوں پر ہمیشہ رہے گا۔
بات وہی ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یعنی
مولوی صاحب نوجوانوں سے زیادہ
نوجوان تھے۔ تخیل میں، عزم میں، عمل میں
اس لئے ماتم اس کا اتنا نہیں ہے کہ مولوی صاحب
رحلت فرما گئے بلکہ اس کا ہے کہ وہ نوجوانی میں
ہم سے جدا ہو گئے۔

اس بنا پر یہ امید کرنا کہ مولوی صاحب
کے نام اور کام کو روشن کرنے اور رکھنے
کے لئے طالب علم سامنے آئیں گے بے جا
نہیں ہے۔ (فکر و نظر۔ علی گڑھ)

اکتوبر ۱۹۶۱ء

مولانا صلاح الدین احمد

بابا کے بعد

بابائے اردو ہماری قومی زبان اور اس کے ادب کی بے مثال خدمت کرنے کے بعد بالآخر خاک کی چادر اوڑھ کر کنج لحد میں جا سوئے۔ وہ عمر بھر اردو کی فکر میں جاگتے اور اردو کی جنگیں لڑتے رہے۔ اب انہیں آرام و سکون کی بے انتہا ضرورت تھی۔ لیکن ابھی ان کا سینہ فروغ اردو کے نئے عزائم سے ایک ہنگامہ زار بن رہا تھا یہ ولولۂ تازہ ان کی طویل زندگی کے سب سے بڑے کارنامے کی تشکیل کرنے والا تھا۔ لیکن موت کا برفانی ہاتھ سبھی ہنگاموں کو سرد کر دیا کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جہاں تک بابا کی ذات گرامی اور ان کی دنیوی زندگی کا تعلق ہے ان کے سینے کے سارے ہنگامے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

لیکن کیا یہ سچ مچ موت کی خاموشی ہے؟

نہیں! بابا کا جسدِ خاکی ضرور فنا ہو گیا، لیکن ان کی روح ہمیشہ ہمیشہ باقی و برقرار، اور اسی ذوق و شوق سے سرشار رہے گی، جس سے ان کے قلب و جگر اس عارضی زندگی میں معمور تھے۔ اور تہذیب اور ترقی کا جو چراغ انہوں نے سرِ راہ روشن کیا تھا، ہم اس کے اُجالے میں آگے بڑھیں گے اور کسی دن ضرور اُس منزل کو جا لیں گے جو ان کی نظر کا مقصود تھی۔

سوال صرف وقت کا ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں وہ وقت آ چکا ہے اور شاید اس سے بہتر وقت کبھی نہیں آئے گا۔ زندگی کے نازک ترین لمحے ہی اس کے اہم ترین لمحے ہوا کرتے ہیں۔ اگر ان سے فوری طور پر کام لے لیا جائے تو وہ ایک نئی زندگی کے معمار بن جاتے ہیں اور اگر ان سے گریز و اجتناب اختیار کیا جائے تو یہی لمحے ایک مستقل شکست و زوال کے پیش رَو ثابت ہوتے ہیں آج ہماری تہذیبی زندگی ایک ایسے ہی نازک مقام پر کھڑی ہے۔ ہمارا کاروان سالار ہم سے بچھڑ چکا ہے، اور ہم میں سے کوئی فرد ایسا نہیں جو اس کی جگہ لے سکے۔ لیکن کاروان کو بہر حال رواں رہنا ہے اور آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ہمیں پھر اپنا سامانِ سفر درست کرنا ہے۔

یہ سامانِ سفر جس قدر جلد درست ہو سکے اچھا ہے، خوش بختی سے حالات کچھ سازگار تر

آرہے ہیں۔ خود صدر مملکت بابائے مرحوم کے مخلصین میں سے ہیں اور ان کی یاد کو عزیز رکھتے ہیں۔ آج ان کے ابرو کا ایک اشارہ وہ سب کچھ کرسکتا ہے جس کے لئے مرحوم اپنی زندگی کے آخری ایام میں بے تاب و مضطرب اور مضطرب رہے۔

اگر ایک کمشنر (مراد حیدرآباد کے کمشنر صاحب سے ہے) صرف اپنی کوششوں سے امراء کے بچوں کے ایک مغربی طرز کے اسکول کے لئے اڑتالیس لاکھ روپے جمع کرسکتا ہے تو ہماری مملکت کا صدر اپنی ذرا سی توجہ سے پچاس لاکھ روپے کی وہ ضروری رقم کیوں نہیں فراہم کرسکتا جو ملک بھر میں ایک اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لئے درکار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عوام کے لئے اپنی قومی زبان کی ایک یونی ورسٹی امراء کے لئے انگلستانی زبان کے ایک نقلی اسکول سے ہزار ہا درجہ بہتر اور مفید ہے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ جناب صدر مملکت اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لئے ایک فنڈ کا اجرا فرما کر اسے اپنے نام کا وقار اور تحفظ عطا فرمائیں اور مطلوبہ سرمائے کی فراہمی کے سلسلہ میں ایک آخری تاریخ معین کردیں۔ اس عرصہ میں قوم جتنا روپیہ بہم پہنچا سکے اسے مذکورہ فنڈ میں جمع ہونے دیا جائے اور اگر مقررہ تاریخ پر مطلوبہ رقم میں کچھ کمی رہ جائے تو حکومت خود اسے پوری کردے۔ ہماری ناقص رائے میں قوم اور حکومت کا یہ تعاون ضرور رنگ آور ثابت ہوگا۔ مطلوبہ رقم ضرور فراہم ہوجائے گی، اور بابائے اردو کو وہ طمانیت جو زندگی میں میسر نہ آسکی جنت الفردوس میں ضرور میسر آجائے گی۔ واللہ المستعان۔

("ادبی دنیا" دور پنجم۔ شمارہ پنجم)

بقیہ:-

عظیم انسان

(بسلسلہ صفحہ ۲۴)

اتفاق ہوا۔ لیکن میں کراچی نہ جاسکا۔ ایک بار گیا تو کچھ کم مدت عرصے میں شرکت کے بعد علی الصباح وہاں سے روانہ ہوگیا، اور مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع نہ مل سکا اور اب ملنے کی تمنا ہمارے دل میں انگڑائیاں ہی لیتی رہی اور یہ "مرد مجاہد" ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلا گیا!

("چٹان" لاہور ۱۸ر۹ر۱۹۶۱ء)

●

نہ فکر معیشت نہ عشق بتاں ہے
مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

(بابائے اردو)

بنارسی داس چترویدی

مولوی عبدالحق مرحوم

۱۹۳۵ء کی بات ہے مولوی صاحب کا ایک خط مجھے ملا جس میں انھوں نے تحریر کیا تھا، اگر آپ آگرہ میں ہو تو میں ملنے کے لئے وہیں آنا چاہتا ہوں۔" مجھے اس خط سے حیرت ہوئی، میں نے فوراً جواب دیا" میں خود ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہونگا، آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں"

دو چار دن بعد میں دلّی چلا آیا، اسٹیشن پر عزیز اختر حسین رائے پوری موجود تھے، میں نے ان سے کہا، "آپ نے کیوں تکلیف کی! میں تو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر خود ہی پہنچ جاتا"

انھوں نے جواب دیا" آپ مجھ سے کہتے ہیں، خود مولوی صاحب آپ کو لینے آئے ہیں" اس پر میں اور بھی جھینپ گیا، اس وقت مجھے کئی روز تک دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر مولوی صاحب کے ساتھ رہنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ اس کے بعد جب تک وہ ہندوستان میں رہے۔ ان سے ملنے کے بیسیوں موقع مجھے حاصل ہوئے۔

مولوی صاحب بڑے خوش مزاج اور ملنسار تھے۔ اور مہمان نوازی تو گویا انھیں کا حصّہ تھی آج ان کے ساتھ بسر ہوئے کتنے ہی لمحوں کی یاد آرہی ہے۔

واردھا میں جب اردو ہندی والوں کی کانفرنس گاندھی جی نے بلائی تھی۔ مولوی صاحب ایک دن لیٹ پہونچے تھے اور اس لئے مہاتما جی نے کانفرنس کو ایک دن کے لئے ملتوی بھی کر دیا تھا، مولوی صاحب کو لینے کے لئے میں اسٹیشن پر حاضر ہوا تھا، دیکھتے ہی مولوی صاحب نے کہا، "بھئی، میں تمہارے لئے جائے کا ایک بہت بڑا پیالہ لایا تھا" لیکن وہ راستے ہی میں ٹوٹ گیا، اس کا مجھے سخت افسوس ہے، خیر! چائے آپ کے ساتھ پیونگا" جب کانفرنس ختم ہوئی تو انھوں نے کہا: "چلیئے پنڈت جی، ساتھ ساتھ چائے پئیں گے" اس وقت دہلی کے ایک ادیب نے کہا، "کیا میں چل سکتا ہوں؟" مولوی صاحب نے بڑی رکھائی کے ساتھ صاف کہدیا، "نہیں بھئی چائے تو ان ہی کے ساتھ پینی ہے"

ایک مرتبہ تو قریب پندرہ دن تک ان کے ساتھ رہنے کا موقع مجھے ملا تھا، سردی کے موسم میں بھی وہ غسل کر کے ٹہلنے نکلتے تھے اور ہم لوگ برابر ساتھ ساتھ ہی چلتے تھے۔ اس وقت مولوی صاحب کی عمر ۷۰ برس تھی اس وقت

ڈاکٹر انصاری نے ان کا بلڈ پریشر لیا تو وہ ۲۵ برس کے نوجوان کے برابر نکلا ۔ مولوی صاحب کو اچھا ملکہ تھا ٹہلتے وقت سڑک پر جھاڑو لگانے والا کوئی مہتر انہیں سلام کرتا تو وہ مڑ کر مجھ سے کہتے بس ، دلّی میں میری عزت کرنے والا یہی ایک آدمی رہ گیا ہے ۔"

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا ۔ کہ ہندو مسلم فسادات میں مولوی صاحب بال بال بچے ۔ وہ حیدرآباد سے آ رہے تھے کہ بھوپال اسٹیشن پر ان کے ایک دوست مسٹر شعیب قریشی نے انہیں یہ کہہ کر بزدستی اتار لیا کہ دہلی میں دنگے ہو رہے ہیں اور آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی حیدرآباد سے جو تین چار طلباء اس ڈبے میں آ رہے تھے وہ دہلی پہونچ ہی نہیں سکے ۔

پاکستان وجود میں آنے کے بعد وہاں ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے اس سے ان کے دل کو بڑا صدمہ پہونچا ۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ افسروں سے ملاقات کرنی ہو تو انہیں گھنٹوں بیٹھے رہنا پڑتا تھا ۔ وہ کہتے تھے ۔

" ایک زمانہ تھا جب کمشنر لوگ خود مجھ سے ملنے آتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے افسر کے یہاں مجھے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے

جب ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی بک رہی تھی ۔ ان دنوں میں مولوی صاحب کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا تھا اور میں نے محترم بابو راجندر ناتھ شہدا اور شری گھنشیام داس برلا سے ملکر یہ درخواست کی تھی کہ اس تاریخی کوٹھی کو محفوظ کر لیا جائے لیکن میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا ۔ مولوی صاحب یہ چاہتے تھے کہ اس تاریخی کوٹھی کو کسی کلچرل کام کے لئے ریزرو کر دیا جائے ۔ جب اس کوٹھی کے پیڑ کٹوائے جا رہے تھے ۔ مولوی صاحب بہت پریشان تھے ۔ شاید ان میں سے چند ایک ان کے اپنے ہاتھ کے لگوائے ہوئے تھے ۔ انھوں نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا ۔ " بے ایمان اس کو بھی کاٹ ڈالیں گے ۔" وہ نیم کا ایک بہت پرانا پیڑ تھا ۔ درختوں کا بڑی محبت کے باعث میں مولوی صاحب کے دل دکھ کا اندازہ لگا سکا اور تب میں سمجھا کہ انھیں نے یہ کرخت لفظ کس مجبوری میں استعمال کیا ہے ۔

عثمانیہ یونی ورسٹی کے سابق استاد شری بنسی دھر ودیا لنکار پر بھی میری طرح ہی مولوی صاحب کی نظر عنایت تھی ۔ وہ جب کبھی ان کی مہربانیوں کا ذکر کرتے ہیں تو آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں ۔ مولوی صاحب ہی نے انھیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ گروکل کے سناتک اور آریا سماجی ہیں ، یونی ورسٹی میں جگہ دلائی تھی ۔ مولوی صاحب بنسی دھر جی کی سیدھی سادی زبان میں لکھی ہوئی کوتاہیوں کے

بہت مدّاح تھے اور ان کی اکثر کویتائیں بار بار سنی تھی۔ خود مولوی صاحب نہایت سلیس زبان سمجھتے تھے اور ان کے کئی مضامین کا ہندی ترجمہ میں نے ویشال بھارت میں شائع کیا تھا۔

جب پانی پت میں حالی کا صد سالہ جنم دن منایا جا رہا تھا۔ مولوی صاحب مجھے وہاں اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ میں نے مولوی صاحب سے بہت اصرار کیا کہ پانی پت، کی یاترا میرے لئے تیرتھ یاترا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور تیرتھ یاترا میں کوئی ہندو دوسرے سے کرایہ نہیں لے سکتا۔ لیکن مولوی صاحب نے ایک نہ سنی اور اپنے پاس سے ٹکٹ خریدا۔ یہی نہیں پانی پت میں انھوں نے میرے لئے خاص طور پر ہندو بھوجن کا انتظام کیا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جاکر سر مسعود، سر اقبال، حفیظ جالندھری اور دوسرے خاص خاص اصحاب سے متعارف کرایا۔

مولوی صاحب میں مذہبی تعصب کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ کسی مذہبی تلاوت کے وقت جبکہ پانی پت میں سب ہی مسلم عوام کھڑے ہو گئے تھے، مولوی صاحب جہاں کے تہاں بیٹھے رہے۔

مولوی صاحب بڑے منکسرالمزاج تھے۔ ایک بار میں انھیں ڈاکٹر واسودیو اگروال سے ملانے کے لئے ان کے یہاں لے گیا۔ اگروال جی خود مولوی صاحب کے یہاں آنا چاہتے تھے۔ لیکن مولوی صاحب نہ مانے اور آپ ہی ان کے یہاں گئے۔ اس طرح بہن ستیاوتی ملک کے یہاں بھی وہ میرے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔

جب میں ابوہر سمیلن سے لوٹ کر آیا تو انھوں نے مجھے ایک دعوت دی جس میں دلّی کے خاص خاص اردو شاعر اور ادیب بھی مدعو تھے۔ محترم دتاتریہ برج موہن کیفی کے درشن مجھے اسی تقریب میں ہوئے تھے۔ اور امن صاحب سے بھی پہلی ملاقات یہی ہوئی تھی۔

مولوی صاحب بڑی آن بان کے آدمی تھے اور ان کا بہت سا روپیہ مہمان نوازی میں خرچ ہو جاتا تھا۔ ایک بار مولوی صاحب چندہ مانگنے کے لئے کسی نواب کے یہاں گئے۔ نواب نے کچھ تو مذاق میں اور کچھ طنزاً کہا .... "مولوی صاحب! آپ دوسروں سے تو چندہ مانگتے ہیں، پر یہ تو بتائیے کہ انجمن ترقی اردو کے لئے خود آپ نے کتنا پیسہ دیا ہے" مولوی صاحب اسی وقت لوٹ آئے۔ اور اسی وقت جو چالیس ہزار روپیہ ان کے پاس تھا انجمن کو دیدیا۔ یہ کہا کا فیصلہ تو انھوں نے پہلے ہی کر لیا تھا لیکن اب نواب کے طعنہ کو نہ برداشت کر سکے اور اپنی ساری پونجی انجمن کو دیدی۔

مولوی صاحب بہترین خاکہ نویس تھے۔ کامیاب نقاد تھے۔ اور تنظیمی صلاحیتوں میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مولوی صاحب میں فرقہ پرستی کی بو تک نہ تھی اور وہ ہندو مسلمان میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ کیفی صاحب کی جو کشمیری برہمن تھے اور ان سے عمر میں بھی بڑے تھے، بڑی عزت کرتے تھے۔

خوددار حد درجے کے تھے ۔ ایک بار انھوں نے سر اکبر حیدری کو چائے پر مدعو کیا ۔ حیدری صاحب شاید تیس چالیس منٹ لیٹ پہونچے ۔ دس پندرہ منٹ تو انھوں نے انتظار کیا اور پھر چائے کا سارا سامان اٹھوا دیا ۔ جب حیدری صاحب تشریف لائے تو مولوی صاحب نے فرمایا . . . .

" آپ کو تو ریاست کی بہت سی مصروفیات رہتی ہیں ۔ اس نے آپ کے لئے لیٹ ہونا معمولی بات ہے لیکن میں بھی کچھ کام کرتا ہوں ۔ آپ کا انتظار کیا اور پھر چائے ختم کر دی ۔ معاف کیجئے گا "

سر اکبر حیدری صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے ۔ اس لئے کچھ بھی برا نہ مانا ۔

مولوی صاحب حالی کے بڑے مداح تھے اور زبان کے معاملہ میں انھیں اپنا گرو مانتے تھے مولوی صاحب کے کتنے ہی خاکوں کا ہندی ترجمہ ہو چکا ہے ان کی اردو انگلش ڈکشنری ہندی والوں کے بھی بڑے کام آتی ہے ۔ اور ڈاکٹر ہری شنکر شرما کا تو یہاں تک خیال ہے کہ وہ اس موضوع کی بہترین لغت ہے ۔

معلوم نہیں مولوی صاحب نے اپنی سوانحعمری لکھی ہے یا نہیں ۔ کتنی ہی پرانی باتیں انھیں یاد تھیں اور انھیں بڑے شوق سے سنایا کرتے تھے انھوں نے سر سید احمد خاں کے رفیق راجہ جے کشن داس کو دیکھا تھا اور سر راس مسعود کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کا ذکر بھی کیا ہے ۔ مولوی صاحب مکتوب نویس بھی بہت اچھے تھے ۔ میرے پاس ان کے کتنے ہی مکتوب محفوظ ہیں ۔ لیکن ہیں وہ انگریزی میں ۔ ان کے کتنے ہی خطوط محترم سہیل عظیم آبادی کے پاس موجود ہیں ۔

اردو کے ادیب مولوی صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں " بابائے اردو " کے لقب سے یاد کرتے تھے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مولوی صاحب کے متعلق ایک یادگار کتاب اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع کی جائے جو لوگ ہندی اور اردو میں امتیاز نہیں کرتے یا اردو کو ہندی کا اسٹائل محض مانتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس کام کو سرانجام دیں ۔ ہندوستان میں اس وقت بھی ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں ۔ جو مولوی صاحب کے احسان مند ہیں ۔ ایسے آدمیوں میں میں بھی اپنا شمار کرتا ہوں ۔ ڈاکٹر تارا چند جی پر ان کی خاص نظر عنایت تھی ۔ ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد آرہا ہے ۔ جب ڈاکٹر تارا چند الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو مولوی صاحب ان کو مبارک دینے کے لئے ہی دلی سے الہ آباد گئے ۔ اس وقت میں مولوی صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا تھا ۔ پنڈت سندر لال سے بھی ان کے مراسم بہت اچھے تھے

مولوی صاحب میں کوئی کمزوری نہیں تھی ۔ یہ میں نہیں مانتا ۔ اردو کے ساتھ ان کی عقیدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کی وجہ سے کبھی کبھی وہ اپنا توازن کھو بیٹھتے تھے ۔ ایک بار مہاتما جی کے بارے

میں لکھتے ہوئے ایک ایسا لفظ استعمال کر دیا تھا جس سے ہم ہندی والوں کو بڑا صدمہ پہونچا تھا۔ سنا ہے کہ بنگالی زبان کے بارے میں بھی ان کا نظریہ غلط تھا۔ پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ بات چیت میں کبھی کبھی اپنے مخالفوں کے لئے سخت الفاظ استعمال کر دیتے تھے۔ لیکن بہت دنوں تک ساتھ رہنے پر بھی مجھے ایسا محسوس نہیں ہوا۔ صرف ایک بار کو چھوڑ کر جس کا میں نے اوپر ذکر کر دیا ہے۔ کبھی ان کے منہ سے کوئی کڑوی بات نہیں سنی۔

مولوی صاحب کے ساتھ چائے پینے میں بڑا ذوق آیا تھا۔ خود وہ بہت کم کھاتے تھے۔ برسات میں وہ دن میں صرف ایک ہی وقت کھانا کھاتے تھے۔ لیکن دوسروں کو بار بار تقاضا کر کے کھلایا کرتے تھے ان کی اس وقت کی گفتگو بڑی عالمانہ ہوتی تھی مولوی صاحب کو میں نے کئی مرتبہ ہنسایا تھا۔ اس لئے مجھ پر ان کی خاص نظر عنایت تھی۔ ایک بار میں نے مولوی صاحب کا فوٹو لیا جس میں ان کے سر کا کچھ حصّہ کٹ گیا۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں آرٹسٹ فوٹو گرافر ہوں۔ جب انھوں نے اس کا مطلب پوچھا تو میں نے مسکتے ہوئے سر کی بات کہہ سنائی۔ اور مولوی صاحب بڑے محظوظ ہوئے۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ میں نے اپنے کیمرہ سے آپ کا تو سر ہی کاٹا ہے لیکن مہاتما بھگوان دین کا تو دھڑ ہی ندارد ہے۔ اس بات سے مولوی صاحب اور بھی لطف اندوز ہوئے۔

ایک مرتبہ وہ شام کی چائے کے وقت میرا گھنٹہ بھر تک انتظار کرتے رہے۔ اور جب میں آیا تب ہی چائے پی۔ میں نے معافی چاہی اور مولوی صاحب نے مجھے معاف کر دیا۔

مولوی صاحب عمدہ سے عمدہ چائے منگواتے تھے۔ وہ کیا گئے چائے پینے کا مزہ ہی چلا گیا ع

کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائیگا کیا
جب رونق بزم تم ہی نہ رہے

اور مولوی صاحب کے تین چار خط موصول ہوئے تھے پر میں ان کا جواب نہیں دے سکا۔ اور جب جواب لکھا تو وہ کافی بیمار تھے۔ اپنی کاہلی پر مجھے سخت افسوس ہے اور مولوی صاحب کی مرحوم روح سے میں معافی چاہتا ہوں۔ میں باپ کی طرح ان کا احترام کرتا ہوں۔

(سہ ماہی رسالہ صبح انجمن ترقی اردو ہند) دہلی جلد اول ۱۹۶۱ء

دلا رمز حیات از غنچہ آموز
حقیقت در مجازش بے حجاب است
ز خاک تیرہ می روید ولیکن
نگاہش بر شعاع آفتاب است

اقبال

ڈاکٹر عندلیب شادانی

چراغ راہ

آج اردو یتیم ہوگئی۔ کیونکہ بابائے اردو نے سفر آخرت اختیار کیا، انا للہ وانا الیہ راجعون خداوند عالم انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

بچپن میں پڑھا تھا کہ اردو کے معنی لشکر کے ہیں۔ بابائے اردو اس لشکر کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی، انہوں نے ساری زندگی اردو کی حفاظت وحمایت میں گزار دی۔ اردو کے صاحب طرز ادیب بھی تھے اور اردو زبان و ادب کے نقاد اور محقق بھی، ان کی قواعد اردو آج بھی اردو کی صرف نحو پر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اردو کے بہت سے گنجہائے گراں مایہ کو ماضی کی تہوں سے کھود کر نکالا اور قوم کے سپرد کیا۔ ان کے احسان کے بوجھ سے ہم سب کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ جتنی طویل انہوں نے عمر پائی اتنی ہی کثیر ان کی قربانیاں ہیں۔

عمر بھر انہوں نے شادی نہیں کی اور کیوں کرتے وہ پکے موحد تھے، ایک خدا کے قائل۔ ایک رسول کے ماننے والے، اور ایک محبوب کے پرستار، کسی شاعر نے شاید انہی کے متعلق کہا ہے ؎

محبت بدلتی نہیں آستانہ
نہ میرے صنم دو نہ میرے خدا دو

ان کی یکتا و یگانہ محبوب اردو تھی۔ اس کی پرستاری میں ساری عمر گزار دی۔ سوئے تو اردو کے خیال کو سینہ سے لگا کر۔ جاگے تو اردو کی لگن، اردو کی دھن لئے ہوئے۔

ان کا ایمان تھا کہ مسلمانان ہند و پاکستان کی بہبود و ترقی کا دارومدار اردو کی ترویج و ترقی پر ہے۔ اسی لئے وہ اس امر کے بے حد آرزومند تھے کہ پاکستان میں اردو جلد سے جلد انگریزی کی جگہ

لے لے۔ عدالتوں کی زبان اردو ہو، اسمبلیوں کی زبان اردو ہو، دفتروں کی زبان اردو ہو، اور ہمارے اسکولوں اور کالجوں کا ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کراچی میں اردو کالج کھولا۔ اسی مقصد کے لئے وہ اردو یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔

ان کے کارناموں کی تفصیل کا محل نہیں۔ یہ بات تو یونہی زبان پر آگئی۔ اس وقت تو مرحوم کی ابدی جدائی کا اندوہ کچھ سوچنے کی اجازت نہیں دیتا، آج پورا پاکستان سوگوار ہے۔ کراچی اور لاہور سے کم ڈھاکے کے دل کو صدمہ نہیں پہنچا۔ جن کی زبان اردو ہے، ان کی آنکھیں مرحوم کے غم میں نمناک ہیں اور جن کی زبان اردو نہیں وہ بھی اردو والوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اس لئے کہ مولانا کی ذات مشرقی و مغربی پاکستان کی مشترکہ دولت تھی۔ موت کے بے درد ہاتھوں نے وہ دولت ہم سے چھین لی۔ ہمیں اپنے اس عظیم الشان نقصان کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا، صدمے کی شدت نے دلوں کو بے حس بنا دیا ہے۔ دماغوں میں سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ چوٹ ابھی گرم ہے اس لئے درد کی شدت محسوس نہیں ہوتی۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد جب ہم سوچنے کے قابل ہوں گے، تو اندازہ ہوگا کہ ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا۔

مولانا کی ذات میں ایک عجیب کبریائیت تھی۔ ایک بار جو ان سے قریب ہوا پھر کبھی ان سے دور نہ ہو سکا۔ کم سے کم میرا ذاتی تجربہ تو یہی ہے پاکستان بننے سے پہلے بھی مولانا ملک گیر شہرت کے مالک تھے مجھے ان سے ملنے یا مراسلت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب مولانا ڈھاکے تشریف لائے تو پہلی ہی ملاقات کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے عمر بھر سے ان سے گہرے تعلقات ہیں۔ اس کے بعد مکاتبت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خط لکھتے تو کس محبت کس خلوص کے ساتھ۔ کتنی اپنائیت کتنی یگانگت کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے بعض لوگوں سے سنا تھا کہ مولانا بے حد خود رائے انسان ہیں۔ مگر مشرقی پاکستان میں اشاعت اردو کے پروگرام بناتے وقت انہوں نے بارہا مجھ سے مشورہ کیا اور اپنی رائے پر میری رائے کو ترجیح دی۔ ان کی دوستی کی سب سے اہم بنیاد صرف ایک چیز تھی۔ اردو سے وابستگی جو شخص اردو کا جتنا زیادہ شیدا ہوتا اتنا ہی وہ مولانا کی نظر میں قابل قدر ٹھہرتا۔ اردو دشمنی ان کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم تھی۔

مولانا کو خوش کرنے کی بہترین صورت یہ تھی کہ اشاعت اردو کی کسی اسکیم میں ان کی مدد کی جائے خواہ وہ مدد کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ مولانا کے کردار میں جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اردو کی حمایت میں ان کی حق گوئی اور بے باکی تھی اس باب میں وہ نہ گورنر جنرل سے ڈرتے تھے نہ وزیر اعظم

اور نہ دوسرے حکام عالی مقام سے۔ وہ بنگالی کے قائل نہ تھے۔ جو کچھ کہنا ہوتا تھا نہایت صاف کہتے تھے۔ انہوں نے اردو کی حمایت کے سلسلہ میں کبھی مصلحت کی آڑ نہیں لی۔ اگر حکومت کے طریقِ عمل پر نکتہ چینی ضروری سمجھی تو ایسی دو ٹوک باتیں کہیں کہ سننے والے دنگ رہ گئے۔ یہ سب کچھ ان کے خلوص کا اثر اور حسن نیت کا نتیجہ تھا۔

پاکستان بننے کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میں تقریباً ہر سال ایک مرتبہ کراچی ضرور جاتا ہوں۔ میرا یہ دستور تھا کہ جب کبھی کراچی جاتا جلد سے جلد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ہمیشہ ان کا پہلا سوال یہی ہوتا کہ سنایئے آپ کے یہاں اردو کا کیا حال ہے؟ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ مولانا آپ سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیا کیجئے۔ چند خود غرض اشخاص کے سوا بنگال میں اردو کا دشمن کوئی نہیں خصوصاً ڈھاکہ تو خالص اردو کا شہر ہے۔ سارا شہر اردو بولتا ہے اور اردو سمجھتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ پورے مشرقی پاکستان میں ایک گریجویٹ بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو اردو نہ سمجھتا ہو اور ان میں سے اکثر اردو بول بھی سکتے ہیں۔ یہ سن کر بے حد مسرور ہوئے اور کہنے لگے۔ شادانی صاحب اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ نے میری زندگی کے کئی سال بڑھا دیئے۔

ایک مرتبہ میں کراچی جا کر بیمار ہو گیا اور مولانا کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ ایک دن میرے ایک شاگرد ڈاکٹر نور الدین نے مولانا سے ذکر کیا کہ شادانی صاحب کراچی آئے ہوئے ہیں۔ پوچھا تمہیں کیوں کر معلوم ہوا؟ کہا۔ میں خود ان سے مل کر آ رہا ہوں۔ مولانا نے بڑے تعجب سے کہا، اچھا۔ مگر وہ جب کبھی کراچی آتے ہیں مجھ سے ملنے ضرور آتے ہیں۔ اس مرتبہ کیوں نہ آئے۔ نور الدین نے کہا ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ مولانا نے کہا طبیعت اچھی نہیں ہے؟ تو پھر تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اور میں ان کی عیادت کو نہیں گیا۔ اچھا اب تو رات ہو گئی ہے۔ کل صبح آؤ تو انہیں دیکھنے چلیں گے۔ چنانچہ دوسرے روز صبح کو میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ میں ایک دوست کے یہاں سہ منزلہ پر ٹھہرا ہوا تھا۔ مولانا اتنی سیڑھیاں چڑھ کر آئے۔ پسینے پسینے ہو گئے۔ میں نے بے حد معذرت کی کہ قبلہ میں تو خود ہی دو ایک دن میں حاضر ہونے والا تھا۔ آپ نے ناحق زحمت فرمائی۔ کہا کیا کروں۔ دل نہ مانا۔ مولانا کا یہ خلوص میرے لئے مخصوص نہ تھا۔ اردو کے ہر خدمت گزار کو وہ اپنا عزیز ترین دوست سمجھتے تھے اور اس سے یگانوں کی طرح ملتے تھے۔

کوئی چھ سات برس ہوئے مولانا نے کراچی میں انجمن ترقی اردو کی جوبلی بڑے دھوم دھام سے منائی تھی۔ اسی جلسے میں اردو یونیورسٹی کی تجویز پاس

ہوئی تھی۔ میں نے وہ ریزولیوشن پیش کیا تھا اور اس کی حمایت میں تقریر کی تھی۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے بھی ریزولیوشن کی تائید میں ایک نہایت پرزور تقریر فرمائی تھی۔ جس وقت میں نے یہ کہا کہ مجھے یقین کامل ہے کہ جو کام جوانوں اور طاقت وروں سے نہ ہو سکا وہ انشاءاللہ ایک پیر ناتواں کے ہاتھ سے انجام پائے گا۔ تم مولانا کے ہاتھوں کی جھریوں کو بڑھاپے کے آثار نہ سمجھو۔ یہ آہنی تار ہیں جنہوں نے مولانا کے ہاتھ کو پنجۂ فولاد بنا دیا ہے۔ یہی فولادی ہاتھ اردو یونیورسٹی کی بنیادیں رکھے گا۔ دیواریں اٹھائے گا اور خیالی تصویر کو مادی وجود بخشے گا۔ مولانا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا تھا۔ ان کی وہ مسکراتی ہوئی تصویر اس وقت بھی میری آنکھوں میں پھر رہی ہے اور بے اختیار یہ مصرع زبان پر آتا ہے ؏

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(ریڈیو پاکستان ڈھاکہ)

بقیہ

بابائے اردو کی ادبی خدمات

اعلیٰ درجے کے محقق اور نقاد بلند پایہ تخلیقی فن کار نہیں ہوتے ان کا دائرہ صرف تحقیق و تنقید ہی تک محدود رہتا ہے لیکن بابائے اردو کے یہاں تحقیق، تنقید اور تخلیق آپس میں گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے ان سب کا ایک نہایت ہی حسین امتزاج اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے اسی لئے وہ ان مختلف رنگوں کی ایک حسین قوس قزح معلوم ہوتی ہے۔ ان کا تخلیقی جوہر تحقیق اور تنقید میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس کا شباب بعض ایسی اصناف میں نظر آتا ہے جس کی نوعیت تخلیقی ہے۔ اور جس کی طرف بابائے اردو نے توجہ کی ہے مثلاً شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کا انہوں نے ایک نیا انداز پیدا کیا ہے۔ اس میں سیرت اور سوانح کا رنگ افسانے کے رنگ کے ساتھ کچھ اس طرح شیر و شکر ہو گیا ہے کہ بڑی دلآویز سی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اس فضا میں تحقیق و تنقید کی بجلیاں بھی کوندتی ہیں اور مجموعی طور پر ان تمام پہلوؤں کا امتزاج پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ یہ خاکے انشا کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان میں انشائیے کی صنف کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں پھر بابائے اردو کے اسلوب کی سادہ پرکاری نے انہیں معراج کمال پر پہنچا دیا ہے اور اس طرح یہ صنف ان کے ہاتھوں میں تخلیقی ادب کا ایک شاہکار بن گئی ہے۔

بابائے اردو نے اپنی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کاوشوں سے اردو ادب میں نہ صرف گراں بہا اضافے کئے بلکہ ان تمام اصناف میں کام کرنے کی صحیح فضا بھی قائم کی اس طرح سنجیدگی کے ساتھ ادبی مطالعے کا رجحان عام ہوا اور یہ ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ہماری ادبی روایت کے افق پر رہتی دنیا تک ان کے نام کا ماہتاب جگمگاتا رہے گا، اور آئندہ نسلیں ہمیشہ ہمیشہ اس سے روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔

ماہنامہ "افکار" کراچی

ستمبر ۱۹۶۱ء

سید وقار عظیم

اردو یتیم ہو گئی

آج گیارہ بجے جب کسی نے ٹیلی فون پر مجھے یہ خبر سنائی کہ "بابائے اردو کا انتقال ہو گیا" تو میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا کہ "آہ! اردو یتیم ہو گئی!" اور اس کی یتیمی میں دردمندی کا جو رنگ ہے وہ اتنا گہرا شاید کسی اور کی یتیمی میں نہ ہوا ہو جتنا اس وقت ہے۔ اس لیے کہ اپنی اولاد کو شاید کسی نے کبھی اس دل سوزی سے نہ چاہا ہو جتنا بابائے اردو نے اردو کو چاہا۔ ان کی پوری زندگی کی کہانی اردو کے لیے محبت شفقت اور جاں نثاری کی کہانی ہے۔ وہ اردو کے لیے جیے، اردو کے لیے مرے۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اردو انہیں اپنے کھانے پینے سونے جاگنے سے زیادہ پیاری تھی۔ ان کی صحت کے شب و روز اردو کی خدمت میں بسر ہوئے اور ان کی بیماری کی گھڑیاں اس کی یادوں میں گزریں۔ دنیا میں انسان کے لیے دوستی اور دشمنی کے رشتوں سے زیادہ مضبوط رشتے نہیں۔ بابائے اردو نے دوستی اور دشمنی کا پیمانہ بھی اردو کو بنایا۔ جسے اردو جتنی زیادہ عزیز تھی وہ ان کا اتنا ہی بڑا دوست تھا۔ جسے اردو سے جتنی دشمنی تھی وہ ان کا اتنا ہی بڑا دشمن تھا۔ اردو کو ایسا چاہنے والا کہاں نصیب ہوگا۔

بابائے اردو نے اردو کے ساتھ جو محبت کی، اور جس انداز خاص سے اس کی خدمت کی، اس میں "مرد مومن" کی زندگی کی شان پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ جہاں اردو کو مجلسوں، خانقاہوں، مدرسوں اور کتب خانوں میں کسی ایسے خدمت گزار کی ضرورت تھی جو خلوص کے سارے اوصاف کا پیکر بن کر تحقیق و تنقید کا حق ادا کرے، وہاں بابائے اردو مومن کی شان تمام کے مظہر ہیں اور اپنی سادگی بیان اور شیرینی گفتار سے تحقیق کو تنقید اور تنقید کو تحقیق سے ہمدم و دمساز کیا۔ نثر و نظم کے جو بیش بہا خزانے دوسروں کی نظر سے پوشیدہ تھے انہیں علم و ادب کے شیدائی کی قسمت بنایا۔ ادب

شعر کے جن جواہر پاروں کی قدر و قیمت متعین نہیں تھی انہیں عدل کی میزان میں تول کر کھوٹے کھرے کا فرق واضح کیا اور ایسی مدرسے و مجلس پیدا یات اردو کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے یہاں روزمرہ کی بولی کو چلن دے کر اسے خواص و عوام دونوں کی پسند کا رتبہ دلایا۔ تحقیق و تنقید جس کی رسائی اب تک صرف خواص تک تھی عوام کے دلوں تک بھی پہنچی۔

اردو کی تاریخ اور اس کی نشو و نما کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے مدرسوں اور مجلسوں میں اپنی جگہ بنائی اور دوسرا پہلو یہ کہ مدرسوں اور محفلوں سے باہر کوچہ و بازار میں اپنا سکہ رواں کیا۔ اس میدان میں اسے دشمنوں کی دشمنی اور شرارت کا سامنا کرنا پڑا اور یہاں اس کی حفاظت کے لئے ایسے جانبازوں کی ضرورت تھی جو سینہ سپر ہو کر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکر لیں اور اردو کو اس مقام اور منصب پر فائز رکھیں جو اس کا حق تھا۔ اس محاذ پہ مدرسوں اور خانقاہوں میں پرورش پانے والے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ قلم چلانے والے تلوار کے دھنی نہیں ہوتے لیکن بابائے اردو کی ذات اس محاذ پر مومن کی شانِ جلال کا پیکر بن کر سامنے آئی اور اردو کے لیے ایسی وہ لڑائیاں لڑیں جو کسی اور کے بس کی نہیں تھیں۔ یہاں ان کی شان ایک ایسے مردِ مجاہد کی تھی جو للکار کر آگے بڑھتا اور بے خوف ہو کر وار کرتا ہے۔ انہوں نے وار کئے اور وار سہے۔ جسم کی چوٹوں سے زیادہ روح کے صدمے اٹھائے۔ لیکن اس لڑائی میں قدم پیچھے ہٹانے کو اپنی اور اپنے بلند نصب العین کی توہین سمجھا اور یوں رزم و بزم دونوں میں بڑے سے بڑے معرکے سر کر کے اردو کو سرفرازی اور بلندی پہ پہنچایا۔

اردو کی سربلندی اور سرفرازی کی یہی خواہش ان کی زندگی کے آخری لمحوں کی آرزو تھی۔ اس آرزو کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا لیکن ان کی آرزو اس سے بہت زیادہ تھی۔ اردو بلا شرکتِ غیرے پورے ملک کی زبان ہو، اردو ملک کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے درمیان محبت و آشتی کے رشتوں کو استوار کرنے کا وسیلہ بنے۔ اردو کو خیال اور جذبات کے اظہار کی قدرت کا اہل تسلیم کیا جائے، اردو دلوں پر راج کرے، ذہنوں پر اس کی حکومت ہو، اسے ملک اور قوم کی وحدت اور استحکام کا واحد وسیلہ سمجھا جائے، وہ دنیا کے ساتھ ساتھ دین اور تہذیب کے ورثے کی سب سے بڑی امین ہونے کا منصب ادا کر سکے۔ اردو کا پرچم ہر گھر پہ، ہر دکان پہ، ہر دفتر، ہر چوٹی پہ لہراتا ہوا نظر آئے اور اس پرچم اور قوم کے ہلالی پرچم میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔

ایک مردِ مجاہد نے اس آرزو میں اپنی جان دی۔ اس آرزو کی پاسبانی اور نگہداشت کو ہماری آرزوؤں کا محور ہونا چاہئے کہ یہی اردو کے اس شہید کی یاد کو تازہ رکھنے کی سب سے پسندیدہ صورت ہے۔

(۲۰ اگست ۱۹۶۲ء)

سلام مچھلی شہری

اہلِ خرد، صاحبِ نظر، روشن دماغ ؎۱

مولانا کے بچھڑ جانے سے اردو دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا ابھی بہت دنوں تک مشکل ہے۔

شاید ۱۹۳۷ء میں مولانا کی "ادبی خدمات" کا اعتراف کرتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے مولانا کو دُور سے دیکھا تھا۔ پھر انہیں قریب سے دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع ان دنوں نصیب ہوا جب مراد آباد میں ایک عظیم الشان اردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ محترم اختر حسین رائے پوری (جنہیں میں بھائی جان کہتا تھا اور کہتا ہوں) بھی انہی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے مجھے اس دور میں "مولانا قسم" کے لوگوں سے بڑی چڑ تھی مگر موصوف سے ملنے کے بعد میں ان کے ترقی پسند خیالات سے بہت متاثر ہوا۔ کھانے کی میز پر اور چائے کے دوران میں ان کی زندہ دلی اور لطیفہ گوئی دیکھ کر یہ سوچنے لگا تھا کہ مولانا تو ہم نوجوانوں سے زیادہ نوجوان ہیں۔ کبھی کبھی تو ان صحبتوں میں مجازؔ بھی پھیکے پڑ جاتے تھے اس کے بعد میں مولانا سے دلی میں ملا، اور پھر کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

میں نے مولانا سے کسی بھی اچھے CAUSE کے لئے مستقل مزاجی اور سعیِ پیہم کا سبق لیا ہے میں نے مولانا کی تحریروں سے اردو کے کلاسیکی اور تحقیقی ادب کے متعلق روشنی لی ہے۔

میں نے مولانا کی زندگی سے حوصلہ مندی کا درس لیا ہے اور یہ سیکھا ہے کہ روشنی پانے کی تمنا اگر مقدس اور پرخلوص ہے تو اندھیروں سے نہ گھبرانا چاہئے ـــــ روشنی مل کے رہے گی ـــــ !!!

؎۱ مدیر "قومی زبان" کے نام ایک طویل مکتوب کی تلخیص

مولانا کیوں اور کن حالات میں پاکستان گئے اس مسئلے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ذاتی طور پر مجھے نہ مولانا کا وہاں جانا اچھا لگا اور نہ جوش کا۔ بہرکیف سوچنا تو یہ ہے کہ آج جبکہ مولانا ہمارے درمیان نہیں رہیں ہم شاعروں اور ادیبوں کے فرائض کیا ہیں؟ سوگ تو ہم منا چکے (عملی زندگی میں "ماتمی MOOD" کا بہت دنوں تک قائم رہنا نقصان دہ ہوتا ہے)۔ اب کیا کرنا ہے؟ میرے خیال میں اب ہمیں ان مقاصد کے لئے از سرِ نو کوشاں ہونا ہے جو مرحوم کو عزیز تھے۔ عظیم ہستیوں کی زندگی میں جو پیغام پنہاں ہوتا ہے، وہ کبھی نہیں مرتا۔ اور اسی لئے اب "انجمن" کی ادبی خدمات میں پہلے سے زیادہ گہما گہمی پیدا ہو جانا چاہیئے۔ مولانا کا آخری مبارک خواب پاکستان میں "اردو یونیورسٹی" کا قیام تھا۔ ہم لوگوں کو اس خواب کی سچی تعبیر کے لئے سرگرمی سے جدوجہد کرنی چاہیئے —— زبان و ادب کے منارے، خواہ وہ کہیں بھی روشن ہوں تمام دنیا کو نور بخشتے ہیں۔

میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو آج اچھی پوزیشن کے مالک ہیں مگر یقین کرو تو بتاؤں کہ ان کی کامیابی کی یہ درخشاں منزل مولانا کی علمی اور ادبی سرپرستیوں کی بدولت آئی ہے۔ وہ ہونہار طالب علموں کی بھی سرپرستی کرتے تھے، غریب شاعروں اور ادیبوں کی بھی مدد کیا کرتے تھے۔ ایک ادیب کو تو انہوں نے یورپ بھی بھجوایا تھا۔

غرضکہ سرسید اپنی تمام زندگی زبان و ادب اور قوم کی جس منزل ضیا بار کے لئے رواں دواں تھے مولانا کی زندگی کے کارناموں میں بھی ہمیں اس منزل کی درخشاں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ چند ہلکی ہلکی غلطیاں سرسید مرحوم سے بھی ہوئیں اور مولانا سے بھی مگر میرا دعویٰ ہے کہ مستقبل کا کوئی مورخ بھی ان دونوں کی اعلیٰ خدمات سے انکار نہیں کر سکتا بلکہ اس سلسلہ میں ہم آئندہ جو کام بھی شروع کریں گے ہمیں ان عظیم شخصیتوں کے اس نور کا سہارا لینا پڑے گا جو ہمیں حاصل تھا۔ حاصل ہے۔!!

سلام مچھلی شہری

بابائے اردو کی یاد میں

روشنی جب بھی، جہاں بھی ختم ہوتی ہے سلام
سوچتا ہوں بجھ گیا میری ہی محفل کا چراغ
جب بھی وقتِ شام مرجھاتا ہے کوئی گل کہیں
سوچتا ہوں جیسے ویراں ہو گیا میرا ہی باغ
میری نظروں میں ہیں شمعیں میری نظروں میں ہیں پھول
دہر کے اہلِ خرد، صاحبِ نظر، روشن دماغ
جانِ گل ہائے قریب و دور عبدالحق بھی تھے
بزمِ اردو کے لئے اک نور عبدالحق بھی تھے

●

جمیل الدین عالی

بوڑھا سپاہی

جب مولوی صاحب کا جنازہ ہسپتال سے انجمن لایا گیا۔ اور سینکڑوں آدمی مختلف کاموں پر لگ گئے تو میرا گیارہ برس کا بچہ بڑی مصروفیت کے عالم میں ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ وہ کبھی شامیانے کی طرف جاتا۔ جہاں ان کا غسل ہوتا تھا۔ کبھی انجمن سے متصل ہال کی طرف دوڑتا جہاں فاتحہ خوانی کے لئے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اور کبھی ان مزدوروں میں شامل ہو جاتا جو انجمن کے احاطے میں قبر کی جگہ نکالنے کے لئے ایک کمرہ توڑ رہے تھے وہ بچہ خود کو تمام ہنگاموں اور انتظامات سے متعلق سمجھ رہا تھا۔ کہیں کہیں اپنی رائے بھی دیتا تھا۔ اور لمحہ لمحہ مجھے ہر بات کی رپورٹ دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مولوی صاحب کی تدفین میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

یہی کیفیت اس کا باپ مولوی صاحب کی زندگی میں محسوس کرتا تھا۔

بڑے آدمیوں میں یہ ایک بڑا عیب ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں بہت سے چھٹ بھیوں کا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ اور موت کے بعد ان سب کو ایک انتشار کے عالم میں چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ بے سہارا ہو جانے کے بعد ان کے چھٹ بھیوں کے تیز رفتار ذہن لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ اور انھیں ایک دم اپنی کم توقیری کا احساس ستانے لگتا ہے۔ مولوی صاحب کا دائرہ سر سید سے لے کر ہر اس بچے تک پھیلا ہوا ہے۔ جو انھیں بابائے اردو کہتا ہے۔ ان پانچ نسلوں کے زمانے میں انھوں نے ہزاروں مہمات لڑیں۔ ہزاروں کتابیں چھاپیں ہزاروں بیان دیئے۔ ہزاروں جلسے کئے۔ مناظرے کئے۔ لاکھوں میل کا سفر کیا۔ ہزاروں لاکھوں ساتھی بنائے اور ہزاروں چھوڑ دیئے۔ مگر یہ صرف سب ایک تحریک کی خاطر تھا۔ جسے مختصراً اردو کہا جاتا ہے۔ اس کی تحریک کی خاطر وہ مجھ جیسے ہزاروں معمولی اور نیم خواندہ لوگوں کے دوست بن گئے تھے، جو انھیں قریب سے جاننے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

(ادارۂ جنگ کے انعام عزیز بھی بڑے ظالم ہیں۔ کہ ۱۶ر اگست کی شام کو مولوی صاحب دفن ہوئے اور ۲۰ر اگست کی صبح کو وہ ایک طرح عبدالحق نمبر پیش کر رہے ہیں) میں اپنے جذباتی ردعمل سے تو نکلا نہیں۔ مضمون تو کیا لکھوں گا۔ یوں ہی میں مولوی صاحب کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے انھیں بہت کم دیکھا ہے۔ ایک بڑے آدمی کو سمجھنے کے لئے یا تو اس کی ذہنی سطح تک پہنچنے کے لئے ذہانت میسر ہو۔ یا ایک طویل مدت اس کے ساتھ گزاری جائے۔ میں انھیں ۱۹۴۲ء سے جانتا تھا۔ مگر کیا جانتا تھا۔ ہاں اس مدت ایک تلخ واقعہ

ضرور یاد آرہا تھا۔

یہ مولوی عبدالحق جن کی موت پر صدر ریاست سے لے کر شوا تبلی تک نے تعزیتی پیغام بھیجے۔ اور جن کا جنازہ کراچی کی سڑکوں پر جلوس کی شکل میں نکلا آج سے تین برس پیشتر بھی وہی مولوی عبدالحق تھے۔ اور لوگ ان کے نام اور کام سے بھی طرح واقف تھے لیکن شاید بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہوں گے کہ ۱۹۵۹ء میں انجمن کی چوتھی منزل پر ایک ایسے کمرے میں رہتے تھے۔ جس میں بجلی کا کنکشن کاٹ دیا گیا تھا۔ پنکھا اتار لیا گیا تھا۔ اور پانی کے نل تک بند کر دیئے گئے تھے۔

جب تدفین کے بعد صدر ایوب کے اے ڈی سی اور پاکستانی بحریہ کے کمانڈران۔ چیف کے اے ڈی سی اور نظامت کراچی اور کراچی کارپوریشن کے سربراہوں نے پھولوں کی نہایت وزنی اور قیمتی چادریں ان کے مزار پر رکھیں۔ تو میری نظریں ادہر اٹھ گئیں۔ جہاں اس کمرے کی ایک دیوار نظر آئی۔ جس میں مولوی صاحب نے دو سال اس طرح گزارے کہ پنکھا خود جھلتے اور پانی نیچے سے منگاتے۔ اور ٹیلیفون کے لئے بار بار ایک سو بیس سیڑھیوں کی مسافت طے کرتے، اس وقت ان کی عمر نوے سال تھی۔

یہ انعامات انھیں اس سلسلے میں ملے تھے کہ وہ اردو تحریک کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتے تھے۔ وہ انجمن کے ملازموں کو خود مقرر کرنا چاہتے تھے وہ مسودات کے انتخاب میں دخیل تھے۔ جبکہ انجمن چند "دستوری نظما" انھیں صرف ایک بے عمل بوڑھے کی حیثیت میں رکھنا چاہتے تھے۔

انھوں نے "اردو کالج کا المیہ" شائع کیا۔ پریس کو بیانات دیئے۔ حکام کے پاس گئے۔ عوام سے اپیل کی۔ مگر عوام بے بس۔ اور حکام "معترف" تھے

ایک ہیں میاں ابن انشاء جو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ یہ حضرت جالندھر کے "عبرا اہل زمان" ہیں۔ اور اردو کالج کے سابق طالب علم ہیں۔ یہ مولوی صاحب کے بُرے زمانے کے ساتھی نکلے۔ اور کسی نہ کسی طرح ایسی تحریک چلائی کہ لوگوں نے مل جل کر مولوی صاحب کا معاملہ وزارت تعلیم کی معرفت صدر ایوب تک پہنچایا اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ایک مارشل لا کا ضابطہ آگیا۔ جس کی رو سے انجمن کا مستقل صدر باختیار مولوی صاحب کو مقرر کر دیا گیا۔ اور ایک انتظامی بورڈ بنایا گیا۔ جس میں مولوی صاحب کے نامزد لوگوں میں یہ حقیر فقیر بھی شامل تھا۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء کی گرم دوپہر کو جب میں انجمن کی چوتھی منزل کے اس صحن میں داخل ہوا جہاں اس سے پہلے گرمی کے ڈر سے میں صرف شاموں کو جاتا تھا۔ تو ان کے کمرے کا دروازہ بند نظر آیا وہ برسوں میں دن کو شاید پہلی بار سوئے تھے۔ چھت میں لگا ہوا پنکھا چل رہا تھا۔ اور عقبی کمرے سے ٹیلیفون کے تار نظر آرہے تھے۔ کچھ دن مولوی صاحب بہت خوش رہے

مگر امراء اور "دستوری نمائندوں" کی جگہ افسروں نے لے لی اور اس کے بعد انجمن میں جو کچھ گزرا اس کی داستان پھر کبھی بیان کروں گا۔ میں نہ کر سکا تو تاریخ"

خود کبھی نہ کبھی بولے گی۔ تاریخ بہت نڈر اور سچی گواہی دیتی ہے   ہاں یہ ضرور ہے کہ پنکھا چلتا رہا اور پانی آتا رہا۔ اور ٹیلیفون کھڑکتا رہا۔ پھر مولوی صاحب بیمار ہوئے۔ اور پھر صدر ایوب کو خبر پہنچی تو وہ انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ مولوی صاحب کو دو قسم کے ناقابل علاج سرطان تھے۔ اردو کا سرطان جو کانگریس جیسے عظیم ادارے سے درست نہ ہوا۔ اور جگر کا سرطان جو برگیڈیر سرور جیسے عظیم طبیب دور نہ کر سکے مولوی صاحب کی پوری زندگی ایک بیماری تھی۔ جسے عرف عام میں نصب العین کہتے ہیں۔ نصب العین کا ریکٹ بہت پرانا ہے۔ اور سقراط سے لے کر آج تک بہت سے معقول لوگ اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ نصب العینی آدمی کی مٹی بھی بہت خراب ہوتی ہے، پہلے تو اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی مخالفت کی جاتی ہے پھر اس پر الزام لگائے جاتے ہیں پھر اسکو تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور پھر اس کی پرستش کی جاتی ہے اور پھر سب اس کے ”مشن“ کو لے کر دیوانوں کی طرح دوڑنے لگتے ہیں۔

جتنے لوگوں نے مولوی عبدالحق کے جنازے میں شرکت کی اگر ان سے آدھے بھی انھیں ان کی زندگی میں پانچ پانچ روپے دیدیتے تو وہ اُردو یونیورسٹی قائم کر کے مرتے۔ اردو یونیورسٹی جسے پڑھے کالر والے جہالت کی نشانی سمجھتے ہیں۔ اردو یونیورسٹی جس کی پہلی منزل اردو کالج ہے۔ اور اگلی منزل پر یونیورسٹی میں اردو کے ذریعہ تعلیم

اور کیا لکھوں - میرا قصہ یہ ہے کہ میں نے بڑے آدمی بہت کم دیکھے ہیں۔ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کی دسترس سے یوں بھی دور ہوتے ہیں اور ہمارے زمانے میں کسی کو کوئی بڑا بننے ہی کب دیتا ہے۔ میرے لئے تو ایک مولوی صاحب ہی غنیمت تھے کہ ان کی خدمت سے اپنی انا مطمئن ہو جاتی تھی۔ میں اردو کا محقق اور عالم فاضل بھی نہیں ہوں۔ جو ”اردو مولوی صاحب سے پہلے اور مولوی صاحب کے بعد“ یا ”اردو پر مولوی صاحب کے احسانات“ قسم کا مضمون لکھوں۔ میرے پاس ان کے خطوط اور تصاویر اور نشانیاں بھی نہیں ہیں۔ مگر شاید وہ سب کے لئے اپنی سب سے بڑی نشانی چھوڑ گئے ہیں۔ جس کا نام ہے انجمن ترقی اردو۔ یہ انجمن پاکستان میں بھی ہے۔ اور ہندوستان میں بھی ہے۔ اور برما بھی ہے۔ اور عدن میں بھی اور ان تمام شہروں اور ملکوں میں بھی۔ جہاں لوگ اردو زبان بولتے ہیں۔ انجمن کا نام بہت سے مقامات تک نہ پہنچے۔ مگر کام سب جگہ پہنچ چکا ہے۔

کام کی مصیبت یہ ہے کہ اگر کوئی اچھا کارکن ہو تو اس کی شخصیت کے کئی درخشاں پہلو ماند پڑ جاتے ہیں۔ مولوی صاحب اردو کے کارکن ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے ادیب بھی تھے مگر کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کی نئی نسلیں ان سے واقف نہ ہو سکیں۔ کیونکہ وہ انھیں ایک کارکن کی حیثیت سے اتنا جانتی ہیں کہ ان کے ادب کی طرف نظر نہیں جاتی۔ پرانی (باقی صفحہ پر)

ابن انشاء

مولوی صاحب کے آخری ایام

میرا ایک بھتیجا ہے۔ محمود بابر۔ جب وہ کوئی ڈھائی تین سال کا تھا۔ مولوی صاحب اکثر میرے ہاں جہانگیر روڈ پر تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ لڑکا ان سے مانوس بلکہ ایسا بے تکلف تھا کہ ان کی چھڑی چھین کے بھاگ جاتا تھا۔ ایک روز کہنے لگا۔ "بھائی جان معلوم ہے میرا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کیا ہے؟"

بولا۔ "اردو" — تھوڑے توقف کے بعد کہنے لگے۔ "بھائی جان یہ بات آپ مولوی صاحب کو بھی بتا دیجئے۔ وہ ہیں نا جو یہاں آیا کرتے ہیں؟"

ہمارے گھر میں مولوی صاحب کو مولوی صاحب ہی کہا جاتا ہے۔ بابائے اردو یا کچھ اور نہیں۔ پھر اس ڈھائی تین سال کے بچے نے یہ کیسے سمجھا کہ اردو کوئی چیز ہے جس سے مولوی صاحب کو کوئی خاص دلچسپی ہے۔ خود مولوی صاحب اس بات پر بہت حیران ہوئے۔ اور اسے بیٹیا اردو کہہ کے بلانے۔

۱۶ اگست کی صبح کو اسی بچے نے ۹ بجے کے قریب مجھ سے پوچھا۔

"بھائی جان۔ مولوی صاحب آجکل کیوں نہیں آتے۔ پہلے تو آیا کرتے تھے۔ انھیں بلایئے نا؟"

میں نے کہا۔ بیٹے وہ بیمار ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔ تو پھر آئیں گے۔ وہ تو مطمئن ہو کر اسکول چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا۔ یہی وقت تھا کہ مولوی صاحب نے اپنی زندگی کا آخری سانس لیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رفتگاں میں چلے گئے۔

دفتر پہونچتے ہی میں نے دریافت حال کے لئے انجمن ترقی اردو اور اردو کالج میں فون کیا۔ دونوں جگہ فون مصروف تھے۔ ایک تیسری جگہ فون کیا۔ وہاں سے پیغام ملا کہ مولوی صاحبؒ نے صبح انتقال کیا۔ تم نیول اسپتال پہونچ جاؤ۔ ابھی وہاں سے جنازہ چلا نہیں۔

یہ بات نہیں کہ ہم اس حادثے کے لئے تیار نہ تھے۔ مولوی صاحب کی بیماری کے دوران انھیں دیکھنے میں ایک بار مری اور ایک بار راولپنڈی ہو آیا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے میں مرض لاعلاج تھا۔ اور نو اگست کو میں راولپنڈی ہی میں تھا۔ بریگیڈیر سرور صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ بھی آخرکار اس نتیجے پر پہونچے تھے۔ کہ یہ سرطان ہی ہے۔ اور اب فقط دنوں کا معاملہ ہے۔ دوائیں بند کر دی گئی تھیں۔ بس تھوڑی سی خوراک اور وٹامن دیتے تھے۔ بریگیڈیر صاحب نے کہا۔ یہ حال آپ کے سامنے ہے۔ اب جو مولوی صاحب کی خواہش ہو اور جو آپ لوگ سوچیں۔ کرنل عطاالرحیم۔ نبی صاحب حکیم اسرار احمد۔ جمیل الدین عالی اور میں سب کی

رائے یہی تھی کہ کراچی جانا ہی بہتر ہے۔ یہ حادثہ بہرحال گزرنا ہے۔ کراچی میں یہ ہے کہ ان کے عزیز، عقیدتمند زندگی بھر کے دوست آخری وقت میں انہیں دیکھ لیں۔ انجن سے جسمانی قرب بھی ہوگا۔ بڑی مشکل سے گاڑی میں ۱۰ اگست کو تیزگام کی سیٹیں ملیں ۱۱ کو صبح مولوی صاحب کراچی پہونچ گئے۔ یہاں کے ڈاکٹر بھی متفق الرائے تھے کہ زندگی کی امید عبث ہے۔ وہ تو ان کی قوت مزاحمت ہے۔ بقول کسے موت سے سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے سہارے جب تک چل سکیں۔ ان کی عمر اور ضعف کو دیکھتے ہوئے بھی یہ انجام سامنے نظر آرہا تھا تاہم جب میں جنرل اسپتال پہونچا اور آفیسرز وارڈ نمبرا کے کمرہ میں نمبرہ میں قدم رکھا میں پہ دونوں (زیسٹرز) کا بورڈ اب تک لٹکا ہوا تھا۔ اور حکیم صاحب نے چادر اٹھاکر ان کا چہرہ دکھایا تو ضبط نہ ہوسکا۔ ہمارا حال ان کے عزیزوں کا سا تھا۔ کہ ڈاکٹر کچھ ہی کہے۔ امید کا رشتہ نہیں ٹوٹنے پاتا۔ ۱۵ کی شام کو بھی میں ۹ بجے تک اسپتال ہی میں تھا۔ آکسیجن کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ لیکن اس کی زیپ کھول کے ہم تھوڑے تھوڑے وقفے سے اندر کا ٹمپریچر معلوم کرتے تھے، نبض دیکھتے تھے۔ نبض کی رفتار اس وقت ۹۰ تھی۔ پاؤں دیکھے۔ وہ بھی نارمل تھے کچھ ایسے ٹھنڈے نہ تھے۔ ایک آنکھ بند، ایک نیم بند تھی یعنی وہی کیفیت جو کچھ روز سے چلی آرہی تھی۔ ہاں پلکوں کی جنبش سے پتہ چلتا تھا۔ کہ دیکھتے اور پہنچانتے ہیں۔ ہم نے دیکھنے کی کوشش کی کہ دیکھیں کس حد تک ہوش ہے میں نے غلاف کے دہانے سے پکارا " مولوی صاحب"

انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پوچھا " مزاج کیسا ہے -" بولے " اچھا ہے " اب حکیم صاحب نے کہا۔ مولوی صاحب نجمی آگئے ہیں نجمی نے بھی کہا مولوی صاحب میں آیا ہوں۔ وہ ہم تینوں کو دیکھ رہے تھے۔ پہنچان رہے تھے۔ کچھ کہنے کی کوشش کی، نہ میری سمجھ میں کچھ آیا۔ نہ نجمی کی۔ حکیم صاحب اور مولوی صاحب کا ملازم خاص اعظم خاں ان کے الفاظ ہم سے زیادہ سمجھ لیتے تھے۔ وہ باتیں ان کی سمجھ میں بھی نہ آئیں آخر ساری طاقت مجتمع کر کے انھوں نے ایک لفظ باستگی بولا۔ " انجمن " ہم نے تصدیق کے لئے دہرایا۔ مولوی صاحب انجمن؟ اشارے سے کہا۔ ہاں۔ نجمی نے کہا وہ ٹھیک ہو رہی ہے میں نے مزید اطمینان دلانے کے لئے کہا۔ مولوی صاحب جو کچھ آپ نے کہا تھا۔ اسی کے مطابق ہوگیا۔ آج آرڈر نکل گیا ہے۔ یہ سن کے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر کچھ نہ بولے۔ میں نے ان کے بھتیجے مسعود سے کہا۔ ان کے منہ میں کوئی گرم چیز ڈالئے۔ سوپ ٹھنڈا کر کے ایک گھونٹ ان کے منہ میں ڈالا انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ بلغم سے ان کا گلا رکا ہوا ہے۔ دوسرا گھونٹ باہر بہہ گیا۔ اب کوشش فضول تھی۔ نفس کی آمد و شد بارہ گھنٹے اور رہی۔ لیکن ہماری دنیا سے راہ و رسم کے یہ آخری لمحات تھے۔

اس سے ایک روز پہلے یعنی ۱۴ اگست کی شام کو تیماردار خوش خوش تھے۔ حکیم صاحب نے کہا۔ دیکھئے خدا کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے مسعود نے کہا۔ خدا کرے۔ یہ معجزہ ہی ہو جائے۔ آکسیجن کی نلکی ان کی ناک میں لگی تھی۔ غالباً بلغم گھلانے کے لئے۔

میں نے آواز دی تو کچھ بولے۔ کوئی بات کرنے کی بھی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ مولوی صاحب اب آپ روز بروز اچھے ہو رہے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ آپ سے ملنے اور آپ کو دیکھنے بہت لوگ آ رہے ہیں۔ لیکن یہاں آنے کی ممانعت ہے تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔ ہوش اور کو بیماری اپنی جگہ تھی۔ لیکن حواس مجتمع کرنے میں انھیں ایسی دقت نہ ہوتی تھی۔ اسی دن میرے پاس یوسف ظفر کی کتاب صدا البحرا آئی تھی۔ جو بابائے اردو کے نام معنون ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ یوسف ظفر صاحب ہیں نا؟ وہ نئے ادب کے سبھی لوگوں کو جانتے ہیں۔ ہامی بھری۔ میں نے ان کی کتاب کی ڈیڈیکیشن کا بیان کیا۔ تشکر کے طور پر ہاتھ کو تھوڑی سی جنبش دی سر ذرا سا جھکایا۔ اس زمانے میں ہم انھیں ہر طرح کی دل خوش کن باتوں سے بہلاتے تھے۔ حکیم صاحب سے وہ ہر روز تازہ خبریں پوچھتے۔ ۱۵ کو انھیں بتایا کہ کویت سے انگریزی فوجیں نکل رہی ہیں۔ تو خوش ہوئے۔ اور پریذیڈنٹ کے دورۂ امریکہ کی خبریں جن دنوں آ رہی تھیں۔ میں ان کے پاس مری ہی میں تھا۔ ان کے استعجاب اور خوشی کا عجب عالم تھا۔

بیماری کے دنوں میں کراچی۔ مری۔ پنڈی اور پھر کراچی میں حکیم اسرار احمد ہر وقت ان کے ساتھ تھے۔ میں تو صرف اپنی دیکھی باتیں بیان کرتا ہوں۔ تین چار ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک روز شام کو انجمن میں مولوی صاحب سے ملنے پہنچا تو پتہ چلا کہ کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ کہنے لگے۔ کھاؤ۔ میں نے دیکھا کہ خود ایک پلیٹ میں دہی لئے بیٹھے ہیں۔ یا ایسی ہی کوئی چیز تھی۔ میں نے کہا آپ بھی تو کھائیے۔ کہنے لگے۔ نہیں میں پرہیزی کھانا کھاتا ہوں۔ پیچش ہے۔ طرح طرح کے علاج کئے جاتے نہیں ستمبر میں کراچی سے باہر ہی تھا کہ معلوم ہوا مولوی صاحب کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ کراچی آ کر جناح اسپتال کے اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر ۱۳ میں بھی تیسرے چوتھے جاتا رہا۔ وہ خود بھی بلوا بھیجتے۔ نمبر ۱۳ کے عدد پہ ہنسا کرتے تھے کہ یورپ والے اسے منحوس کہتے ہیں۔ ہمارے لئے تو مبارک ہے۔ مجھے ایک کام سے مری جانا تھا حکیم صاحب مولوی صاحب کا پیغام لیکر آئے کہ وہاں شہاب صاحب سے کہدیں۔ مرا انتظام مری کے فوجی اسپتال میں کر دیا جائے اس سے پہلے سوئٹزرلینڈ جانے کی بھی تجویز تھی۔ جس کا متعصد الگ ہے۔ بہرحال اب مری ہی کی ٹھہری تھی۔ شہاب صاحب نے یہ تجویز پریذیڈنٹ کے سامنے رکھی۔ انھوں نے اسپتال میں رہنے والے رفیقوں تک کا خرچ پریذیڈنٹ کی ذاتی جیب سے دیا ہے۔ بریگیڈیئر سرور بیان کرتے ہیں کہ ایکبار میں نے غلطی سے کہہ دیا۔ کہ فلاں بل پریذیڈنٹ ہاؤس کے ڈسکریشنری فنڈ سے دیدیں۔ تو بہت خفا ہوئے۔ کہنے لگے؟ روٹ ڈو یو مین؟ وہ میرے ذاتی مہمان ہیں۔

مولوی صاحب بھی فیلڈ مارشل سے بہت محبت کرتے تھے۔ انھیں صرف ایوب خاں کہا کرتے تھے۔ ان کی اس مہربانی کا ان کے دل پر بہت اثر تھا۔ جس کا انھوں نے مری اور راولپنڈی میں مجھ سے اظہار بھی کیا۔ مولوی صاحب نے مارشل لاء کے اقدامات اور بنیادی جمہوریت کا خیر مقدم کچھ حکومت کی خوشنودی

کے خیال سے نکیا تھا۔ وہ از خود اس نتیجے پر پہنچے تھے ۔ اور بدلائل اس موضوع پر تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا نظام العمل کیا ہونا چاہیئے۔ کراچی کے لڑکوں کے بارے میں ان کی رائے حکومت کے اقدامات کے حق میں نہ تھی۔ اور اس کے اظہار میں انھیں کبھی باک نہیں ہوا لڑکوں کی حمایت میں انھوں نے بیان دیئے جیل میں کھانا تک پہنچاتے رہے۔ اس سے ایک صاحب کو جو ان کے مخالف تھے۔ یہ خیال ہوا کہ اس بنا پر وہ صدر مملکت کی نظر سے گر گئے ہوں گے۔ چنانچہ پتہ چلا کہ ان بزرگ نے چیلنج بھی کیا کہ اب اگر مولوی صاحب پریذیڈنٹ سے مل کر دکھا دیں تو میں پانچ ہزار روپے دوں گا۔ یہ بات مولوی صاحب تک بھی پہنچی۔ اور خوب لطف رہا کراچی سے جو وہ علاج کے لئے جاتے ہوئے لاہور سے گزرے تو اتفاق سے میں لاہور میں تھا۔ تیز گام پر ان سے ملنے گیا۔ زیادہ آدمی نہ تھے۔ حمید احمد خاں محمود احمد خاں، حامد علی خاں۔ تینوں بھائی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ حکیم رشید احمد، میں اور میرا بھائی سردار محمود۔ بس۔ سب سے باتیں ہوئیں۔ حیدر آباد تک کے قصے درمیان میں آئے۔ یکایک مجھ کو اپنے پاس بلا کر بٹھالیا۔ اور کہا۔ دیکھو۔ ان سے پانچ ہزار روپے آن سے لے لینا۔

میں نے حیران ہو کر کہا۔ کس سے؟

بولے وہ صاحب ہیں نا۔ جنھوں نے شرط بدی تھی۔ کہ پریذیڈنٹ سے ملاقات ہو جائے تو پانچ ہزار دوں گا۔ بلکہ دس ہزار لینا۔ کیونکہ اب تو خود پریذیڈنٹ نے اپنے مہمان کے طور پر مجھے بلایا ہے۔

اب یہ ساری باتیں یاد آتی ہیں۔ پریذیڈنٹ صاحب نے جو مولوی صاحب کو شرف میزبانی بخشا تو اتوار کا دن تھا۔ میں تو مری میں اپنے ہوٹل میں تھا۔ شہاب صاحب کا فون آیا کہ فوراً پہنچو۔ تین چار میل کا پیدل پہاڑی راستہ ہے۔ ایک دوست کے ہمراہ بخرابی بسیار ہانپتے کانپتے وہاں پہنچے تو شہاب صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ جس وقت مری میں علاج کی سہولتوں کی درخواست کی گئی ہے۔ ہم سب کے ذہن میں یہ تھا کہ علاج کا خرچ مولوی صاحب خود اٹھائیں گے۔ یا پھر انجمن موجود ہے۔ یہ خیال نہ تھا کہ سہولتوں کے علاوہ پریذیڈنٹ صاحب خرچ بھی دیں گے۔ میری آنکھوں میں رقت سے آنسو جاری ہو گئے۔ پریذیڈنٹ ہاؤس سے شہر واپس ہم اترتے ہوئے آئے۔ تعطار ستے کی کوفت کا احساس نہ ہوا۔ اور راستے میں ڈاک خانے سے ایک تار مبارک باد کا میں نے اپنی طرف سے بھی بھیجا۔

مری میں حکیم اسرار احمد صاحب سے یہ طے تھا کہ روز خط لکھیں گے۔ اور ہمیں ان کی حالت کی اطلاع دیں گے ان کا خط تو آتا ہی تھا۔ کرنل عطا الرحیم صاحب پرنسپل اردو کالج ہر روز ٹرنک کال بھی کرتے تھے۔ کبھی حکیم صاحب کو۔ کبھی اسپتال کے کمانڈر کرنل منان کو۔ چند دن بعد بہت تشویشناک خط آنے لگے۔ اور پھر حکیم صاحب کا تار آیا کہ مولوی صاحب کو اسیریس لسٹ پر رکھا گیا۔ اور یہ چوبیس گھنٹے ان کے لئے فیصلہ کن ہیں۔ خیر وہ وقت گزر گیا۔ لیکن حالت بہر صورت

خواب تھی اور حکیم صاحب ان کی طرف سے مایوس
ہو گئے۔ میرا چند برس سے ان سے بالکل عزیزوں کا سا
تعلق تھا۔ چنانچہ میں نے عزم سفر کیا۔ اتفاق سے وہاں
قیام کا انتظام بھی کرنل متان کی عنایت سے اسپتال
ہی میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دن رات مولوی صاحب
سے باتیں رہیں۔ میری آمد کا سن کر خوش ہوئے۔ لیکن
اس وقت گلوکوز کی بوتلیں داہنے بازو میں شگاف
دے کر چڑھائی جا رہی تھیں۔ یہ کوئی آٹھ گھنٹے کا صبر آزما
تکلیف دہ عمل تھا۔ شام ڈھلے اس کی بدولت ان کے
جسم میں قوت آنی شروع ہوئی۔ پھر ہم نے انھیں
سیدھا سہارا دے کر نیم سیدھا بٹھایا۔ انجمن کی باتیں ہوتی
رہیں۔ آئندہ کن کن لوگوں سے کام لینا چاہیے۔ بہت
سے نام تجویز ہوئے۔ بہت سے رد ہوئے۔ وہ فقط اردو
کی خدمت کی اساس پر آدمی لینے کے حق میں تھے۔ لاہور
سے انھوں نے ایسے نام بھی تجویز کیے جن سے ان کے چنداں تعلقات نہ تھے
لیکن اردو کی خدمت کا واسطہ درمیان تھا۔ ان کی خوش طبعی نے تو
۱۷ اگست تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مشفق خواجہ بھی۔ اور
حکیم اسرار احمد سے جو باتیں ان کی ہوتی رہیں۔ وہ بیان
کریں گے۔ مری میں انھوں نے مجھے بے وقوفوں کی
ایک فہرست بنائی۔ یہ فہرست تو مدت سے بنی رکھی تھی۔
لیکن ایک صاحب کو ترقی دے کر انھوں نے تیسرے نمبر
سے پہلے پر کر دیا تھا۔ یہ سبھی صاحبان اہل علم و فضل
ہیں۔ اس لئے ان کے نام نہ لوں گا۔ ہاں میری سفارش پر
انھوں نے، اپنے خادم اعظم خاں کا نام بھی شامل فہرست
کر لیا تھا۔ جسے مری میں چھڑی لے کر چلنے کی اس قدر عادت
ہو گئی تھی۔ کہ کمرے سے برآمدے میں آتے ہوئے بھی
چھڑی کا سہارا لیتا ہے۔ اعظم خاں ایک بہت خدمتگار
نوجوان ہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھتا بھی ہے۔
اور اب کے میٹرک کا امتحان دے گا۔ اس طویل بیماری
میں دن رات جاگ کر اس نے جو خدمت کی ہے۔ کسی
اور کے بس کی بات نہ تھی۔ انتقال سے دو روز قبل
مولوی صاحب نے اس سے پوچھا۔ تم کیا تنخواہ لیتے ہو۔

اعظم خاں نے کہا۔ چالیس روپے

بولے۔ آج سے ساٹھ بیٹے

مری میں وہ پچھلے مہینے ہی سے تو تھے۔ اور
بیماری اور ضعف کا حال بھی کچھ ہی تھا۔ لیکن ان
کے ہوش و حواس، حافظہ اور قوت متخیلہ نے کبھی
ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مری میں تو میں نے ان سے بھی الف لیلے
کے قدیم اردو تراجم کے سلسلے میں کچھ سوال بھی پوچھے
ان میں سب سے بڑی بات ان کے جینے کا عزم تھا۔ وہ اکثر
کہا کرتے تھے۔ کہ بیماری ایک معصیت، جو لوگ
بیمار ہوتے ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو چوک
میں درے لگائے جائیں۔ حاصل کلام یہ کہ صحت کا
خیال رکھو۔ وہ حفظان صحت اور غذا کے اصولوں کے
سختی سے پابند تھے۔ تین چار سال ہوئے انھوں نے
جناح اسپتال میں اپنا چیک اپ کرایا تھا۔ ان کے تمام
قویٰ تندرست اور چاق و چوبند تھے اور دل کے متعلق
کرنل رحمٰن مرحوم نے کہا تھا۔ کہ تیس چونتیس برس
کے جوانوں کا سا ہے۔ اگر کبھی ان کو تکلیف ہو بھی تو
اس کا برملا اظہار نہ کرتے۔ چوتھی منزل کی سیڑھیوں سے

ہم نے تو لوگ انھیں سہارا دینے کی کوشش کرتے یہ بات انھیں سخت ناپسند تھی۔ وہ ہم سے کہتے تم لوگ تھک گئے آگے چلو۔ میں آتا ہوں۔ مقصد یہ کہ ان کا ضعف جو بابیں ہمہ احتیاط عمر کا تقاضا ہے۔ چھپا رہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ ان سے کیجئے۔ جو لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے زبردستی کے بیمار بن جاتے ہیں۔

سرطان کا انھیں دم آخر تک نہیں بتایا گیا۔ لیکن مری بھی بیماری کی یہ حالت تھی کہ ہمارا خیال تھا۔ وہ اس کا انجام جان جائیں گے۔ یا اس انجام کے امکان پر ضرور غور کریں گے۔ لیکن نہیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی انھوں نے اپنی موت کا نہ سوچا۔ اور ہمیشہ مستقبل کی باتیں کیں۔ مثلاً یہ کہتے تھے۔ اب کے کراچی چل کر مجھے لیکچر دینا ہے۔ اسرائیل میں ایک یتیم لڑکا تھا جس نے دو ہزار برس کی مدفون زبان عبرانی کو زندہ کیا۔ اور سرکاری زبان بنایا۔ پھر ایک زمانے سے وہ گاندھی جی پر لکھنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اس کے متعلق ہندوستان سے شائع شدہ وہ موٹی موٹی کتابیں بھی وہ پڑھ چکے۔ مجھ سے لوئی فشر کی کتاب بھی منگوائی۔ مری میں کہنے لگے۔ دیکھو وہ گاندھی والا مضمون بھی پڑا ہے۔ اچھا اب کے کراچی چل کے اسے پورا کرتا ہوں۔ انجمن کے بارے میں بھی وہ کراچی ایڈمنسٹریشن کی تاخیری کارروائیوں سے نالاں تھے۔ کہ انتظامی بورڈ نے آئندہ دستور کا مسودہ منظور کر لیا۔ لیکن افسروں نے اسے کسی سرد خانے میں رکھ دیا اے کاش! نیا بورڈ مولوی صاحب کی زندگی میں بنتا۔

ان کے ایفائے عہد تک نہ جئے
زیست نے ہم سے بے وفائی کی!

جناح اسپتال کا کمرہ نمبر ۱۲، مری کا کمرہ نمبر ۷ راولپنڈی کا کمرہ نمبر ۱۱، اور کراچی سول اسپتال کا نمبر ۸ سب میں نے دیکھے ہیں اور سب میں مولوی صاحب سے باتیں کیں ہیں۔ ۱۶ اگست کی صبح ان کی بند آنکھیں بھی دیکھیں۔ لیکن مجھے تو یوں نہیں لگا کہ لوگوں نے بس باندھ بوند کے رکھ دیا ہے۔ اب بھی میں مولوی صاحب کہہ کے آواز دوں گا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں "ہاں" کہیں گے ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب نے (لو وزیٹر) کا بورڈ اپنے کمرے پر خود لگوایا تھا۔ وہ ملک موت کو آنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ اسپتال میں انھوں نے ایک فہرست دی تھی کہ پابندیوں کے باوجود فلاں فلاں آدمیوں کو ضرور آنے دیا جائے۔ میرا دل بہلتا ہے۔ میں نے وہ فہرست دیکھی ہے۔ اس میں واقعی ملک الموت کا نام نہیں۔ پھر وہ کدھر سے آیا؟ کون سا بھیس بنا کے آیا۔

بقیہ بوڑھا سپاہی سلسلہ ص۴۳

نسل کی نظر بھی کب ادھر جاتی ہے۔

(میں انکی پہلی برسی پر ایک مبسوط مضمون لکھوں گا۔ حالانکہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟)

آج اردو کے سپاہی تو چناپلی سے لے کر کراچی تک یہ سوچ رہے ہیں کہ اب اردو کی جنگ بغیر سپہ سالار کے لڑنی پڑے گی۔ یہ جنگ بہت طویل اور تھکا دینے والی ہے۔ کیا اردو کے سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے! (روزنامہ "جنگ" کراچی)

جگن ناتھ آزاد

عظیم انسان

میں ۱۹۴۳ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد ایم۔اے میں داخل ہونے کے لئے لاہور آیا۔ تو یہاں کی فضا نے کالج کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے آوارہ گردی کے راستے پر ڈال دیا۔

چنانچہ کچھ مدت لاہور میں بے مقصد رہنے کے بعد میں پھر واپس راولپنڈی جا پہنچا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ابتدا اُسی زمانے سے ہوئی تھی۔ پہلے یہ سلسلہ ایک پرائیوٹ کارپوریشن کے طور پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ہال میں شروع ہوا تھا، اس کے بعد سرکاری ادارہ بن گیا۔ سیّد احمد شاہ بخاری اس کے کنٹرولر تھے جو بعد میں ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ میں نے ملازمت کے لیے اُن کے نام اپنی درخواست بھیج دی۔ بخاری صاحب نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا۔ والد نے مجھے مولوی عبدالحق کے نام ایک خط دیا۔ کیونکہ اس وقت دہلی میرے لئے ایک نیا شہر تھا اور دہلی آنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔

اس زمانے میں انجمن ترقی اردو (ہند) اپنے پورے شباب پر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی (دریا گنج) میں اس کا دفتر تھا۔ اسی میں مولوی صاحب کا قیام تھا۔ علامہ برج موہن کیفی مرحوم بھی وہیں فروکش تھے میں خط لے کر حاضر ہوا تو بڑی محبت سے ملے اور فرمانے لگے:۔

"تمہارا قیام یہیں میرے یہاں ہوگا"

چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے جا کر کہنے لگے:۔

"یہ بڑا تاریخی کمرہ ہے۔ اس میں کانگرس کمیٹی کے دنوں میں پنڈت جواہر لال نہرو ٹھہرے تھے تم اس میں جب تک چاہو قیام کرو"

پھر اس کوٹھی کے دوسرے کمروں کا ذکر کر کے بتلانے لگے کہ:۔

"فلاں کمرے میں محمد علی مرحوم، فلاں میں موتی لال نہرو اور فلاں میں مہاتما گاندھی فروکش رہے"

مجھے اس سے پہلے اتنی تاریخی حیثیت کے مکان میں

قیام کرنے کا کہاں موقعہ ملتا تھا۔ دیر تک ایک حیرت آمیز مسرت کی کیفیت رہی۔ سب سے زیادہ مسرت کا سبب تو مولوی صاحب کی وہ شفقت تھی جس کا مجھے پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

باتوں کے دوران میں آپ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا انٹرویو کب ہے؟ "میرے یہ بتانے پر کہ جناب انٹرویو کی تاریخ تو گزر چکی ہے بہت ہنسے اور بولے کہ "پھر تم آئے ہی کیوں ہو" میں نے کہا کہ بخاری صاحب سے جا کر کہہ دوں گا۔ دفتر کی چٹھی راولپنڈی میں ملی۔ میں لاہور میں تھا۔ دوبارہ راولپنڈی جانا پڑا اور اب وہاں سے دہلی آ رہا ہوں تو کہنے لگے "۔ تم ابھی کالج کے ماحول سے باہر آئے ہو۔ تمہیں دنیا کا تجربہ نہیں۔ ان باتوں کو کوئی نہیں سنتا۔ تمہیں تو دفتر کے لوگ بخاری صاحب تک پہنچنے ہی نہ دیں گے وہ کہہ کر کہ انٹرویو کی تاریخ گزر چکی ہے تمہیں واپس روانہ کر دیں گے۔ لیکن چلو، اس بہانے دہلی کی سیر تو ہو جائے گی۔ انجمن کا کتب خانہ بھی اطمینان سے دیکھتے رہو۔ اس کمرے میں تاریخی کتابیں ہیں۔ اس میں تنقیدی کتابیں۔ فلاں کمرے میں نادر کتابوں کا ذخیرہ ہے اور فلاں میں قلمی مسودے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

رات کو کھانا کھانے پانچ سات حضرات موجود تھے۔ علامہ کیفی۔ اور رحم علی الہاشمی صاحب کے علاوہ اور جو حضرات تھے ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ میں کھانے کی میز پر اور ویسے بھی اس ماحول میں دبکا دبکا سا رہتا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی میری عمر تھی ان علمی شخصیتوں سے بات کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا اس وقت تک اگرچہ "ادبی دنیا" لاہور، اور "زمانہ" کانپور میں میری دو چار غزلیں چھپ چکی تھیں۔ لیکن ان دو چار غزلوں کے سہارے مولوی عبدالحق اور علامہ کیفی مرحوم جیسے علماء کے سامنے لب کشائی کی جرأت تھوڑا ہی ہو سکتی تھی اور اس وقت کا کیا سوال، آج بھی میرے لئے یہ کہاں ممکن ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کے روبرو دو جملے سے بات کر سکوں۔

تو خیر دوسرے دن میں انٹرویو کے لئے براڈ کاسٹنگ ہاؤس جا پہنچا۔ اس زمانے میں ریڈیو کے تمام دفاتر ایک ہی جگہ نہ تھے بلکہ شہر کے مختلف حصّوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کنٹرولر آف براڈکاسٹنگ کا دفتر سکندرا روڈ پر تھا اور دہلی ریڈیو اسٹیشن انڈر ہل روڈ پر۔ مجھے چونکہ کنٹرولر کے دفتر سے بلاوا تھا اس لئے سکندرا روڈ پہنچا۔ مولوی صاحب کی بات حرف بہ حرف صحیح نکلی۔

جس کمرے میں میں گیا، یہی جواب ملا کہ بخاری صاحب سے ملاقات ممکن نہیں ہو سکتی، انٹرویو کب کا ہو چکا۔ بورڈ کے اراکین اپنے اپنے شہر کو واپس جا چکے اب انٹرویو کا کیا سوال۔ ن۔م راشد اور کرشن چندر انڈر ہل روڈ والی بلڈنگ میں تھے۔ ورنہ ان سے کچھ مدد حاصل کرتا۔ آخر بخاری صاحب کے سکریٹری سے میں نے کہا کہ میرا کارڈ اندر بھیج دیں۔ بخاری صاحب نہ ملنا چاہیں

تو نہ ملیں گے۔ کارڈ اندر بھیجنے میں آپ کو کیا اعتراض ہے۔ میں نے کارڈ پر اپنے نام کے ساتھ والد کا نام بھی لکھ دیا تھا اور یقین تھا کہ انٹرویو ہو یا نہ ہو ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔ کارڈ اندر گیا تو دو چار منٹ ہی میں بخاری صاحب نے بلایا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو اخلاق اور تہذیب کے ایک دل نشین پیکر کو اپنے سامنے دیکھا۔ گرمی کا موسم تھا اردو ادب کا یہ عدیم المثال مزاح نگار، "مضامین پطرس" کا مصنف مجھ سے اس وقت متانت اور سنجیدگی کی ایک تصویر نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے بات تو یہی کہی کہ انٹرویو کی تاریخ گزر چکی ہے۔ لیکن ایک لمحے کے لئے بھی مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں نے براڈکاسٹنگ ہاؤس کی حدود میں داخل ہو کر کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ غالباً دل نوازی کا سلیقہ ان کے لہو میں کارفرما تھا۔

خیر واپس آ کر مولوی صاحب کو ساری داستان کہہ سنائی بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے۔ "مجھے اس بات کا یقین تھا کہ تاریخ مقررہ کے بعد انٹرویو ممکن نہیں لیکن میں نے تمہیں اس لئے نہیں روکا کہ اس قسم کا تجربہ زندگی میں ضروری ہے"

اس کے بعد کوئی دو چار روز دہلی میں رہا اور روزانہ میں نے یہ دیکھا کہ ہر مکتب فکر کے لوگ مولوی صاحب سے ملنے آتے تھے۔ ان میں سیاسی جماعتوں کے لوگ بھی ہوتے تھے۔ مولوی صاحب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی موضوع پر بات کرتے تھے اور وہ تھا۔ ہندوستان میں اردو کی ترقی کا مسئلہ۔ میں نے انہیں کبھی کسی سیاسی جماعت کی حمایت یا مخالفت کرتے نہیں دیکھا۔ ان سے ملنے والوں میں کانگریسی، مسلم لیگی، کمیونسٹ اور رہبانیت برانداز قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ لیکن مولوی صاحب کبھی سیاسی بحث میں نہیں الجھتے تھے۔ ویسے بھی انہیں کسی سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ حتی الامکان سیاست سے دور ہی رہتے تھے۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے مرحوم جناح صاحب دہلی آ رہے تھے۔ انجمن کے بعض لوگ کسی اور مہمان کو پہنچانے اسٹیشن جانا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ "تم لوگ اسٹیشن نہ جاؤ تو اچھا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ گمان گزرے گا کہ انجمن ترقی اردو کے ارکین جناح صاحب کا استقبال کرنے آئے تھے"

اس قیام دہلی کے بعد مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع لاہور میں ملا۔ یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ مولوی عبدالقادر قصوری کے دولت کدہ پر ان کا قیام تھا، میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے یہاں حاضر ہوا۔ آپ انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ قائم کرنے کے لئے آئے تھے میں پہنچا تو بہت مصروف تھے۔ اندر بلا لیا لیکن زیادہ وقت نہ دے سکے، فرمانے لگے ۔۔

"شام کو میاں بشیر کی کوٹھی پر آ جانا
وہاں ایک بہت اہم جلسہ منعقد ہوگا"

اسی جلسے میں انجمن کی صوبائی شاخ کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا تھا۔

تین برس بعد پھر آپ لاہور تشریف لائے تھے۔

ان کا قیام صرف ایک ہی دن رہا۔ مجھے ان کی آمد کا علم نہ تھا۔ شام کو استادِ محترم مولانا تاجور نجیب آبادی کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہم لاہور کے شعرا اس میں شریک تھے۔ تھوڑی دیر میں منتظمین مشاعرہ کے ہمراہ مولوی عبدالحق صاحب تشریف لے آئے۔ انہوں نے مشاعرے کے اختتام پر اردو کے متعلق ایک ایسی پُر مغز تقریر کی، لاہور والوں نے شاید ہی ایسی تقریر کبھی سنی ہو۔

پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب میں ہندوستانی تھا اور قبلہ ڈاکٹر صاحب پاکستانی۔ ایک ہی خاندان کے افراد دو قوموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی گولڈن جوبلی کی تقریب تھی۔ ہندوستان سے ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جگر مراد آبادی، جناب جوش ملسیانی، جناب روش صدیقی اور راقم التحریر کو شرکت کی دعوت ملی ——

میرا پاکستان کا یہ سفر ایک عجیب کیف و نشاط سے بھر پور تھا۔ کراچی میں انجمن کی جوبلی کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی میں مشاعرہ تھا اور پھر واپسی پر پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایک مشاعرہ۔ گارڈن کالج راولپنڈی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور وہی درس گاہیں ہیں جہاں میں نے بات کرنے کا سلیقہ سیکھا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب سے ملاقات کی مسرت، اور گارڈن کالج اور پنجاب یونیورسٹی کی زیارت کا شوق، ایک طرح سے شوق پر پرواز بن گیا اور میں براہِ راست کراچی جا پہنچا۔

اب کے میرا قیام انجمن ترقی اردو کے دفتر میں تھا مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ عمارت بھی جس میں انجمن کا دفتر ہے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے باتوں باتوں میں یہ راز افشا کیا کہ انجمن کی یہ عمارت بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ دہلی میں تو آپ نے مجھے جواہر لال نہرو کے کمرے میں ٹھہرایا تھا، اب میرا قیام کس کمرے میں ہے؟ انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ پہلی منزل پر بائیں ہاتھ کا کمرہ ہے۔ فرمانے لگے:

"اس عمارت کا اصلی نام گاندھی آشرم ہے اور جس کمرے میں تم فروکش ہو اسی میں بیٹھ کر مہاتما گاندھی پرارتھنا کیا کرتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس پرارتھنا میں شریک ہوتے تھے۔ مختلف کمروں میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے ان کی آواز پہنچتی تھی، اور وہ قرآن کی آیات اور وید کے منتر اسی کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔"

کراچی میں اب کے میرا قیام کئی روز کا تھا۔ راولپنڈی کے مشاعرے میں ابھی کوئی دس گیارہ روز باقی تھے اور دہلی واپس آ کر پھر راولپنڈی جانا آسان نہ تھا۔ راولپنڈی کے بعد لاہور میں بھی مجھے رکنا تھا، اس لئے لمبے پروگرام کا ارادہ ترک کر دیا، جو بھاگم بھاگ پر مشتمل ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جوش ملسیانی اور روش صاحب کی واپسی کے بعد میں ہندوستان والوں میں تنہا کراچی میں رہ گیا۔

اب کے مولوی صاحب کو اور زیادہ مدت تک قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی پابندیٔ اوقات ان کی مسلسل محنت، ان کا علی الصباح بیدار ہو کر سمندر کی سیر کو جانا اور ہوا خوری کرنا، یہ تمام باتیں میرے لئے بڑی حیرت کا باعث تھیں۔ کھانا تو وہ ایک زمانے سے ایک ہی وقت کھاتے تھے۔ رات کو۔ دن کو وہ کھانا نہیں کھاتے ۔ ان کا کہنا ہے کہ دن کا کھانا طبیعت میں گرانی پیدا کرتا ہے اور یہ گرانی روزانہ کے کام میں مانع ہوتی ہے۔ رات کا کھانا بھی وہ اتنا کھاتے تھے کہ خوردن برائے زیستن کا ان پر پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ میرے لئے تو اتنی کم خوری حیرت کا باعث ہے۔ ایک دو بار میں نے ارادہ کیا کہ صبح ان کے ساتھ ہوا خوری کے لئے جاؤں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ صبح چار بجے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر سیر کے لئے گھر سے چل دیتے ہیں، تو مجھے اپنا ارادہ فسخ کرنے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جو کام بلکہ سیر و تفریح ۸۰ برس کی عمر میں وہ بآسانی کر لیتے تھے وہ میرے لئے چونتیس برس کی عمر میں ممکن نہ تھی۔ میری روانگی کے روز جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بر بنائے کاہلی اپنا ارادہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہا ہوں تو انہوں نے صبح کی سیر و مناظر سے لطف اندوزی کی لذات کو کچھ اس سحر آفرینی انداز میں بیان کیا کہ دہلی واپس آ کر میں نے بھی صبح صبح کی سیر شروع کر دی اور کئی ماہ تک اسے جاری رکھا۔

اسی سفر کا ذکر ہے۔ ایک دن شام کو میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا ذکر چل نکلا۔ اردو کی بقا اور ترقی کے متعلق ہندوستان میں جو کام ہو رہا ہے اس کی روش نے بڑی واضح اور عمدہ تصویر پیش کی۔ آپ ساری روداد بہ غور سنتے رہے کہیں کہیں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتے رہے، بعد میں کہنے لگے۔ ہاں! لیکن یہاں یعنی پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے میں بالکل غیر مطمئن ہوں چنانچہ غالباً یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے خلاف مزاج اردو کے سلسلہ میں ایک ایجی ٹیشن چلانا پڑی اور سکریٹریٹ تک ایک جلوس کی رہنمائی کرنی پڑی۔

اس مختصر سے قیام میں مجھے اس کمرے میں بھی حاضری کا موقع ملا جس میں مولوی صاحب دن بھر گرمی، سردی برسات سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہ کمرہ سادگی اور نفاست پسندی کی ایک تصویر تھا۔ خطوط، کتابیں، فائلیں مسودے ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے موجود، اور مولوی صاحب اس انہماک سے لکھنے یا پڑھنے میں مشغول ہیں کہ انہیں کسی کی آمد کا احساس تک نہیں ہے۔ دو ایک بار تو ایسا ہوا کہ میں کمرے میں آدھ منٹ توقف کے بعد انہی قدموں واپس لوٹا کیوں کہ کام میں ان کی یکسوئی نے مجھ میں اتنی ہمت ہی نہ پیدا ہونے دی کہ میں ان کے انہماک میں مخل ہو سکوں۔

یہ میں آج سے سات برس پہلے کی بات بتا رہا ہوں۔ پھر اس کے بعد ڈھاکہ۔ چٹاگانگ اور لاہور جلنے کا

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

عظمت کا نوحہ

۴ ستمبر کو انجمن ترقی اردو (دستاخ) کی طرف سے دہلی میں یوم عبدالحق منایا گیا ذیل کا مضمون اسی جلسے میں پڑھا گیا

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات ؂ تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اگر ادب میں فنائیت کی کوئی منزل ہے تو بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اردو زبان وادب کے سب سے بڑے عاشق اور سب سے زیادہ باخبر انسان تھے انہوں نے فنائیت کی تمام منزلیں طے کر لی تھیں۔ تاریخ ادب اردو میں ایک ہی مجذوب پیدا ہوا اور وہ بابائے اردو تھے۔ منصور نے کہا تھا۔ سب غائب ہیں میں ہی میں ہوں" بابائے اردو نے کہا "میری اور اس کی جناب میں مشاہد اردو ہے اور بس۔

بابائے اردو کے جذب و کیفیت کا باعث ان کی کبھی ختم نہ ہونے والی لگن تھی۔ وہ فریب سفر میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔ اردو مقصودِ سفر تھا اور انہوں نے اس کے حاصل کرنے کے لئے بے مثال جد وجہد کی ان کے جہد و عمل کے متعلق خود ان کی سطور ملاحظہ فرمائیے:۔

• نوجوانو! مجھے معاف کر دینا اگر کام کا لفظ زیادہ برا لگا ہو۔ تم زیادہ تر باتیں کرنا جانتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ دو چست فقرے بول کر ایک زوردار قہقہہ مار کر ملک اور قوم کی خدمت ہو جاتی ہے۔ مگر میں پرانے زمانے کا آدمی ہوں، میں نے زندگی میں صرف کام سیکھا ہے اور کام کیا ہے۔ میں کام کو زندگی سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کون سا کام کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اب میں تم سے سقراط اور افلاطون کی باتیں کیا کروں۔ تم نے تو ان کی کتابیں پڑھی ہوں گی۔ میں نے ان کو پڑھا بھی ہے اور اپنے زمانے کے بڑے بڑے سقراط اور افلاطون بھی دیکھے ہیں۔ میٹھی زبان کے افلاطون، ڈینگ مارنے والے افلاطون، سو مجھ سے کتابی باتوں کی امید نہ رکھنا۔ میں کام کی

بات کروں گا۔"

پروفیسر محمود شیرانی نے اپنے ایک مکتوب میں بابائے اردو کو لکھا:۔

"میں نے آپ کی ذات گرامی کے متعلق جو کچھ عرض کیا تھا معاف کیجئے وہ حسن ظن نہیں تھا بلکہ میرا ذاتی عقیدہ ...... آپ اردو کے جان باز سپاہی ہیں۔ آپ نے ہماری قدیم زبان کی حفاظت کی ہے اور جدید زبان کی پرورش میں سعی مجاہدانہ کی ہے اور مشعل لیکر ہمیں راستہ دکھایا ہے۔ اردو کے ساتھ آپ کی وفاداری اور جاں نثاری درحقیقت قابل صد ہزار تحسین ہے۔ ہم لوگ انسان ہیں اگرچہ مسلمان ہیں لیکن اتنے اندھے نہیں کہ ایک شخص بلا اجرت و معاوضہ بغیر پروائے تحسین و نکوہش، اپنی دھن میں پکا۔ راحت و آرام سے دستکش ہو کر استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ رات دن ہماری زبان کی خدمت میں مصروف ہے۔ ہم اس کی قربانی دیکھیں، اس کی جانبازی دیکھیں اور پھر ٹس سے مس نہ ہوں"

بابائے اردو کی قومی خدمت، کام کی دھن اور قربانیوں کے جذبے کا سراغ علی گڈھ تحریک میں ملتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے۔ "میں نے سید احمد خان کی آنکھیں دیکھی ہیں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور فیض حاصل کیا" چنانچہ بابائے اردو کے استحسان افعال اور تہذیب نفس میں علی گڈھ تحریک کا بڑا ہاتھ ہے۔ علی گڈھ تحریک کیا تھی؟ مختصراً جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد آنے والے دور ابتلا سے نبرد آزمائی، تہذیب و معاشرت کی حفاظت، تزکیہ معاشرہ، جمود و بیچارگی کی تاریکی میں ہمت، حوصلے اور مسرت کا پرچار، مغرب کے امنڈتے ہوئے سیلاب اور ذہنی غلامی سے نجات کی جد و جہد، ترقی پذیر ادب کی تخلیق اور فرسودہ روایات قدیم سے بغاوت کا نام علی گڈھ تحریک ہے۔ سرسید کا تہذیب الاخلاق، حالی کا مد و جزر اسلام، شبلی کا الفاروق و الکلام، شرر کے اسلامی تاریخ پر مبنی ناول، وقار الملک، محسن الملک، سرفراز حسین اور چراغ علی کے انشائیے قوم کے مردہ اعصاب میں زندگی کی لہر دوڑانے کے لئے تخلیق کئے گئے تھے، ان مصنفین نے ماضی کی پرعظمت روایات کو یاد دلایا مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا، مادہ اور نیچر پر گفتگو کی، مغرب کے لائے ہوئے علوم و فنون کے حسن و قبح پر بحث کا دروازہ کھولا، علم و فن کی فضیلت بیان کی اور ان کو حاصل کرنے پر نہ صرف زور دیا بلکہ مواقع فراہم کئے، یہ تمام مصنفین دین سے واقف ہی نہیں دین کے عالم تھے، انہوں نے بدلے ہوئے حالات اور قوم کی زبوں حالی کے پیش نظر دین کو عقل کی روشنی میں دیکھا اور اس طرح قوم میں شعور اجتہاد، امید و کامرانی کا جذبہ اور ماضی کی صالح روایات سے محبت پیدا کی۔ یہ مصنفین مغرب دشمن نہیں تھے، انہوں نے مغرب کی علمی ترقی کو تسلیم کیا۔

دراصل یہ بزرگ مغرب زدگی کے خلاف تھے۔ ان کا مسلک مشرق و مغرب میں توازن و تناسب پیدا کرنا تھا۔ یہ بیچ کے درمیانی راستہ اختیار کرنے کے قائل تھے اور یہ سب اس وجہ سے کہ وہ مشرق کی تہذیب کا تحفظ چاہتے تھے۔ علی گڑھ تحریک تاریخ ادب اردو میں نشاۃ اول ہے۔ اس کے بعد جتنی بھی اول تحریکیں پیدا ہوئی ہیں اس کے ڈانڈے علی گڑھ تحریک ہی سے ملتے ہیں۔

اردو ہندی کا جھگڑا سر سید کی زندگی ہی میں پیدا ہو چکا تھا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۹ء میں لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستانی زبان کے متعلق جو جھگڑا پیدا ہو گیا ہے اس کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا۔ دو علاحدہ علاحدہ جماعتیں قائم ہو گئی ہیں، ایک ہندوؤں کی اور دوسری مسلمانوں کی۔ میں نے اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبے میں اس کی نسبت ذکر کیا تھا۔ ہندو اہلِ ادب صاف صاف کہتے ہیں کہ ان کے کاندھوں پر مسلمانوں کی حکومت کا جوا اتنے عرصے رہا ہے کہ وہ اردو کو کبھی پسند نہیں کرتے وہ ازمنۂ وسطیٰ کی بولی جسے وہ ہندی کہتے ہیں اردو پر ترجیح دیتے ہیں بعض ہندو لوگ اس خیال کے بھی قائل ہیں کہ اپنے موجودہ آقاؤں کی زبان یعنی انگریزی کو اختیار کر لیا جائے..... اردو اور ہندی کے قضیے نے اس قدر اہمیت اختیار کر لی ہے اور یہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اس کے متعلق نوجوانوں سے امتحانوں میں سوالات دریافت کئے جاتے ہیں۔"

چنانچہ علی گڑھ اخبار، اخبار تہذیب لکھنؤ، دبدبۂ سکندری رام پور، مخزن العلوم بریلی وغیرہ اردو کی تائید میں مضامین شائع ہوتے اور معترضین کو جواب دئے جاتے۔ دراصل اردو ہندی کا جھگڑا ان جماعتوں سے بھی وابستہ ہو گیا تھا، جو اصلاح مذہب کے لئے وجود میں آئی تھیں خود عیسائی پادری دو چھوٹے بڑے دھڑوں میں بٹ گئے تھے کچھ اردو کے مرید تھے اور کچھ ہندی کے۔ یہی حال انگریز حکام کا تھا لفٹنٹ گورنر بنگال جی کیمپبل اردو کے خلاف اور لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال و مغربی ولیم میور اردو کے مؤید اور قائل تھا۔ رفتہ رفتہ یہ دھڑے بندی مستحکم ہوتی گئی اور جب سیاسی شعور میں بلوغت پیدا ہوئی۔ آزادیٔ ملک کے لئے جد و جہد نے شدت اختیار کی تو ہندی و اردو میں فصل پیدا ہوتا گیا۔ بابائے اردو نے اردو کی باگ ڈور اس وقت ہاتھ میں لی جب مسئلہ اردو آل انڈیا سیاسی مسئلہ بن چکا تھا۔

اس سیاق و سباق میں بابائے اردو نے فروغ اردو کے لئے جو کوششیں کیں ان کو مختصراً ان عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) سیاسی پلیٹ فارم پر پر امن ذرائع سے اردو کے استحکام کی کوشش۔

(۲) ایک کل ہند مرکزی انجمن کے ماتحت فروغ اردو کی جد و جہد۔

(۳) ایک مطبع کا قیام

(۴) رسالے اور اخبار کا اجرا

(۵) کتابوں کی اشاعت کا وسیع پروگرام۔

(۶) قدیم اردو مصنفین کی غیر مطبوعہ کتابوں کی تلاش اور طباعت۔

جیسا میں نے بتایا اردو کا مسئلہ سرسید کی زندگی ہی میں چھڑ گیا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھ اردو ہندی میں فصل پیدا ہوتا گیا اور اس لسانی مسئلے سے سیاسی نظریات وابستہ ہو گئے۔ چنانچہ بابائے اردو نے اردو کے فروغ کے لئے جو کوشش کی وہ ثقافتی اور قومی نوعیت کی تھی۔ انہوں نے اردو کو ہندوستانی اقوام کی مشترکہ زبان بتایا اور اس نظریے کی مخالفت کی کہ وہ کسی ایک فرقے کی زبان ہے۔ چونکہ بات بھی صحیح تھی اس لئے سرتیج بہادر سپرو اور پنڈت کیفی جیسے صاحب الرائے اشخاص نے ان کی ہم نوائی کی اور ان کے مقصد کو آگے بڑھایا۔ بابائے اردو نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اردو کی سرکاری حیثیت تسلیم کی جائے اور اردو کی تعلیم وسیع سے وسیع تر پیمانے پر ہو۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں اردو کی شمولیت، اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی جدوجہد اسی مقصد کے نقش پا ہیں۔ بابائے اردو کی یہ جدوجہد آخر وقت تک جاری رہی۔ کراچی میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم بھی نہ صرف اردو کے فروغ بلکہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے خیال کے تحت بنائی گئی تھی۔ بدقسمتی سے بابائے اردو اپنی زندگی میں اردو یونیورسٹی کا قیام نہ دیکھ سکے تاہم ان کی یہ اسکیم ان کی پرعظمت شخصیت کی دلیل ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) اور انجمن ترقی اردو (پاک) کی ترقی اردو کے لئے کوششیں کسی بھی شخص سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان دونوں انجمنوں کے زیر اہتمام اردو کی ترقی کے قومی و ملکی پروگرام منضبط ہوئے اور آج بھی یہ دونوں انجمنیں سرگرمی سے اردو کا نصب العین پیش کر رہی ہیں اور اردو کو اس کا جائز مقام دلوانے میں کوشاں ہیں۔ ان کی کوششیں پرامن اور ان کا سیاسی دھڑے بندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اردو کے بالغ نظر ادیب ان سے وابستہ ہیں جس کے پیش نظر ہم اچھے مستقبل کی امید کر سکتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو نے توانائی حاصل کرنے کے بعد اپنے زیر اہتمام دوسری زبانوں کی نمائندہ کتابوں بالخصوص فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کے ترجمے پیش کئے۔ انجمن ترقی اردو نے تراجم کتب پر خصوصی زور دیا کیونکہ ترجمے کی حیثیت عمرانی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یونان و روما نے عربوں کو، عربوں نے یورپ کو اور یورپ نے تمام اقوام عالم کو کیا دیا۔ تراجم کتب کے ذریعے ہی ایک قوم کے خیالات اور اس کا حاصل دوسری قوم میں منتقل ہوتے رہے۔ انجمن ترقی اردو کی یہ کوشش آج بھی مستحسن ہے۔

فروغ اردو کی کوششوں میں شاید سب سے زیادہ اہم اور افادی کوشش قدیم مخطوطات اردو کی

دریافت، ترتیب اور اشاعت ہے۔ حکیم شمس اللہ
قادری، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور،
پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر عبدالحق اردو کے
وہ مایۂ ناز سپوت ہیں جنہوں نے اردو ادب کی تاریخ
کو وسعت دی ہے، ان اکابر کی تحقیق نے دبستان گجرات
اور دبستان دکن دی ہیں۔ آج خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز
شیخ عین الدین گنج العلم، سید محمد عبداللہ حسینی، سلطان
محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، ملا غواصی، شاہ میراں جی
شمس العشاق، ملک خوشنود، رستمی، نصرتی، ولی اورنگ
آبادی کے نام اردو کے طالب علموں سے پوشیدہ نہیں
ہیں۔ رسالہ اردو کے فائل ان تحقیقوں سے بھرے پڑے ہیں
باہر بہت سے تذکرہ نویس بھی پردۂ خفا میں تھے۔ تحقیق
کے اس سیلاب میں وہ بھی منظر عام پر آئے۔ بابائے اردو
کی فتوحات میں سب رس اور معراج العاشقین پر تحقیقی
مضامین بے مثال ہیں۔ بایں ہمہ وہ مطبوعات جو بابائے
اردو کی سرکردگی میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی ہیں
ادب اردو کی عظیم خدمت سے عبارت ہیں۔ درحقیقت
بابائے اردو کی تحقیقات کے جائزے کے لئے ایک علیحدہ مضمون
درکار ہے۔ بابائے اردو اس طرۂ خاص میں ہمہ صفت الناس
تھے۔ قدرت نے آں موصوف کو صبر و استقلال کا مادہ، تلاش
و جستجو کی خواہش اور متوازن نتائج اخذ کرنے کی قوت
بدرجہ اتم دی تھی۔ آج وہ قافلۂ اردو کے لیلیٔ محمل ہیں۔
جیسا میں نے گزشتہ سطور میں عرض کیا کہ ڈاکٹر عبدالحق
علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے۔ میں نے مختصراً یہ بھی بتایا کہ
علی گڑھ تحریک کیا تھی اور اس کے وابستگان کے کیا
کارنامے تھے۔ شاید اس وقت اس وضاحت کی ضرورت
نہیں کہ شخصیت کی چھاپ بیان پر پڑتی ہے۔ دوسرے
الفاظ میں شخصیت ہی اسلوب بیان ہے۔ چنانچہ
ایک ایسی شخصیت جس کے نکھرنے میں علی گڑھ تحریک کا ہاتھ
ہو اور جس کی مشاطگی ایک ایسے دور میں ہوئی ہو جس کے
علم بردار سرسید، شبلی، حالی، محسن الملک وغیرہ ہوں
ایک منفرد طرز نگارش کی حامل ہو گی۔ اس طرز نگارش میں
ثقافتی رنگ، علمی گہرائی، مصلحانہ کاری گری، خطیبانہ
جوش، قومی درد، خلوص و سچائی کی سادگی اور اثر پذیری
اور مقصدیت کے واضح واضح نقوش ہوں گے چنانچہ
سرسید کے استدلال، شبلی کا فہم و فلسفہ، حالی کا راہ روایت
سے گریز اور اظہار، اصلیت پسندی نہ صرف ان کے طرز
نگارش کے خصوصی پہلو ہیں بلکہ علی گڑھ تحریک کے مابعد
ادیبوں کے لئے مشعل راہ بھی۔ بابائے اردو نے سرسید
کے دور کامراں میں آنکھیں کھولیں۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء
کے دور مابعد کے اتصل متصل حالات میں فکر کرنا سیکھا
اور شبلی و حالی کی بالغ نظری میں منزل کا انتخاب کیا۔ ایک
موقع پر انہوں نے فرمایا تھا:۔

" میں کوئی سیاست داں نہیں ہوں۔
میں نے اپنی زندگی اردو زبان کے لئے
وقف کر رکھی ہے لیکن میری عمر نوے
کے اوپر ہے۔ پاکستان میں ایسے
لوگ بہت کم ہوں گے جنہوں نے کہ

وکٹوریہ کا زمانہ دیکھا۔ میں اس وقت نوجوان تھا۔ میں نے مغربی سیاست اور مغربی طرز پر سوچنے کا زہر آہستہ آہستہ پھیلتے دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہر ناقص اور جعلی تعلیم کا بوجھ کس طرح لادا گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ہم جمہوریت کے نام پر کس طرح الجھائے گئے اور کس طرح انگریز نے ہماری انقلابی قوت کا دھارا اسمبلیوں کی طرف موڑ دیا۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں نے اسی برس میں ہر طرح کے بڑے لوگوں کو جانا اور پرکھا ہے۔ میں نے سر سید احمد خاں کے ساتھ کام کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ غدر کے بعد جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ کتوں اور بلیوں سے بدتر تھی۔ اگر اس وقت سر سید نے انگریز کے ہتھیار انہی کی ڈھالوں پہ نہ روکے ہوتے تو آج مسلمان قوم کا نام و نشان تک نہ ہوتا

آپ جانتے ہی ہیں بابائے اردو کی جد و جہد کا مقصد ثقافتی ترقی کا ذریعہ اردو تھی۔ انہوں نے اردو ہی کو قومی سالمیت کی بنیاد اور تہذیبی ترقی کا ذریعہ سمجھا۔ مختصر الفاظ میں حیات کی بے رنگی و بازنگی میں انہیں اردو کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت نظر نہیں پڑی۔ چنانچہ حیدرآباد (دکن) پہنچنے کے بعد جب ان کے جوہر کھلے اور تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ جاری ہوا تو علی گڑھ تحریک کی ذہنی تربیت نے ان کی تخلیقوں پر مینا کاری کی۔ ان کی ذہنی تربیت اس طرح راسخ ہو چکی تھی کہ زندگی کے ہر دور میں ان کی شخصیت ان کی تحریر میں ابھرتی رہی۔ ان کی کسی بھی تصنیف کا مطالعہ کیجئے اس میں شخصیت کی ژولیدگی نہیں ہے ان کی تحریر میں ان کا خیال اقلیدس کے طرز پر واضح، باضابطہ اور دل نشین ہے۔ ان کی تحریر میں ضبط و صبر کا خاصہ تلاش و جستجو کی لگن، حقیقت پسندی کا زور اور علمیت کا عجاری بھرکم بن ہے اور ان خصوصیات کے باوصف وہ آسان عام فہم اور سادہ تحریر کے عاشق ہیں۔ وہ عالم ہیں لیکن تخیل کے پروں پر پرواز نہیں کرتے۔ وہ محقق ہیں لیکن تحریر میں وہ اپنی تحقیق کو گرانبار نہیں بناتے۔ ان کی تحریر میں ان کی شخصیت کا وزن، ان کی علمیت کا دباؤ، ان کی کاوش و جستجو کا مآل، ان کی طبیعت کا سکون، صبر اور ٹھہراؤ ہے، گہرا پانی خاموش ہی بہتا ہے۔ ان کی تحریر میں بہاؤ ہے لیکن بے آواز، ان کی تحریر میں شستگی ہے لیکن عصمت مآب، ان کی تحریر میں علمیت ہے لیکن بے کنار، ان کی تحریر میں تحقیق ہے لیکن اتھاہ اور ان کی تحریر میں وضعداری بھی ہے ——— پرانے لوگ وضعدار ہوتے ہی ہیں اور وہ بھی علی گڑھ تحریک کے وابستگان ——— وہ اپنے طرز خاص میں راسخ ہیں۔ کبھی کبھی ان کی خوش طبعی جو خود علی گڑھ سے مختص ہے، حباب آسا ان کی تحریر میں ابھر آتی ہے۔ ایسے مواقع پہ ان کی تحریر کا لطف وہ لوگ صحیح معنی میں اٹھاتے ہیں جنہوں نے دارالعلوم علی گڑھ کی اقامتی زندگی سے لطف

اٹھایا ہے یا جنہیں علی گڑھ کے پرانے گنہگاروں میں اٹھنے بیٹھنے کا شرف حاصل ہے۔

بابائے اردو ناقد ادب بھی ہیں اور محقق ادب بھی۔ ایک ناقد کے طرزِ نگارش اور ایک محقق کے طرزِ نگارش میں امتیاز ہوتا ہے۔ اس زمانے میں تنقیدی طرزِ نگارش رفتہ رفتہ ابہامی، تجریدی اور سرریالسٹک ہوتا جا رہا ہے۔ سیدھی سیدھی باتیں اتنے زاویوں، اتنے دائروں، اتنے رنگوں اور اتنے ہیر پھیر سے کہی جاتی ہے کہ تنقیدی مضمون اپنی غایت خود بن جاتا ہے، اور موضوع مضمون پر تخیل کی اتنی تہیں چڑھ جاتی ہیں کہ عموماً اس تک رسائی نہیں ہوتی اور اگر رسائی ہوتی بھی ہے تو موضوع اپنے اصل سے دور معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ اصل سے نہایت قریب ہوتا ہے۔ ایک محقق کا طرزِ تحریر ابہام و تجرید کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کا کام حقائق کی تلاش اور حقائق کی نظم و ترتیب ہے اور وہ خزف ریزوں کے انبار میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر موتی نکالتا، ان کو پرکھتا اور ایک سلک بنا کر عروسِ ادب کو پیش کر دیتا ہے اس کے خطِ معین، اس کے زاویے محدود اور اس کے اسٹروک گنے چنے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ ناقد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ محقق بھی ہو لیکن محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ ناقد بھی ہو۔ تحقیق کی منزل نقد کے بعد آتی ہے نئے حقائق کی دریافت تحقیق ہے اور ان حقائق کی پرکھ تنقید۔ پرانے حقائق کی تکذیب یا ترقی تحقیق ہے اور تکذیب و ترقی کا عمل تنقید۔ چنانچہ ایک محقق عمل تنقید میں تحقیق کی حق پسندی کو نظر انداز کرتے ہوئے مینا کاری کی روش نہیں اختیار کر سکتا۔ آبِ حیات اپنے عہد میں ایک محققانہ کتاب بھی لیکن اس میں انشائیے کی گل کاری اس قدر تھی کہ وہ تحقیق ہی نہیں تنقید کو بھی لے ڈوبی۔ اس وقت آبِ حیات کی عظمت محمد حسین آزاد کے طرزِ قلم کی وجہ سے ہے۔ تحقیق و تنقید کے نقطۂ نظر سے نہیں ہمارے خیال میں ایک محقق دو دھاری تلوار پر چلتا ہے۔ وہ قلم کا توسن روکنے پر مجبور رہے۔ وہ تحقیق و تنقید میں توازن قائم کئے بغیر تحقیق کو اجاگر نہیں کر سکتا، وہ زاویے، خط، دائرے اور اسٹروک محدود ہی رکھتا ہے۔

ادبِ اردو کی تاریخ میں حالی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے محققانہ طرزِ نگارش کا گر بتایا۔ مقدمہ شعر و شاعری محققانہ طرزِ نگارش کا پہلا تجربہ ہے، اور بابائے اردو اس وقت تک اس تجربے کی آخری کڑی۔ بابائے اردو طرزِ تحریر کے اعتبار سے حالی کے اسلوب بیان کی نہایت ترقی یافتہ شکل ہیں۔ یہ کہنا کہ بابائے اردو نے حالی کی سادہ نگاری اپنائی آسان بات ہے مگر یہ جاننا کہ انہوں نے حالی کے محققانہ طرزِ تحریر کو فروغ دیا دعوتِ فکر کا باعث ہے۔

بطور حرفِ آخر میں ان سطروں کا اور اضافہ کروں گا کہ بابائے اردو نے دیگر محققین کی کاوشوں کو ہمیشہ سراہا اور ان کی طباعت کا انتظام کیا۔ بحالاتِ موجودہ جبکہ بالخصوص اردو تحقیقی کتابوں کی طباعت بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ بابائے اردو نے تحقیقی

(باقی صفحہ ۹۸ پر)

محمود حسین

تایا ابا

"میں اصل کا خاص سومناتی
آیا میرے لاتی و مناتی"

دہلی سے چھتیس میل دور مراد آباد کی جانب ضلع میرٹھ میں ایک قصبہ ہاپڑ واقع ہے ہم لوگ اس قصبے کے رہنے والے ہیں اگر آپ ہاپڑ جائیں تو کوئی بھی آپ کو محلّہ قانون گویاں میں پتھر والے کنوئیں کا پتہ بتادے گا۔ اسی کنوئیں کے سامنے ایک بڑی سی عمارت دکھائی پڑتی ہے جو آج تک سے تقریباً چالیس برس پہلے مٹی گارے کے ایک کچے مکان کو منہدم کرکے نئے سرے سے تعمیر کی گئی تھی یہی بابائے اردو علامہ مولوی عبدالحق اور ہم سب کا آبائی مکان ہے۔

ہمارے آبا و اجداد یہیں رہتے تھے اور ان کے سپرد دورِ مغلیہ میں محکمہ مال کی قانون گوئی کی خدمات تھیں۔ یہ سب ہندو تھے اور کایتھ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب عہدِ شاہجہانی میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور شیخ عبدالدائم نام پایا۔ ان کی اولاد شمالی مغربی ہند میں جس کو آج کل اُتر پردیش کہا جاتا ہے کے تمام اضلاع میں پھیل گئی۔ ان ہی میں سے ہمارے مورثِ اعلیٰ شیخ صادق حسین تھے۔ جن کی قبر آج بھی ہمارے خاندانی قبرستان ہاپڑ میں موجود ہے۔

شیخ صادق حسین مرحوم سے جو سلسلہ چلا اس میں میرے دادا شیخ علی حسین صاحب مرحوم تھے جن کی آٹھ اولادیں ہوئیں چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔ اولاد نرینہ میں سب سے بڑے شیخ ضیاء الحق صاحب مرحوم تھے۔ اور اس کے بعد مولوی عبدالحق۔ اب صرف میرے والد جو بابائے اردو کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بقیدِ حیات ہیں۔ باقی سب بہن بھائیوں کا انتقال ہو چکا ہے۔

ہمارا خاندان اوسط درجے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور دادا صاحب مرحوم معافی کی آمدنی کے علاوہ خود ملازمت بھی کرتے تھے وہ بہت سوجھ بوجھ کے دور اندیش بزرگ تھے۔ اور اسی لئے اپنی معمولی حیثیت کے باوجود انھوں نے اپنے لڑکوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ یہاں تک کہ زمین بیچ دی اور قرض بھی حاصل کیا۔ ہر طرح کی مصیبت اٹھائی لیکن اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ مولوی صاحب مرحوم کے بڑے بھائی نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن مولوی صاحب نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ خداداد قابلیت و ذہانت سے اپنے آپ کو اس مقام پر پہونچایا کہ رہتی دنیا تک اُنکا نام باقی رہے گا اور ہم نیز ہماری نسلیں اُن پر فخر کریں گی۔

جیسا کہ کئی اصحاب نے اپنے مضامین میں لکھا ہے مولوی صاحب بچپن سے ہی نہایت خاموش اور سنجیدہ واقع ہوتے تھے۔ علی گڑھ کی صحبت اور تعلیم نے وہ کام کیا کہ آج ہم انھیں بلا جھجک سرسید ثانی کہہ سکتے ہیں۔ سرسید سے جو ایک خاص لگاؤ مولوی صاحب کو تھا اور خود سرسید جو شفقت اور مہربانی اُن پر فرماتے تھے۔ اس کا ذکر کئی مضامین میں آچکا ہے۔ ملازمت، علمی مشاغل وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا۔ میرا مقصد یہاں بابائے اردو کے صرف دو پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کیا چیز ہے جو مولوی صاحب کو دوسرے ادیبوں، شعراء اور مصنفین سے ممتاز بناتی ہے۔ دوسرے ان کا تعلق اپنے رشتہ داروں سے کیا اور کیسا تھا۔

ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ایک انسان خواہ وہ سرسید ہو یا مرزا غالب، اقبال ہو یا بابائے اردو مولوی عبدالحق، اپنی فطری کمزوریوں اور خوبیوں پر اختیار نہیں رکھتا۔ انسان اچھائی اور بُرائی کا مجموعہ ہے اور کسی بھی شخص کو اگر ہم فرشتہ تصور کر لیں تو خود یہ ہماری فہم کا قصور ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ ایک شخص میں خوبیاں زیادہ ہیں یا برائیاں اور ان میں سے جن کی تعداد مجموعی طور پر زیادہ ہو انکی روشنی میں اسے قائم کی جانی چاہئے۔ پس مولوی عبدالحق بھی ایک انسان تھے اور جہاں ان میں خوبیاں تھیں وہاں کمزوریاں بھی تھیں جن کی وجہ سے انھیں کافی نقصانات اٹھانے پڑے لیکن مرتے دم تک وہ اپنی کمزوریوں پر قابو نہ پا سکے۔ جہاں تک ان کی خوبیوں کا تعلق ہے، بے شک وہ اس قدر زیادہ اور زندگی کے ہر پہلو پر اتنی غالب تھیں کہ ان کی برائیاں ماند ہو کر رہ گئیں جو عمل پیہم، یقین محکم مولوی صاحب کی پوری زندگی میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اسی طرح جو ایثار اور قربانی انھوں نے اپنی قومی زبان بلفاظ دیگر اپنی قوم کے لئے کی۔ اس کا مقابلہ کبھی شاید کوئی اور مشکل ہی سے کر سکے۔ جس ہمت، خلوص اور پختہ ارادہ کے ساتھ انھوں نے جوانی میں اردو کی خدمت کا بیڑا اٹھایا وہ اکیانوے برس کی عمر تک بستر مرگ پر بھی قائم رہا۔ دنیا کی کوئی لذت، کوئی لالچ یا کوئی اور دلچسپی اُن کو اپنی راہ سے نہ ہٹا سکی اور یہی ایک انسان کا کمال ہے۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

ہمیں دنیا میں بہت سے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ملیں گے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کا مرتبہ بحیثیت ایک ادیب کے مولوی صاحب مرحوم سے بہت بلند ہے۔ لیکن میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنی زبان کی خدمت اور تحفظ کے لئے جو کچھ مولوی عبدالحق نے کیا اس کی مثال دنیا کے کسی ادب میں نہ مل سکے گی، ہر شاعر اور مصنف جو لکھتا ہے۔ اس سے کسی نہ کسی صورت خود اس کی ذات کو بھی کچھ فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔ میرا

مقصد صرف نام و نمود سے نہیں بلکہ دیگر مادّی فوائد سے ہے جس میں روپیہ پیسہ جائداد سب کچھ شامل ہیں۔ ہمیں مولوی عبدالحق کی ایک تنہا ذات نظر آتی ہے۔ جنھوں نے اپنے فن اور کمال کو اپنی گزر اوقات کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ملازمت کی اور تقریباً پینتالیس سال تک بڑے اچھے اور اونچے عہدوں پر فائز رہے۔ ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے ممتحن رہے۔ غرض اپنی محنت سے انھوں نے لاکھوں روپیہ کمایا لیکن ایک انچ زمین، کوئی مکان، جائداد یا بنک بیلنس اپنے پیچھے نہیں چھوڑا، اور ہمیشہ تہی دست ہی رہے آخر کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ہمیشہ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ انجمن اور اردو کی نذر کرتے رہے۔ انجمن کے کام اور اردو کے پروپیگنڈے کے لئے انھیں طول و عرض ہندوستان اور پھر پاکستان میں لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے تھے۔ وہ ہمیشہ سکنڈ کلاس، فرسٹ کلاس یا ہوائی جہاز میں سفر کرتے تھے۔ اور ایک معتمد یا ملازم بھی ان کے ہمراہ رہتا تھا یہ تمام اخراجات وہ اپنی جیب سے برداشت کرتے تھے اور کبھی انجمن کے بجٹ پر اس کا بار نہیں ڈالا گیا۔ جب کبھی انجمن کو روپیہ کی ضرورت ہوتی وہ بلا تکلف اپنے پاس سے دے دیا کرتے تھے۔ خواہ بعد میں ایسی رقومات واپس ملیں یا نہ ملیں یہانتک کہ سولہ اگست ۱۹۶۱ء کو جب انھوں نے دنیائے فانی سے ابدی دنیا کی طرف کوچ کیا اس وقت بھی انجمن ان کی چار ہزار روپیہ کی مقروض تھی۔ یہ رقم انھوں نے وفات سے چند روز قبل انجمن کو عنایت کی تھی۔

تایا ابا بے حد کھلا ہاتھ رکھتے تھے۔ اور انتہائی فضول خرچ بھی تھے۔ بلا ضرورت دعوتیں کرنا، دوسروں پر پیسہ خرچ کرنا ان کی عادت تھی۔ لہٰذا وہ کبھی حسبِ حیثیت بڑی رقم پس انداز نہ کر سکے۔ پھر بھی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بلکہ یقین ہے ۱۹۴۲ء میں جب انجمن کا دفتر دہلی میں تھا ان کے پاس ۵۵ ہزار روپیہ بنک میں جمع تھا اور یہ وہ زمانہ تھا۔ جب وہ انجمن کی اپنی عمارت پریس اور کالج کے لئے ہندوستان بھر میں چندہ جمع کرتے پھر رہے تھے۔ میں اس زمانے میں عربک کالج دہلی میں پڑھتا تھا اور ہر اتوار کو نیز دوسری تعطیلات میں تایا ابا کے پاس جایا کرتا تھا۔ انجمن کا دفتر اور خود ان کی رہائش کوٹھی دارالسلام دریا گنج نمبرا (رہائش گاہ مرحوم ڈاکٹر انصاری) میں تھی۔

ایک دن شام کو جب میں پہونچا تو مولوی صاحب کوٹھی کے وسیع صحن میں اکیلے بیٹھے حقّہ پی رہے تھے اور باہر لان پر ان کے معتمد خاص رفیق الدین صاحب ٹہل رہے تھے۔ کچھ دیر میں نے رفیق صاحب سے باتیں کیں جس سے اندازہ ہوا کہ اس دن تایا ابا کسی گہری فکر اور سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں ان کے پاس گیا لیکن انھیں معلوم بھی نہ ہوا کہ کوئی آیا ہے، یہاں تک کہ رات کے کھانے کا وقت آگیا۔ یہ سردیوں کا زمانہ تھا اور دسمبر کا مہینہ تھا۔ بڑے دن کی تعطیلات قریب تھیں۔ کھانے کی میز پر اپنے کتب خانے کے متعلق کچھ باتیں کرتے رہے اور آئندہ ان کا کیا پروگرام تھا۔

اس پر بھی کچھ اظہار خیال کیا حالانکہ ہم لوگوں سے وہ انجمن کے بارے میں یا اپنی پبلک لائف کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ کتب خانے، انجمن اور فراہمی چندے کے متعلق جن خیالات اور تاثرات کا انھوں نے اظہار فرمایا تھا متعدد وجوہ کی بنا پر اس وقت ان کا اظہار کرنا مناسب نہ ہوگا البتہ میں جس نتیجہ پر پہنچا وہ یہ تھا کہ فراہمی چندے کے سلسلے میں کہیں کوئی گفتگو ایسی ضرور ہوئی تھی۔ جس سے انھیں روحانی اذیت پہنچی۔ اسی وقت شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار انھوں نے مجھ سے ایک خاص کام کے لئے فرمایا یہ ایک جداگانہ قصہ ہے بہرحال میں کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھا اور پھر چلا آیا۔ کچھ دن بعد تعطیلات میں میں بھوپال چلا گیا اور وہیں تھا کہ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے اپنا تمام تر سرمایہ انجمن کے نام منتقل کر دیا ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد ماہانہ پنشن کے علاوہ جو ان کو ریاست حیدرآباد سے ملتی تھی کوئی اور سرمایہ یا مستقل ذریعہ آمدنی باقی نہیں بچا تھا۔

پاکستان آجانے کے بعد ان کی پنشن جو حیدرآباد سے ملتی تھی بند ہوگئی اور حکومت پاکستان نے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کی مالی حالت بے حد خراب اور کمزور ہوگئی تھی۔ لیکن اخراجات اور طریقہ کار میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی بے مثال خدمات کے پیش نظر انھیں نشانِ قائداعظم کے ساتھ دس ہزار روپے نقد بطور انعام صدر مملکت پاکستان نے مرحمت فرمایا۔ تایا ابا کی وفات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس دس ہزار روپیہ کے چیک کو بھی انھوں نے محض تنی سی دیر اور اسلئے ہاتھ میں لیا تھا کہ اس کو اُردو یونیورسٹی کے نام منتقل کر کے دستخط کر دیں۔

بڑے اور مخلص لوگ دماغی، جسمانی مشقت کرتے ہیں؛ وقت صرف کرتے ہیں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ لیکن اپنا کام کئے جاتے ہیں تایا ابا نے بھی یہ سب کچھ کیا لیکن ان کے ساتھ ہی سب سے بڑھ کر یہ کیا کہ اپنے تن من اور زندگی کے ساتھ تمام عمر کی کمائی بھی انجمن اور اُردو کی نذر کر دی۔ اور یہی وہ چیز ہے جو مولوی عبدالحق کو دوسرے ادیبوں اور قومی خدمت کرنے والوں سے ممتاز کرتی ہے یہی وہ حقیقت ہے، جس نے انھیں بابائے اردو کا لقب دلوایا اور یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اپنی زندگی میں اور مرنے کے بعد انھوں نے وہ عزت اور شہرت حاصل کی جو کسی بڑے سے بڑے ادیب اور مصنف کو بھی مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

مولوی صاحب نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ ایک دفعہ جب دادا اور دادی نے ان کی زبردستی شادی کرانا چاہی تو منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن ایسا طریقہ اختیار کیا کہ یہ زنجیر ان کے پاؤں میں نہ پڑ سکی۔ میں نے بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ "بھوپال میں شادی کی تھی" یا "کچھ عرصہ ازدواجی زندگی گزاری تھی" بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ صحیح اور حقیقی معنی میں انکی شادی

کبھی ہوئی ہی نہیں۔ دراصل اُن کی شادی جیساکہ خود مرحوم نے ایک دفعہ فرمایا تھا۔ اردو سے ہوچکی تھی وہی ان کی محبوب تھی۔ وہی ان کی اولاد۔ دہلی کے ایک شاعر نے خوب کہا تھا۔

باقی ہے ترے دم سے جہانِ اُردو
قایم ہے ترے دم سے شانِ اُردو
اِس خدمتِ بے لوث کی کیا ہو تعریف
اُردو ہے تری جان، تو جانِ اُردو

ان تمام بے مثل خوبیوں، جذبہ ایثار و قربانی، دوسروں کی امداد اور ہمدردی اور بہت سے ان محاسن کے ساتھ ہی ساتھ جو اس زمانے میں مفقود ہیں۔ تایاابّا میں بحیثیت ایک انسان کے خامیاں بھی تھیں۔ مثلاً وہ مردم شناس بالکل نہیں تھے، کبھی صحیح اور مخلص آدمی کو انہوں نے نہیں پہچانا، مدد وہ سب کی کرتے تھے — خلوص ہر ایک کے ساتھ تھا۔ اس میں اچھے اور بُرے کی قید نہیں تھی لیکن کون کیسا ہے یہ وہ زندگی بھر تمیز نہ کر سکے چونکہ وہ اپنے عزیز و اقارب سے علیحدہ رہ کر تنہا زندگی گزارنے کے عادی تھے اور گھر میں کبھی کوئی عورت رہی نہیں جو امورِ خانہ داری کا انتظام و انصرام کرتی وہ ہمیشہ کسی ایک شخص پر اس کی ظاہری خوبیاں دیکھ کر بھروسہ کر لیا کرتے تھے۔ مرحوم کے سر پر تو ہمیشہ اُردو کی دُھن سوار رہتی تھی۔ اور ان کے گھر کا انتظام اور تمام تر اخراجات کسی ایک ایسے آدمی کے سپرد رہا کرتے تھے جس کو وہ غلط یا صحیح اپنا سمجھ لیتے تھے۔ جب سے مجھے ہوش ہے میں نے ہمیشہ ان کے ساتھ کسی ایک ایسے آدمی کو بھی دیکھا جو سیاہ و سفید کا مالک ہوتا تھا۔ ان اصحاب میں سے آج کئی ایسے ہیں جو ہمارے ملک اور قوم میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے بڑے بڑے آدمی ایسے بھی ہوئے ہیں اور ہیں جنھوں نے مولوی صاحب کے وظیفوں سے تعلیم پائی ہے۔ میں بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہوں کہ سوائے دو اصحاب کے جو مولوی صاحب مرحوم کے خاص معتمد بن کر رہے کوئی ایک بھی ایسا نہ نکلا جس کے دل میں ان کے لیے سچی ہمدردی اور خلوص ہوتا۔ سب نے اپنا مطلب نکالا، کھایا، کمایا مولوی صاحب کو بدنام کیا۔ بڑھاپے میں اُن کو رُسوا کیا اور پھر اپنی راہ لی۔ یہ محض تایاابّا کی خود ایک بہت بڑی کمزوری اور سادہ لوحی کا نتیجہ تھا۔

اس کی ذمہ داری ہم نہ تو کسی پر ڈال سکتے ہیں، اور نہ ہی کسی کو موردِ الزام ٹھہرا سکتے ہیں۔ ہم ظاہرا حالات دیکھ کر صرف اس قدر ہی کہہ سکتے ہیں کہ اپنی ذاتی زندگی اور معاملات میں تایاابّا کو اچھے بُرے کی تمیز نہ تھی۔

اقبالؔ کا ایک شعر ہے:-

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبالؔ نے صرف "کبھی کبھی" کے لیے مشورہ دیا ہے، لیکن جہاں تک نجی معاملات اور ذاتی زندگی کا تعلق ہے۔ تایاابّا نے اِس "کبھی کبھی" کو اپنے لئے لفظ اکثر و بیشتر میں تبدیل کر لیا تھا۔ اور مرتے دم تک وہ اس پر عامل رہے۔

بے شک وہ بہت سنجیدہ اور خاموش طبع واقع ہوئے تھے۔ لیکن بے حد کچے کان کے تھے۔ جس نے جو کہہ دیا اس پر یقین کر لیا کرتے تھے اور ایسے یقین ایک آدمی کے لیے بےحد نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ مانا ہوا اصول ہے اور تایا ابا بھی اس نقصان سے محفوظ نہ رہ سکے۔ جب ان کو غصہ آتا تھا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور پھر کچھ نہ سوچتے تھے، سازش یا کسی کی حمایت نقص سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن پھر وہ اپنی اسی طرح خواہ مخواہ اچھے لوگوں کو بھی اپنا مخالف حالانکہ حقیقت کھلنے پر ایسی مخالفتیں باقی نہ رہتی تھیں مرحوم ہاپوڑ کے قانون گوؤں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا جب غصہ میں بکنے جھکنے پر آتے تو کوئی کمی نہ چھوڑتے یہ خاندانی وصف تھا۔

اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ منکر اور ملحد تھے لیکن یہ غلط ہے اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پابند صوم و صلوٰۃ نہیں تھے اور بظاہر مذہب سے کوئی واسطہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ خدا اور اس کے رسولؐ پر پورا پورا ایمان رکھتے تھے۔ اور دل سے مسلمان تھے۔

جہاں تک ان کی خامیوں کا تعلق ہے وہ ان کے نجی اور ذاتی معاملات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں — وہ ایک سچے عاشق تھے اور بلا شک و شبہ اردو ان کی معشوق تھی۔ عاشق کے سوچنے اور کام کرنے کا طریقہ بالکل نرالا اور سب سے الگ ہوتا ہے۔ ایک عاشق جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے محبوب کی بھلائی اور بہتری کے ہی لیے کرتا ہے اس کی نیت اور ارادہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیاوی اصولوں کے پیش نظر ہم ایک عاشق کے جذبات اور کاموں پر نکتہ چینی کریں۔ اگر اردو اور اس کے متعلقہ کاموں اور جد و جہد میں دنیاوی اعتبار سے تایا ابا سے کوئی لغزش ہوئی تو اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اپنی محبت، دھن اور پختگیٔ ارادہ کے سامنے وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ مصلحتاً ایسا کرنا درست ہوگا یا نہیں۔

میں نے اکثر احباب اور دیگر اصحاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کو اپنے عزیز و اقارب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تایا ابا کے دوران علالت بھوپال میں میری ایک مشفق و مہربان نے جن کا برتاؤ میرے ساتھ بالکل ماں جیسا ہے یہی سوال مجھ سے کیا اور اسی وقت میرے دل میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کا خیال پیدا ہوا — بظاہر دور سے دیکھنے والوں کا ایسا محسوس کرنا کچھ غلط بھی نہ تھا لیکن حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے جیسا کہ میں اوپر بھی عرض کر چکا ہوں۔ ہمارے خاندان کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی اور جو کچھ تھی بھی وہ تایا ابا مرحوم اور ان کے بڑے بھائی کی تعلیم و دیگر اخراجات کے سلسلے میں بالکل ختم ہو چکی تھی۔ تعلیمی اعتبار سے بھی ہمارا خاندان کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتا تھا۔ یہ صرف مولوی عبدالحق ہی کی ذات تھی جس نے تعلیم سے فارغ ہو کر سب کو سنبھال لیا اپنے چھوٹے بھائی والدین بڑے بھائی غرض کہ سب کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اور آخر میں میں یا میرا بھائی بھی جو کچھ پڑھ سکے تو خدا اور رسولؐ کے بعد یہ صرف تایا ابا ہی کے طفیل تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے

خاندان میں مولوی عبدالحق کا پیدا ہونا ہم سب کے لئے ، نیز آنے والی نسلوں کے لئے خدا کی رحمت ثابت ہوا ۔ مولانا حالی نے خوب کہا ہے۔ اور تایا ابا پر ان کا یہ شعر حرف بحرف صادق آتا ہے :۔

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

مولوی صاحب نے علی گڑھ سے بی۔اے کرنے کے بعد فوراً حیدر آباد کا رخ کیا اور نواب محسن الملک کے توسط سے آصفیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے بعد ازاں بڑے سے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور جو ترقی کی وہ سب پر ظاہر ہے ۔ ملازم ہوتے ہی اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے والد کو اپنے پاس بلا لیا ، اور ان کو تعلیم دلائی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے خرچ سے انجینئری کی تعلیم کے لئے رڑکی بھیجا۔

دادا اور دادی کو برابر ماہانہ معقول رقم اخراجات کے لئے تاحین حیات بھیجتے رہے اور دادا دادی کے انتقال کے بعد بھی رقم اپنے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق صاحب مرحوم کو بھیجتے تھے۔ ان کے صاحبزادے شیخ ممتاز حسین کو بلا کر اپنے پاس اورنگ آباد میں رکھا اور تعلیم دلائی اپنی مرحوم بہن کے لڑکے شیخ حامد حسین کو بھی ہمیشہ اپنے پاس رکھا اور ان کی کفالت کرتے رہے۔ اس کے علاوہ گھر کے تمام اخراجات اور اپنے بھائیوں کی ہر ضرورت ہمیشہ پوری کی۔ خاندان کے کتنے ہی لوگوں کی پرورش کی اور کتنے بچوں کو تعلیمی وظیفے دیئے اس کا حساب یا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

تایا ابا ہمیشہ سے بہت کم سخن اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے، طبیعت میں ظرافت ضرور تھی لیکن بلا ضرورت بات نہ کرتے تھے۔ ان کی سنجیدگی ، عمر اور پوزیشن کے اعتبار سے ان کے بھائی اور دیگر خاندان کے افراد ان کا بیحد ادب و لحاظ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ میرے سب سے بڑے تایا بھی مولوی صاحب کے سامنے آزادانہ گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ پورے خاندان میں میں ہی ایک ایسا تھا جو تایا ابا سے بہت بے تکلف تھا اور ہر قسم کی بات نہایت آزادانہ کر لیا کرتا تھا۔ ۱۹۴۹ء تک یعنی پاکستان آنے سے قبل مجھے ان کے ساتھ کچھ مدت تک رہنے کا اتفاق ہوا میں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے عزیزوں کو ایک طرف وہ غیروں کی امداد بھی دل کھولکر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غریب طلبا ، مساکین اور بیواؤں کی امداد کے لئے ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے میں چند مثالیں پیش کروں گا۔ جن سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ تایا ابا کو اپنے عزیز و اقارب کا کس درجہ خیال رہتا تھا۔

تایا ابا حیدرآباد میں ملازم تھے اور میرے والد بھوپال میں انجینئر تھے۔ اسی بھوپال میں تایا ابا کے احباب میں سر سید، راس مسعود، ڈاکٹر بجنوری اور جناب شعیب قریشی جیسی ہستیاں موجود تھیں یہ اصحاب وزارت اور دوسرے بڑے عہدوں پر مامور تھے۔ تایا ابا اکثر بھوپال آتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد سے دہلی اور شمالی ہند کے دوروں پر جاتے ہوئے بھی ہمیشہ گرانڈ ٹرنگ اکسپریس سے سفر کرتے تھے جو بھوپال ہی سے گذرتی ہے

طلاف تھا۔ میری بیوی کو قیمتی تحفہ بھی دیا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کردوں، نکاح کے بعد جب سہرے پڑھے گئے تو ایک صاحب بقاؔ پانی پتی کا سہرا بھی پڑھا گیا ان صاحب نے میرے سہرے میں حسب ذیل دو شعر بھی داخل کر دیئے تھے۔

مبارک ہو دولہا کے تایا کے سر پہ
فراست اور حسن لیاقت کا سہرا
حقیقت میں اس ہک حق کے سر پر
ہے اردو زبان کی اشاعت کا سہرا

مولوی صاحب نے فوراً کسی سے کہا کہ بھئی یہ سہرا محمود کا ہے یا میرا اور یہ کیا موقع تھا۔ میرے متعلق اِس طرح سے اشعار کو سہرے میں شامل کرنے کا۔ مجھے محمود کی شادی کی مبارکباد دیتے تو کچھ بات بنتی۔

اپنے بڑے بھائی اور بہنوں کی بیماری سکھ دکھ میں ہمیشہ شریک رہتے کیوں کہ ان لوگوں کی مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہی تمام تر اخراجات بھی خود ہی برداشت کرتے تھے اور ایسے کاموں سے خوش ہوا کرتے تھے۔

میں جب تک دلی میں پڑھتا رہا گھر سے جو معقول رقم اخراجات کے لئے آتی تھی۔ اس کے علاوہ ہمیشہ تایا ابا سے روپیہ وصول کرتا رہتا تھا اور ان کو کبھی ناگواری نہیں ہوئی۔ زمانہ تعلیم میں صرف اُن کی بدولت کالج میں میری ایک نمایاں پوزیشن رہی اور جہاں تک اخراجات کا سوال ہے یہی وہ وقت تھا جب مجھے جا اور بے جا خرچ کرنے کی عادت پڑی اور آج تک کبھی بھی پیسے کی محبت یا عزت میرے دل میں پیدا نہیں ہو سکی گو کہ بعد میں مجھے مالی پریشانیاں اور مختلف تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن میں خوش ہوں کہ پیسے اُن چیزوں میں سے نہیں جو مجھے عزیز ہیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں میں اپنی تایا زاد د شیخ ضیاء الحق صاحب مرحوم کی صاحبزادی، بہن کی شادی میں شرکت کرنے دہلی گیا۔ میرے ساتھ میری بیوی اور بڑی لڑکی نادرہ اقبال بھی تھیں۔ شادی کے بعد ہم لوگ تایا ابا کے گھر گئے میری لڑکی کی عمر اس وقت تقریباً ڈیڑھ سال کی تھی تایا ابا اس کو لے کر اپنی کوٹھی کے لان میں اس طرح کھیلتے پھر رہے تھے جیسے ایک بچہ دوسرے بچے کیساتھ کھیلے اس کو پھول توڑ کر دیتے تھے پھر پھول پھینک دیتے تھے۔ غرض کہ اس وقت وہ بابائے اردو علامہ ڈاکٹر عبدالحق نہیں تھے بلکہ تمام تر محبت اور ان جذبات کا مجسمہ تھے جو عام طور پر ایک اپنے دادا کے دل میں ایک پوتی کے لئے پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعد میں نادرہ نے ان کا نام "پھول والے ابا" ہی رکھدیا تھا۔ جب تایا ابا کا انتقال ہوا تو نادرہ کراچی ہی میں تھی۔ آخری دیدار کے وقت میرے والد نے اس کو یہی کہہ کر میت کا دیدار کرایا کہ لو اپنے پھول والے ابا کو آج اور دیکھ لو پھر کبھی نہ دیکھ سکوگی۔ خوش قسمت ہے۔ میرا چھوٹا بھائی مسعود اور میری اولاد کہ بیماری میں اخیر دم تک یہ لوگ تایا ابا کے پاس موجود تھے اور مسعود نے تو ان کی نہ صرف خدمت ہی کی بلکہ قبر میں اپنے ہاتھوں سے اُتارا بھی۔ میں بدقسمت ہوں کہ ۱۹۴۹ء کے بعد اُن کی شکل بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا اور اب کبھی بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔

میری یادداشت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ بھوپال آئے ہوں یا بھوپال سے گزرے ہوں اور انھوں نے مجھے یا میرے والد کو اطلاع نہ دی ہو۔ جب تک میرے والد بھوپال میں رہے۔ انھوں نے کبھی اپنے کسی وزیر دوست کے یہاں قیام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ریت گھاٹ پر ہمارے چھوٹے سے مکان میں ٹھہرا کرتے تھے اور اسی مکان کی چھوٹی سی بیٹھک میں بڑے بڑے آدمی اور وزیر ان سے ملنے آتے تھے، لوگ اصرار بھی کرتے جھگڑا بھی ہوتا لیکن مرحوم نے کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی کے علاوہ کسی اور کے بنگلے پر یا محل میں قیام فرمائیں۔ جب میرے والد کا تبادلہ سیہور ہوگیا تو پھر ضرور شعیب صاحب کے ہاں قیام کر لیا کرتے تھے، لیکن پھر بھی ہم لوگوں کو سیہور سے بلوا لیتے یا خود سیہور تشریف لے آتے تھے۔

میں ایک بار اُن کے پاس حیدرآباد گیا تھا جہاں بنجارہ ہل کی ایک کوٹھی میں ان کا قیام تھا۔ میں تقریباً پندرہ دن اُن کے پاس ٹھہرا۔ اس دوران میں انھوں نے میرے لیے نہایت قیمتی اور اعلیٰ کپڑے بنوائے۔ نقد روپیہ دیا بھوپال ... اس زمانے میں سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دلوایا اور چلتے وقت مجھے چھوڑنے خود اسٹیشن تک گئے۔ میں نے اپنی موٹر کے لئے جب ان سے کہا تو فوراً ایک چیک موٹر خریدنے کے لئے عنایت فرمایا۔ اس رقم سے میں نے جو میں موٹر خریدی جو ۱۹۵۰ء تک میرے پاس رہی۔

سیہور میں میرے والد ایک دفعہ بیمار ہوئے، اور بیماری نے طول پکڑا تب تایا ابا کو حیدرآباد میں اس کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے ایک معتمد خاص عبدالرحیم صاحب کو ایک بڑی رقم دے کر سیہور بھیجا کہ وہ میرے والد کے پاس رہیں۔ علاج و تیمارداری کا انتظام کریں اور روزانہ میرے والد کی حالت سے تایا ابا کو مطلع کرتے رہیں۔

دہلی سے بی۔ اے کرنے کے بعد میں ایم۔ اے کرنے علی گڑھ چلا گیا اور اردو ایم۔ اے میں داخلہ لیا ابھی میں پڑھ ہی رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ سیہور میں ایگزیکٹو آفیسر کی اسامی خالی ہوئی ہے۔ سیہور میرا مولد و مسکن ہے۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ سیہور ہی میں ملازمت مل جائے۔ اور اس کے لئے جدوجہد شروع کی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے دفعتاً مجھے خیال آیا کہ قاعدے اور ضابطے میں میری جدوجہد ناجائز اور نامناسب نہیں ہے۔ اب اگر تایا ابا کے ذریعے بھی کوشش کر لی جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔ لہٰذا میں فوراً دہلی کے لئے روانہ ہوگیا۔ صبح کا وقت تھا اور تایا ابا ناشتہ کے بعد دھوپ میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے — سلام کر کے میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ صرف ایک سوال مجھ سے کیا۔ "کیا میرے چلنے سے تیرا کام بن جائیگا" میں نے کہا "ضرور۔" "بس فوراً" اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سیکریٹری رفیق صاحب کو بلا کر کہا کہ میں آج ہی بھوپال جا رہا ہوں۔ سیٹ ریزرو کرا دی جائے، اسی دن شام کو میرے ساتھ بھوپال کے لئے روانہ ہوگئے۔ اب اس کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں کہ چھ مہینے کے بعد جب میں امتحان دے کر بھوپال آیا تو کچھ ہی دن بعد میرا تقرر حسب خواہش ہوگیا

میری شادی میں شروع سے اخیر تک برابر شریک رہے۔ حالانکہ ایسا کرنا ان کی طبیعت اور مزاج کے بالکل

۱۹۶۰ء میں میرے والد کراچی میں پھر سخت علیل ہوئے لیکن سب کو ہدایت کر دی کہ محمود کو اطلاع نہ دی جائے وہ خود بے حد پریشان ہے۔ میرا حال سنکر اور زیادہ گھبرا جائے گا۔ افاقہ نہ ہونے کی صورت میں مسعود نے خاموشی سے مجھے بھوپال اطلاع کر دی۔ میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ صرف تایا ابا کو تار دے دیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خود علیل تھے اور بغیر سہارے چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن میرا تار ملتے ہی بے چین ہو گئے اور دو آدمیوں کے سہارے پانچسو روپے لے کر موٹر میں میرے والد کے گھر پہونچے، روپیہ دیا، علاج کا معقول انتظام کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ والد صحت یاب ہو گئے۔

یہ اور ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو تایا ابا مرحوم کی فراخ دلی اپنے عزیز و اقارب کا خیال رکھنا اور ان کی امداد کرنے کی بین ثبوت ہیں لیکن مرحوم کا ایک خاص مشن تھا اور وہ ایک خاص نظریہ و اصول رکھتے تھے۔ مرحوم اس کے قائل نہ تھے کہ بلا ضرورت اور بلا وجہ وہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کریں۔ خواہ مخواہ لوگ انھیں پریشان کریں۔ نام و نمود اور شہرت سے انھیں نفرت تھی۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خواہ ان کا عزیز ہو یا غیر اگر کام نہیں کرتا ہے یا تعلیم سے اس کو دلچسپی نہیں ہے تو پھر وہ اس سے متنفر ہو جاتے تھے۔ بات کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے اور اپنے مشن اور مقصد کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ سب سے الگ رہ کر کام کریں۔ جس سے بعض کوتاہ فہم لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی تھی۔ ورنہ ان کے دل میں جذبات ہمدردی و محبت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ وہ جائز امداد کرنے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے اور سفارش کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن ایک آدمی کو باعزت زندگی گزارنے اور روزی کمانے کا اہل بنا دینے کے بعد پھر وہ اس کی امداد کرنا برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی انھیں دھوکہ دے کر ان سے فائدہ اٹھالے وہ چاہتے تھے کہ جب تم کام کے لائق ہو گئے ہو تو پھر خود کام کرو، جد و جہد کرو اور اپنی دنیا خود بناؤ۔ دوسروں کے سہارے جینا زندہ دل کا کام نہیں۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تایا ابا کو اس دنیائے فانی سے کوچ کئے تقریباً دو مہینے ہو چکے ہیں۔ دنیا کہتی ہے کہ بابائے اردو کبھی نہیں مر سکتے زندہ ہیں، اور زندہ رہیں گے ہر خیال اور ہر طبقے کے لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی خدمات، ایثار، قربانی کے پیش نظر ان کو زندہ جاوید ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بر اعظم ہند و پاکستان کے اور لوگوں کی طرح میں بھی اس رائے اور خیال سے متفق ہوں لیکن مولوی عبدالحق کا سب سے زیادہ چہیتا بھتیجا ہونے کی حیثیت سے میں قدرتی طور پر اس دل و دماغ سے نہیں سوچ سکتا جس

سے دوسرے سوچتے ہیں۔ میرے باپ کا عزیز ترین بھائی اُٹھ گیا، میرے تایا آبا ہمیشہ کے لیے مجھ سے جُدا ہوگئے۔ نُدرہ اب کس کو "پھول والے ابا" کہے گی اور ہم سب اپنے بدترین دَور میں کس کے برتے پہ ہر مصیبت اور تکلیف کو جھیل کر گزار دیں گے محض اس امید پر کہ خدا نے ہمیں ایک مستقل سہارا دے رکھا ہے جس کے پاس پہونچکر ہماری ہر مصیبت ختم ہو جائے گی۔

افسوس صد افسوس ہے کہ اپنے اعمال اور بدقسمتی کے ہاتھوں ایسا جکڑا ہوا ہوں کہ بیماری کی خبریں سنکر بھی ان کے پاس نہیں پہونچ سکا وہ ختم ہو گئے اور میری "آہ سحرگاہی اور فغانِ نیم شبی" کسی کام نہ آئیں

آج بھوپال میں ہزار میل دور بیٹھ کر خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ تایا آبا کی رُوح کو ابدی سکون عطا فرمائے اور ان کو بلند سے بلند مرتبہ دے۔

میرے آنسو کراچی نہیں پہنچ سکتے لیکن عالمِ تصوّر میں میں تایا آبا کی قبر پر کھڑا ہوں اور یہ میرے دل کی آواز ہے:۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو تیرا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور نومبر ۱۹۶۱ء)

ازکمالِ دلسوزی شمیم صبائی متھراوی

۸۱ ھ ۱۳

باباے اردو کی آخری پاکیزہ آرام گاہ	بیوم چہار شنبہ بوقت لازم نو بجے صبح
۸۱ ھ ۱۳	۸۱ ھ ۱۳
دلگداز حادثۂ انتقال عبدالحق	وہ کیوں نہ مالکِ خلدِ ابد ہوں بعد مرگ
۸۱ ھ ۱۳	۸۱ ھ ۱۳
صدر ایوان انجمن ترقی اردو پاکستان	گئی بخلد ادب زندگی عبدالحق
۸۱ ھ ۱۳	۸۱ ھ ۱۳
سوم ربیع اول محبوبِ سنہ تیرہ سو اکیاسی	کہا شمیمِ حزیں! سال رنج ہاتف نے
۸۱ ھ ۱۳	۸۱ ھ ۱۳
مطابق سولہ اگست موجودہ سنہ ایک ہزار نو سو اکسٹھ عیسوی	ہوئے خبیر ارم مولوی عبدالحق
۸۱ ھ ۱۳	۸۱ ھ ۱۳

رسالہ "ماہِ نو" کراچی۔ ماہ اکتوبر ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر عبادت بریلوی

بابائے اردو کی ادبی خدمات

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم ہمارے عظیم تہذیبی اور ثقافتی، لسانی اور ادبی رہنما تھے۔ ان کے کام کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ انہوں نے قومی زندگی کی مختلف شعبوں میں ایسی خدمات انجام دی ہیں جو برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے تابناک باب ہیں۔ مستقبل کا مورخ ان کے کارناموں کو ہمیشہ سنہری حروف میں لکھے گا اور وہ رہتی دنیا تک نئی نسلوں کے لئے شمع راہ کا کام کرتے رہیں گے۔ وہ ایک بہت بڑے ماہر لسان تھے۔ زبانوں کے مختلف پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ انہوں نے اردو زبان کے لئے ساری زندگی جہاد کیا، اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اردو کے سب سے بڑے مجاہد تھے۔ اس جہاد میں انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے جن کے نتیجے میں اردو زبان سرخ رو ہوئی۔ وہ بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔ انہوں نے اردو زبان اور ادب پر اعلیٰ پائے کا علمی اور تحقیقی کام کیا۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور انہوں نے تنقیدی ادب میں بھی قابل قدر اضافے کئے ہیں۔ وہ ایک تخلیقی فن کار تھے، اور ایک تخلیقی ادب کے علم بردار کی حیثیت سے بھی وہ ایک بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ غرض وہ زبان کے ایک پرخلوص خدمت گذار و ماہر لسان ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے صحیح مزاج داں، ایک اعلیٰ پائے کے عالم، ایک دقیقہ رس محقق اور ایک بلند مرتبہ تخلیقی فن کار تھے۔ یہ سب باتیں کسی ایک شخصیت میں ذرا مشکل ہی سے یک جا ہوتی ہیں بابائے اردو میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اور اسی اعتبار سے ان کی شخصیت ہماری قومی اور ادبی روایت میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

وہ نہ صرف قومی زندگی میں زبان کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کی مزاج دانی کا صحیح شعور بھی رکھتے تھے۔ الفاظ کی نباضی ان کے مزاج میں داخل تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو کی ادبی نثر کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا کیا جس کی مثال اس کی پوری تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ سادگی میں جیسا حسن انہوں نے پیدا کیا ہے ہمارے یہاں کوئی اور لکھنے والا پیدا نہیں کر سکا۔ نظم میں اس انداز کی جھلک صرف میر صاحب کی شاعری میں ملتی ہے۔ بابائے اردو کے اسلوب کا بھی اردو نثر میں وہی مرتبہ ہے جو نظم میں میر تقی میر کی شاعری کا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کا اسلوب سرسید اور حالی کی قائم کی ہوئی روایت کا ایک تسلسل ہے، لیکن بابائے اردو نے اس کو سنوارا اور نکھارا ہے اور نوک پلک سے درست کر کے ایک ترشے ہوئے ہیرے کی شکل دی ہے لیکن اس طرح کہ اس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ رنگین اور پرکار نہیں ہے اس میں تو زندگی اور جولانی صحت اور توانائی کا احساس ہوتا ہے اور اس میں یہ خصوصیات ان کے نظریے کی پختگی اور فکر کی استواری نے پیدا کی ہیں۔ اس میں اس تہذیب کا ابھرو ورا ہوا ہے، جس میں ان کی نشو و نما ہوئی تھی، اور جس کی روایت کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، اس لیے اس میں سادگی اور توانائی کے باوجود ایک لوچ اور بانکپن کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے مزاج کی باقاعدگی اور طبیعت کی پاکیزگی اس کے ایک ایک لفظ میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ اسی لیے وہ آئینے کی طرح صاف شفاف نظر آتا ہے۔ بعض لوگ الفاظ سے کھیلتے ہیں۔ انہیں نگینوں کی طرح جڑتے ہیں، تشبیہات اور استعارات سے رنگینی اور پرکاری کرتے ہیں، محاورات کو بڑی محنت سے سجاتے ہیں ـــــ لیکن ان سب باتوں سے اسلوب میں حسن پیدا نہیں ہوتا۔ اسلوب کا حسن تو خیال کی مناسبت سے الفاظ کی صحیح دروبست میں ہوتا ہے اور یہ خصوصیت بابائے اردو کے اسلوب نثر میں اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔

اسلوب نثر کے اثرات نئی نسل کے اسلوب نثر پر بہت گہرے اور ہمہ گیر ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ نئی نسل نے ان کی ادبی تحقیقات سے اثرات قبول کیے ہیں۔ انہوں نے قدیم اردو ادب پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس نے ادب کے مطالعے کے لیے صحیح فضا قائم کی ہے اور ادبی روایت سے دلچسپی کو بڑھایا ہے۔ انہوں نے قدیم ادب کا سراغ لگایا جس سے اردو ادب کی تاریخ کو کئی سو سال کا اضافہ ہوا۔ بابائے اردو نے صوفیائے کرام کے ادبی کارناموں پر گہری نظر ڈالی اور ان کی ادبی اہمیت کو واضح کیا انہوں نے قدیم شعرا کے دیوان پردۂ خفا سے نکالے اور ان کے کلام کو اردو دنیا سے روشناس کرایا۔ اردو شعرا کے تذکرے بڑی عرق ریزی سے فراہم کیے اور

جاں فشانی کے ساتھ ان کو مرتب کرکے شائع کیا ۔ کیا نیز داستانوں اور مثنویوں کو تلاش کیا اور ان کو عام کرنے کی کوشش کی ــــــ پھر ان سب پر مبسوط اور مفصل مقدمے لکھے، جو اردو ادب کے سنجیدہ طالب علموں، استادوں اور خاص طور پر محققوں اور نقادوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ شمع راہ کا کام کرتے رہیں گے۔ ان میں نہ صرف معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے بلکہ ادبی اور فنی اعتبار سے بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کا مطالعہ تخلیقی ادب کے مطالعے سے کچھ کم دلچسپ اور پر تکلف نہیں بڑی بات یہ ہے کہ عام محققوں کی طرح بابائے اردو نے ادبی تحقیق کو خشک نہیں بنایا ہے۔ انہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کیا کہ ادبی تحقیق صرف حوالے دینے اور حواشی لکھنے کا نام نہیں ہے، بلکہ شگفتگی اور شادابی کے ساتھ ادب اور ادبی روایت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنا اس کا مقصد ہے تاکہ ادب سے دلچسپی عام ہو اور اس کے مطالعے کا صحیح ماحول پیدا ہو۔ بابائے اردو نے اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر جتنا کام کیا ہے اور جس انداز میں کیا ہے اردو کی تحقیقی روایت میں کہیں اور اس کی مثال نہیں مل سکتی

ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کی ادبی تحقیق صرف تحقیق ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اس کو تنقید کے ساتھ ہم آہنگ کرکے ایک نہایت ہی جاندار اور توانا صنف ادب کی شکل دی ہے، ایک محقق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اردو ادب کے ایک بہت بڑے نقاد ہیں۔ انہوں نے نظریاتی اور عملی تنقید کے شاندار نمونے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے اپنے تحقیقی کارناموں پر جو مقدمے لکھے ہیں ان میں بھی اعلیٰ درجے کی تنقید موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بے شمار مضامین ایسے ہیں جو انہوں نے ادبی موضوعات پر لکھے ہیں اور جن میں تنقید کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ ان کے تبصرے جو وہ زندگی بھر اپنے رسالہ اردو میں لکھتے رہے، ان میں بھی نہایت بلند پایہ تنقید ملتی ہے۔ ان تبصروں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے اور ان میں سے بیشتر مستقل تنقیدی مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بابائے اردو کی تنقید ان کے وسیع مطالعے ان کے تاریخی، تہذیبی شعور، ان کے انسانی نقطۂ نظر ان کے رچے ہوئے جمالیاتی احساس اور نکھرے ہوئے ادبی ذوق کا عطر ہے۔ ان کے یہاں تجزیے کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ لیکن جچی تلی بے لاگ رائیں کچھ اس طرح ظاہر کی گئی ہیں کہ دل میں اتر جاتی ہیں، اور پڑھنے والا ان کو اپنے مزاج کا جزو بنا لینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور میں اردو تنقید نے بڑی ترقی کی ہے اور اس میں مختلف لکھنے والوں نے نئے نئے رنگ نکالے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کے یہاں بابائے اردو کی تنقید کا رنگ و آہنگ کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے۔

ادب کی دنیا میں عام طور پر دیکھا گیا ہے، کہ

(باقی صفحہ پر)

عبداللطیف اعظمی

مولانا عبدالحق

خطابات عام طور پر محض عزت افزائی اور حسن خدمت کے اعتراف کے لئے ہوتے ہیں لیکن بعض خطابات ایسے بھی ہوتے ہیں، جو نام اور شخصیت کا جزو ہو جاتے ہیں، اور ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ایسا ہی ہے، جیسے گوشت سے ناخن کو جدا کرنا۔ مولانا عبدالحق کے لئے بابائے اردو کا خطاب ایسے ہی خطابات میں سے ہے۔ مولانا واقعی فدائے اردو تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز ان کی کوششوں کا محور اور ان کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا، یعنی برصغیر میں اردو کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت۔ آخر عمر تک اسی تندہی اور جوش و خروش کے ساتھ اردو کی خدمت میں لگے رہے جس طرح عہد شباب میں شروع کیا تھا، یہاں تک کہ ۹۲ سال کی عمر میں بھی، جبکہ عام طور پر لوگ خانہ نشین ہو جاتے ہیں، مولانا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اردو کی خدمت کے لئے وقف تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ بابائے اردو کے علمی و ادبی کارنامے بہت شاندار ہیں ــــــ انہوں نے علمی، تحقیقی کتابیں لکھیں، قدیم و نایاب کتابوں کو ایڈٹ کیا اور ان پر مقدمے لکھے۔ تنقید و تحقیق کا معیار بلند کیا معیاری رسالے نکالے، غرض وہ سب کچھ کیا، جو ایک ادیب اور مصنف کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے، مگر ان کا اس سے کہیں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی ناساعد اور مخالف حالات میں اردو زبان کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں اس کو متعارف کیا۔ اگرچہ سیاسی حالات کی وجہ سے ہندوستان میں، جو اردو کا اصلی وطن ہے، اسے وہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا، جو اسے ملنا چاہئے تھا لیکن مولانا عبدالحق کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے، کہ پاکستان میں، جہاں اردو کے لئے حالات انتہائی ناسازگار تھے، اسے قومی زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

مولانا عبدالحق سنہ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے، اس وقت انجمن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے ماتحت تھی۔ اس

کے پہلے سکریٹری اردو کے نامور اور عظیم مصنف مولانا شبلی نعمانی تھے۔ موصوف کے لئے علی گڑھ کی سرزمین تنگ نہ ہوگئی ہوتی، تو شاید انجمن کی صورت کچھ اور ہی ہوتی مگر اس کی کوکھ سے اردو کی تحریک جنم لینے والی تھی، اس لئے مولانا عبدالحق جیسے پرجوش، اولالعزم، نڈر، مخلص اور ایثار پسند جوان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے اردو کی تحریک کو جس عزم و حوصلے کے ساتھ ملک کے ایک ایک کونے میں پہنچایا، وہ انہی کا حصہ تھا۔

اخلاص اور مقصد سے غیر معمولی لگاؤ نے مولانا کی طبیعت میں شدت اور مزاج میں کھرا پن پیدا کر دیا تھا وہ وقتی مصلحت اور مصالحت کے لئے کبھی مطالبے کی شدت میں کمی پیدا نہ کرتے۔ جو فیصلہ کر لیتے، اسے اٹل سمجھتے جو رائے قائم کر لیتے اس پر جم جاتے، حالات کا تقاضا چاہے کچھ ہو، وہ جس چیز کو اردو کے لئے مضر اور جس بات میں اردو کی حق تلفی سمجھتے، اس کے لئے زمانہ بھر سے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے، انہیں سیاست سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا، مگر اردو کے عشق نے ان کو ایک مخصوص سیاست سے وابستہ کر دیا تھا، یا کم از کم ایسا سمجھا جاتا تھا۔ اردو کے بہت سے مخلصوں نے انہیں نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کی، مطالبے میں اعتدال اور نرمی پیدا کرنے کی درخواست کی، مگر مولانا اسے اخلاص و محبت کی رسوائی اور عزم و ہمت کی بے عزتی سمجھتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ انجمن ترقی اردو بھی تقسیم ہوگئی۔

مولانا کو جامعہ ملیہ سے بہت گہرا اور پائیدار تعلق رہا ہے۔ اس کے اساسی ممبروں میں سے تھے، اپنے تصنیفی پروگراموں میں جامعہ کے استادوں سے مشورے اور [illegible] لیتے۔ انجمن کی مستند اور معیاری کتابوں میں سے بہت سی اساتذۂ جامعہ کی تصنیف یا ترجمہ ہیں۔ مولانا کے عظیم الشان کارناموں میں انگریزی اردو لغت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نہ صرف اس کے مترجمین میں ہیں بلکہ نظر ثانی کرنے والوں میں بھی ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں جب انجمن دہلی منتقل ہوئی تو جامعہ سے اس کا تعلق اور بڑھ گیا اور باوجود اس کے کہ مولانا کی شدت پسندی اور ان کی بے لچک رائے کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر مجیب صاحب پسند نہیں کرتے تھے، مگر انہوں نے اپنے مقدور بھر انجمن کے علمی کاموں میں مدد کی۔ بابائے اردو کے خدمات کے اعتراف میں سب سے پہلے جامعہ ملیہ نے ۱۹۴۰ء میں موصوف کی ستربھویں سالگرہ کے موقع پر رسالہ جوہر کا عبدالحق نمبر شائع کیا جس کی ترتیب و ادارت کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ اسی سلسلہ میں بابائے اردو سے بار بار ملنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

تقسیم وطن کے بعد مولانا پاکستان تشریف لے گئے اور کراچی میں انجمن ترقی اردو کی از سر نو تنظیم کی۔ گو وہاں ہندوستان سے بھی زیادہ مشکلات اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ حکومت پاکستان نے مولانا

کی توقع کے مطابق مالی اعانت نہیں کی، چناں چہ بابائے اردو کے دستِ راست اور انجمن کے جوائنٹ سکریٹری سید ہاشمی فرید آبادی صاحب لکھتے ہیں :-

"توقع یہ تھی کہ خود لیاقت علی خان صاحب عمارت کے لئے ۲ لاکھ یکمشت، سالانہ چالیس ہزار کی جو منظوری مخلوط حکومت کے زمانے میں دے آئے تھے، وہ اب پاکستان کے خزانے سے اجرا فرمائیں گے اور یہ نہیں تو کم سے کم ریاست حیدرآباد ہی کی سالانہ امداد بطور تلافی انجمن کو ملنے لگے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انجمن کے علمی کام اور اپنی قومی زبان کی ترقی کے لئے سرکار پاکستان پچیس ہزار سالانہ سے زیادہ روپیہ نہ دے سکی بانیِ پاکستان حضرت قائداعظم کی وفات کے بعد ملکی حالات نے جو رخ اختیار کیا اسے دیکھ کر یہ پچیس ہزار سالانہ کی امداد بھی بہت غنیمت اور قابلِ شکر گزاری ہے۔"

(پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو صفحہ ۲۰۳-۲۰۴)

حکومت سے توقع پوری نہیں ہوئی تو مولانا نے پاکستانیوں کی طرف توجہ کی، خاص طور پر جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبائے قدیم سے ان کو بڑی امیدیں تھیں۔ مگر جب انہوں نے اردو یونیورسٹی کی تجویز پیش کی، تو ان دونوں یونیورسٹیوں کے سپوتوں نے بھی کوئی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ خود بابائے اردو لکھتے ہیں :-

"اس مرتبہ میں نے اردو یونیورسٹی کی تجویز پیش کی، تو اس کی تائید میں کسی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آئی۔ مجھے سب سے زیادہ توقع عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق طلبائے سے تھی۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ لیکن افسوس ہے کہ کسی نے میری تائید نہ کی، اور اب تک اس جماعت نے اس اہم تجویز کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد دوسری جماعت جس سے مجھے بڑی توقع تھی، وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ہے، وہ بھی بالکل خاموش ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"ان حالات سے مجھے بہت مایوسی تھی لیکن جب ایک دوست نے مجھے یہ خبر سنائی کہ ہماری یونیورسٹیوں کے بعض فاضل پروفیسر جو اردو زبان و ادب کے رہنما اور اس کی تعلیم کا فرض انجام دیتے ہیں، اردو یونیورسٹی کی تجویز کے مخالف ہیں (ان میں سے ایک صاحب تو اخباری بیان بھی جاری کر چکے ہیں) تو مجھے بہت حیرت ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ اگر اب نہیں تو کچھ عرصہ بعد ضرور کامیابی ہوگی۔ بے اتفاقی ایسی مہم کے لئے بہت خطرناک ہوتی ہے۔ اگر ہم تفرقہ پیدا کریں، بجائے تکمیل

پمفلٹ اور کتابیں چھاپیں اور طرح طرح سے اپنے مقصد کی اشاعت کریں اور کوئی توجہ نہ کرے، تو ناکامی یقینی اور قطعی ہے، لیکن اگر مخالفت پر کچھ لوگ آمادہ ہو جائیں تو اس وقت کامیابی کی کچھ امید ہو جاتی ہے"

("قومی زبان" کراچی، بابت ۱۶ نومبر تا ۱۶ دسمبر ۶۱ء)

اس میں شبہ نہیں کہ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے بابائے اردو کے عزم و ارادہ میں ثبات پیدا ہوا اور ان کی تحریک میں جان پڑ گئی۔ چنانچہ پاکستان کے انتہائی ناسازگار اور نامناسب حالات میں انہیں بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔ ان میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ایک اردو کالج قائم ہو گیا جس میں ایم۔ اے تک جملہ مضامین کی انہی کتابوں کے تراجم یا اسی معیار کی اردو تالیف بہم پہنچائی گئی ہیں جیسی انگریزی درسیات پڑھائی جاتی ہیں"

اگرچہ بابائے اردو کا خیال ہے کہ "مخالفت بیدار کرتی ہے، عمل قوت کو ابھارتی ہے، اور انسان کے ان جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت درپردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی، اور تحریک سرسبز و کامیاب ہوگی" لیکن یہ خیال ہر موقع اور ہر حال میں صحیح نہیں ہے۔ مخالفتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ کام کرنے والے بددل ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی بالکل لاچار اور بے بس۔ چنانچہ بابائے اردو پر ایک دور ایسا بھی آیا جب وہ اپنے ذاتی کتب خانے سے محروم کر دیئے گئے اور اس انجمن کے قریب بھی نہیں جا سکتے تھے، جسے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ مولانا کے ایک قریبی واقف کار نے اس صورت حال کے بارے میں بہت محتاط لفظوں میں لکھا ہے:

"ان (مولوی صاحب) کو اس بڑھاپے میں جن شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور جن جن لوگوں نے ان کے ساتھ بے وفائی کی، ان کا خیال کرتے ہی دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں مولوی صاحب کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا گیا اور کیسے کیسے رکیک حملے نہیں کیے گئے"

(مجلس، مولوی عبدالحق نمبر، حیدرآباد، صفحہ ۲۴)

مگر جنرل ایوب خاں اور ان کی حکومت نے بڑی حد تک اس کی تلافی کی کہ اپنے غیر معمولی اختیارات سے کام لیکر بابائے اردو کو ان کے حقوق اور اختیارات واپس دلائے اور ہر طرح ان کی قدردانی اور ہمت افزائی کی۔ چنانچہ وہ پھر پوری دلجمعی اور صحت و اطمینان کے ساتھ اردو کی خدمت میں لگ گئے۔ آخر میں مرض موت کی حالت میں بابائے اردو کی جس طرح خدمت کی گئی اور جس شان سے علاج ہوا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

بابائے اردو سنہ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان کے ایک مردم خیز صوبہ یو۔پی میں پیدا ہوئے اور ۱۶ اگست سنہ ۱۹۶۱ء کو پاکستان کے ایک اہم شہر کراچی میں وفات پائی۔ ان کی یہ طویل زندگی عزم و ثبات، جوش و ولولہ، ایثار و قربانی کی ایک مسلسل اور شاندار کہانی ہے۔ ان کی شخصیت موجودہ اور آئندہ نسلوں میں عزم و حوصلہ پیدا کرے گی اور قومی خدمت کا بیڑا اٹھانے والوں کے لئے شمع راہ کا کام دے گی۔

(جامعہ، دہلی، ستمبر ۱۹۶۱ء)

نصر اللہ خان

چراغِ انجمن افروز

مولوی صاحب کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں۔ ایک پر نظر ڈالو تو دوسرا اُبھر آتا ہے، پھر تیسرا اور اس طرح کئی پہلو نظر کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اب کس کا ذکر کرو اور کس پر قلم اٹھاؤ۔

سچ تو یہ ہے کہ ایسی پہلودار شخصیت کا ذکر اذکار کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو دوسرے پہلو سے اتنا مختلف ہے کہ یہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ ایک ہی شخصیت کے الگ الگ رنگ ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ مولوی صاحب کا مزاج اور ان کا طریقۂ فکر و خیال ان کی زندگی کے ہر پہلو میں غالب نظر آتا ہے اور اسی قدر مشترک سے مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ایک ربط قائم ہوتا ہے۔

بعض لوگ مولوی صاحب کی شخصیت کو "مجموعۂ اضداد" سمجھتے ہیں۔ یہ بات غلط ہے اور سطح پر سوچنے اور مولوی صاحب کو نہ سمجھنے، ان کی گہرائی تک نہ پہنچنے کا نتیجہ ہے اگر یہ بات ٹھیک ہوتی تو وہ زندگی بھر بل کھاتے رہتے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار کتابیں لکھ ڈالتے لیکن انہوں نے ایک پوری جماعت کے تعاون کے ساتھ اور ایک پوری قوم کی حمایت حاصل کر کے جو بڑی بڑی علمی و لسانی مہمیں سر کی ہیں وہ نہ کر پاتے۔

جس شخصیت میں رہنما بننے اور مقبولِ عوام ہونے کی صلاحیت ہو وہ "مجموعۂ اضداد" کیوں کر ہو سکتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کا اجمالی منظر ان کی زندگی میں نظروں سے اوجھل رہا ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا مولوی صاحب کے کردار کے یہ مبہم نقوش واضح ہوتے رہیں گے۔ مولوی صاحب کی زندگی کا مطالعہ پوری ایک صدی کا مطالعہ ہے۔

اس صدی کی تمام علمی و ادبی، سیاسی و ثقافتی لسانی اور تہذیبی حالات و تحریکات کا مطالعہ ہے۔

اس مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی شخصیت اس صدی کے حالات سے کس حد تک متاثر ہوتی رہی اس نے کون کون سے اثرات کس حد تک قبول کئے؟۔ اور پھر خود مولوی صاحب کا ردعمل کیا رہا اور انہوں نے عصر حاضر پر اپنا کیا اثر چھوڑا۔ اتنا بڑا کام ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ اس عظیم کام کو تو ایک ادارہ ہی کر سکتا ہے اور اس کے لئے ایک طویل مدت چاہیے۔

اگر سید احمد خان کو ہندوستان کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آفتاب کہا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولوی عبدالحق کی شخصیت اسی آفتاب کی ایک زندہ کرن تھی جو ایک صدی تک ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و ادبی و معاشرتی زندگی کو منور کرتی رہی۔ سید احمد خان کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے عبدالحق نے اپنی انفرادیت کو اس تحریک میں ایسا سمویا کہ وہ خود اس تحریک کا ایک جزو بن گئے۔ اور ان کی اپنی انفرادی زندگی۔ اپنے تمام فطری تقاضوں کے ساتھ ختم ہو گئی۔ مقصد کے جنون کی ایسی مثال شاید دنیا کی تاریخ میں کوئی دوسری نہ مل سکے سید احمد خان کا یہ مخلص پیرو اپنے محبوب رہنما کے ہر رنگ میں رنگ گیا۔ سر سید کی زندگی اور ان کے مقاصد عبدالحق کی زندگی اور عبدالحق کی زندگی کے مقاصد بن گئے، اور اس طرح عبدالحق کی شخصیت میں سید احمد خان (یا ان کی تحریک) ایک صدی تک زندہ رہی۔ اس کے بعد عبدالحق کے کارناموں نے اس تحریک کو زندگی جاوید بخشی۔

اس ایک صدی میں مولوی صاحب نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے اس کے لئے بہت وقت اور کاوش کی ضرورت ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ کام ایک ادارہ ہی کر سکتا ہے اور اس کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو مخطوطات اور نادر تذکروں کی اشاعت سے اردو زبان کی عمر میں کئی سو سال کا اضافہ کیا۔ مولوی صاحب نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اردو شاعری کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب انگریزی شاعری کا ابوالآبا چاسر پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کی ابتدائی شاعری کے نمونے دسویں اور گیارھویں صدی میں بھی ملتے ہیں۔ ہمارے مورخین ادب نے ولی کو اردو شاعری کا چاسر کہا ہے اور دکنی اسکول کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ مولوی صاحب نے بڑی تلاش و تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ ولی، دکنی اسکول کا پہلا نہیں بلکہ آخری اہم شاعر تھا۔ اس طرح تاریخ ادب کی بے شمار کڑیاں جو نظروں سے اوجھل تھیں۔ مولوی صاحب نے بڑی محنت اور تلاش سے ان کا کھوج نکالا اور یہ انہی کی محنت کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں تاریخ ادب اردو میں ایک ربط اور تسلسل نظر آتا ہے اور ہماری زبان کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ ہوا۔

مولوی صاحب اپنے تنقیدات و مقدمات میں • جہاں اپنی ذاتی اپج سے کام لیتے ہیں اور اپنی انفرادیت

کا رنگ دکھاتے ہیں (یعنی جہاں خود عبدالحق بولتا ہے اور اپنی ذاتی رائے دیتا ہے) وہاں بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کاش مولوی صاحب تحقیق و تنقید کا بندھا ٹکا کام نہ کرتے اور صرف تخلیقی ادب پیدا کرتے، تو اردو زبان کے ادیبوں میں ایک بے مثل ادیب کا اور اردو زبان کے سرمائے میں گراں مایہ تصانیف کا اضافہ ہوتا۔ مولوی صاحب کے دل میں بھی کبھی کبھی یہ ہوک ضرور اٹھی ہوگی لیکن جب انہیں اردو ادب کی ناچاری و کم مائیگی کا احساس ہوا ہوگا تو انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دینا ہی بہتر سمجھا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنے میں اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔

بڑے آدمی میں سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ ان لوگوں کو جن میں بڑا بننے کی صلاحیتیں ہوں بڑا بنا دیتا ہے۔ یہ وصف سید احمد خان میں موجود تھا۔ نذیر احمد، شبلی، حالی علم کے ایسے چشمے تھے جو عام نظروں سے اوجھل رہتے۔ سید احمد خان نے انہیں ڈھونڈھ نکالا، اور ان کے علم کے پانی سے علی گڑھ کی تحریک کو سیراب کیا۔ اور پھر انہیں اپنی قوم کے لئے چشمۂ فیض بنا دیا کہ آج تک ان کے کارہائے گراں مایہ سے ایک فیض جاری ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنے زمانے میں بڑے بڑے ادیبوں اور ان کے گراں مایہ علمی و ادبی کارناموں سے دنیائے ادب کو روشناس کرایا۔ مولوی ظفر علی خان۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی، سلیم پانی پتی، مولانا محمود شیرانی، کیفی، دتاتریہ اور ایسے بے شمار اعلیٰ پائے کے مصنفین سے مولوی صاحب نے بڑے بڑے کام لئے اور انہیں اس قابل بنایا کہ علم و ادب کی دنیا میں انہوں نے اپنے لئے ایک بڑا مقام پیدا کیا، اور ادب کے سرمایہ میں بھی بہت بڑا اضافہ کیا۔

مولوی صاحب کا قد درمیانہ تھا۔ چندیا بالوں سے خالی، حواشی میں تھوڑے سے سفید یک مشت، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ اور روشن جن میں ذہانت اور گہرائی نظر آتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی کیفیت ہر وقت دکھائی دیتی تھی۔ وہ بلا کے حاضر جواب اور ضلع جگت میں مشاق تھے۔ بچوں کی طرح معصوم شرارتیں آخری دم تک کرتے رہے۔ اسپتال میں جو نرس دوا پلانے آتی تھی اسے مس روح افزا کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے منہ سے مشکل ہی سے کوئی بات ایسی نکلتی جس میں ایک لطیف سا مزاح یا ایک ہلکا سا طنز نہ ہوتا۔ ان کے مزاج میں جمال بھی تھا اور جلال بھی۔ لیکن ان دونوں کا توازن اکثر بگڑتا رہتا تھا۔ مولوی صاحب بگڑ جاتے تو منائے نہ منتے اور کسی کے ہو جاتے تو کبھی اس پر خفا نہ ہوتے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ خفا ہوتے تو بات ہلکی سی ڈانٹ ڈپٹ سے شروع ہوتی اور جیسے جیسے مزاج کا پارا چڑھتا جاتا الفاظ میں بھی تندی اور تیزی بڑھتی جاتی۔ یہاں تک کہ بے چارا سننے والا اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا اور شرم سے آنکھیں جھکا لیتا۔

مولوی صاحب اونچا سنتے تھے لیکن اردو یا انجمن کی بات

ہوتی تو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ سن لیتے۔ جیسے اونچا سننے کی تکلیف تھوڑی دیر کے لئے رفع ہو گئی ہے یا جیسے مولوی صاحب کے کان صرف اردو یا انجمن ہی کا ذکر سن سکتے ہیں اور باقی سب چیزوں کے لئے بہرے ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے مقصد کی بات دل کے کانوں سے سنا کرتے ہیں۔ جب کوئی بات مولوی صاحب کے مطلب کی نہ ہوتی تو اونچا سننے میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا اور جب کسی کی بات سننا پسند نہ کرتے تو اس غریب کا چیخو چیخا کر گلا بٹھا دیتے۔ آخری عمر میں تو ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ آپ کی طرح سب کو بہرا سمجھنے لگے تھے۔ کوئی ملنے آتا تو وہ مشفق خواجہ سے اونچی آواز میں کہتے "اس سے کہو کہ جائے" اگر وہ کوئی بات پوچھتا تو کہتے "یہ کیا بک رہا ہے؟"

مولوی صاحب کا چہرہ کتابی تھا اور رنگ گندمی، ان کا لباس اُجلا اور رتی جیسا، وہ رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ پاجامہ علی گڑھی۔ البتہ شیروانی علی گڑھی اور حیدر آبادی شیروانی کے درمیانی وضع قطع کی ہوتی۔ پاؤں میں کبھی سیاہ اور کبھی بادامی پمپ۔

مولوی صاحب بڑے نفیس الطبع تھے۔ بڑی نفاست سے کھانا کھاتے تھے۔ ان کی خوراک دو چپاتیوں سے زیادہ نہ تھی وہ بکری کا شوربہ یا پرندوں کا شوربہ کھاتے تھے۔ مولوی صاحب حقہ بڑے اہتمام سے پیتے تھے، اور بڑے مزے لے لے کے پیتے تھے۔

سہ پہر کو ان کی میز پر چائے کے ساتھ بسکٹ اور خشک میوہ ضرور ہوتا۔ اگر کوئی کھانے پینے میں ذرا سی بے قاعدگی برتتا تو مولوی صاحب بگڑ جاتے اور بے نقط سناتے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کھانے کے بعد سالن بھری انگلیاں چاٹ رہے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی دسوں انگلیاں آگے بڑھا دیں اور کہا "لیجیے شوق فرمائیے" اسی طرح ایک بزرگ کھانے کے بعد اپنی ریش مبارک سے ہاتھ پونچھ رہے تھے۔ مولوی صاحب نے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اپنے ہاتھ آپ کی داڑھی سے پونچھ لوں" ایک مرتبہ مولوی صاحب کے ہاں چائے پر ایک لندن پلٹ افسر تشریف لائے وہ چائے میں بسکٹ گھول کر کھانا ہی چاہتے تھے کہ مولوی صاحب برس پڑے چائے کی میز سے الگ ہو گئے اور فرمانے لگے "اس طرح چائے پینے سے نہ چائے کا مزا آتا ہے اور نہ بسکٹ کا آپ لندن سے کیا یہی تمیز سیکھ کر آئے ہیں؟ آپ نے اپنی اس بدتمیزی اور گھناؤنی حرکت سے ہمارا مزا بھی کرکرا کیا"

مولوی صاحب کو کھانوں میں سب سے زیادہ جو کھانا ناپسند تھا وہ کھچڑا تھا وہ اسے کیچڑا کہا کرتے تھے اور کہتے تھے نہ جانے کس کم بخت نے اسے ایجاد کیا ہے؟

مولوی صاحب ایلوپیتھی کے طریقہ علاج کے بہت خلاف تھے۔ فرماتے تھے کہ ایلوپیتھی کی دواؤں سے اصل مرض تو چلا جاتا ہے لیکن اپنا قائم مقام ایک اور مرض چھوڑ جاتا ہے اب اس کا علاج کیجیے اور پھر اس کے علاج سے پیدا ہونے والے مرض کا علاج کیجیے اور اس طرح زندگی

پھر ایلوپیتھی کے چکر میں پھنسے رہتے۔

مولوی صاحب یونانی حکیموں کی چھان پھٹک اور قدحوں سے نالاں تھے۔ ہومیوپیتھی کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ طریقۂ علاج پرانے زمانے کی جھاڑ پھونک کا بدل ہے اگر ان کا علاج معالجہ ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ بے علاج مرتے اور بقول مولانا رشید احمد صدیقی "ذرا بے قاعدہ مرتے"۔

مولوی صاحب موسیقی کے بڑے رسیا تھے کہتے تھے میں جب سے پاکستان آیا، میں نے اچھا گانا نہیں سنا ریڈیو کی چیخم دھاڑ سے میرا ناک میں دم آگیا۔ نہ جانے ہمارے ملک میں کس قسم کی موسیقی رواج پا رہی ہے۔ مولوی صاحب کلاسیکی موسیقی بہت شوق سے سنتے تھے۔ میں دو چار بار امراؤ بندو خان کو اپنے ساتھ مولوی صاحب کے ہاں لے گیا۔ امراؤ خان سے انہیں کلاسیکی موسیقی سنوائی۔ وہ راگ درباری بڑے شوق سے سنتے تھے۔ وہ امراؤ خان کو دعائیں دیتے تھے اور کہتے تھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میری روح کو موسیقی سے بالیدگی ملتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے بہت اونچی سطح پر پہنچ جاتا ہوں۔ ایک دفعہ امراؤ بندو خان نے ایک شرابی کی لڑکھڑائی ہوئی آواز میں میر کی غزل ع

"یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں"

سنائی۔ مولوی صاحب نے بہت لطف اٹھایا اور کہا کہ اگر اس وقت میر صاحب ہوتے اور تم سے اس ادا سے اپنی غزل سنتے تو اگر انہوں نے زندگی بھر شراب نہ پی ہوتی تو اس غزل کو سننے کے بعد ضرور پینے لگتے۔

مولوی صاحب اچھی موسیقی سننے کے لئے فلم بھی دیکھ لیا کرتے تھے فلموں میں انہیں "راج ترنگ" بہت پسند تھی اور پسند کی وجہ اس کے کلاسیکی گانے تھے جن کی دھنیں استاد جھنڈے خان نے ایک ہی راگ میں باندھی تھیں۔

مولوی صاحب کہتے تھے کہ جن لوگوں کو دنیا میں بڑے کام کرنے ہیں انہیں شادی ہرگز نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ شادی سے انسان میں خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے وہ گھر بار کے چکر میں ایسا پھنستا ہے کہ تن من دھن سے کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔

مولوی صاحب فرماتے تھے جو لوگ تخلیقی کام نہیں کر سکتے وہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ پھر ایک دو نہیں کئی درجن وہ کہتے تھے کہ جب میں مہاجروں کی جھگی کے پاس سے گذرتا ہوں تو دو چیزوں کی افراط پاتا ہوں، ایک تو کتے اور دوسرے ننگ دھڑنگ گرد میں کلبلاتے ہوئے بچے۔ میرا بس چلے تو ان تمام لوگوں کا جن کی آمدنیاں قلیل ہیں آپریشن کروا کر ان کی نسل ختم کر دوں۔

مشہور انگریزی ڈرامہ نویس برنارڈ شا اور مولوی عبدالحق میں افتاد طبع اور طریقۂ فکر کے اعتبار سے بہت مشابہت پائی جاتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ برنارڈ شا کی تحریروں میں جگہ جگہ نئی منطق، نرالی اور چونکا دینے والی باتیں ملتی ہیں اور مولوی عبدالحق کی گفتگو اور ان کے اظہار افکار اور اعمال میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، کیوں کہ ہمارے ملک میں بے شمار تہذیبی اور معاشرتی پابندیاں ہیں اس لئے مولوی صاحب نے اپنی زندگی

کی بہت سی باتوں یا اپنی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔

مولوی صاحب کو اپنے خلاف پراپگنڈے کرنے والے کا بہت شوق تھا۔ ان کی جتنی زیادہ مخالفت ہوتی وہ اتنا ہی زیادہ خوش ہوتے کوئی ان پر اتہام لگاتا تو وہ اور زیادہ خوش ہوتے۔ بلکہ ان کے دیرینہ رفیقوں کا تو یہ کہنا ہے کہ انہیں رسوائی میں مزا آتا۔ وہ بڑے شوق سے رسوا ہونے کے سامان کرتے تھے، اپنے مخصوص دوستوں سے کہتے کہ تم بھی یہی چرچا کرو۔

میں نے کئی بار ریڈیو پر مولوی صاحب کی تقریریں نشر کروائیں اور ان تقریروں کے ریکارڈ بھی تیار کروائے جب اسٹوڈیو میں سرخ بتی روشن ہوتی اور میں مولوی صاحب کو اشارا کرتا تو وہ اونچی آواز میں کہتے "کیا شروع کردوں؟" اور اس طرح ان کی یہ بات بھی نشر ہو جاتی۔ مولوی صاحب سہج سہج تقریر کرتے ان کی زبان ریڈیو کی ضروریات کے مطابق ہوتی۔ سادہ الفاظ، چھوٹے چھوٹے جملے۔ سریع الفہم خیال۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب غالب پر تقریر کر رہے تھے، ایک جگہ میرن صاحب کا ذکر آگیا۔ میرن صاحب کو مرزا سے بے پناہ عقیدت تھی کسی نے میرن صاحب کے سامنے غالب کا شعر غلط پڑھا، فرمانے لگے۔ میاں یہ کوئی قرآن و حدیث ہے، جیسے چاہا پڑھ دیا" جب مولوی صاحب کے مسودے میں یہ جملہ حفیظ ہوشیارپوری کی نظر سے گزرا تو انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ اگر اس جملے کو نکال دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ مولوی صاحب نے کہا۔ میں تقریر نہیں کروں گا۔ حفیظ صاحب خاموش ہو گئے۔ تقریر نشر ہو گئی۔ ان دنوں ریڈیو کی نشریات پر بڑی کڑی نکتہ چینیاں ہوتی تھیں۔ دوسرے دن بخاری صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے مولوی صاحب کی تقریر کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اس تقریر کا میرن صاحب والا حصہ تو مجھے بہت ہی پسند آیا۔

بچوں کے پروگرام میں کسی بچے نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ انہیں بچپن میں کون سا کھیل پسند تھا مولوی صاحب نے کہا تو یوں تو بچپن میں انہوں نے گیڑیاں اور گلی ڈنڈا بھی کھیلا ہے لیکن وہ کھلنڈرے نہیں تھے وہ بچپن سے غور و فکر کرنے کے عادی تھے یہی وجہ ہے کہ سید احمد خاں انہیں عبدالحق فلسفی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

ایک بچے نے مولوی صاحب سے پوچھا "کیا آپ بچپن میں شرارت بھی کرتے تھے"؟ اس سوال پر مولوی صاحب کی آنکھوں میں چمک سی آگئی انہوں نے اپنے بچپن کی شرارتوں کے بہت سے واقعات سنائے۔

مولوی صاحب کی شوخیاں بڑھاپے تک ان کے دم کے ساتھ رہیں۔

حیدرآباد دکن میں ایک وزیر تھے۔ مولوی صاحب انہیں بہت ستایا کرتے تھے۔ ان کے ایک ملازم لڑکے کو پیسے دیتے اور کہتے کہ بیت الخلا کے لوٹے کی ٹونٹی میں جامن کی گٹھلیاں پھنسا دے جب وزارت مآب بیت الخلا میں جاتے اور آب دست کرنے کی نوبت آتی تو لوٹے کی

منھ سے پانی نہ نکلتا تب تو وہ کہرام مچا دیتے۔ کبھی بیگم کو آواز دیتے کبھی نوکر پر چلاتے۔ مولوی صاحب قریب ہی رہتے تھے وہ ان کی چیخ پکار سن کر خوب ہنستے اور مزے لیتے۔

حیدرآباد دکن میں مولوی صاحب کے ایک دوست تھے جو بہت حسین تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی کی۔ کل پچاس افراد کو دعوت دی۔ مولوی صاحب اور ان کے رفقاء کے نام فہرست میں شامل نہ تھے۔ مولوی صاحب نے کسی ترکیب سے دعوتی رقعہ حاصل کر لیا اور اسی وضع قطع اور اسی نفس مضمون کے ڈھائی سو رقعے اور چھپوائے اور ڈھائی سو افراد کو مع اہلِ خاندان بلوا بھیجا۔ چنانچہ دلہن کے گھر بے شمار مہمان جا پہنچے۔ صاحب خانہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ شہر کے تمام ہوٹلوں سے مہنگے داموں پر کھانا منگوایا گیا۔ جب دلہن رخصت ہوئی اور مہمان بھی چلے گئے تو صاحب خانہ نے اپنے صاحبزادہ بلند اقبال کی مزاج پرسی کی۔ جن کے ذمے دعوتی رقعوں کو چھپوانے اور بانٹنے کا کام سونپا گیا تھا۔ اب وہ غریب ہر طرح اپنی صفائی پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اسے خبر نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا لیکن پدر بزرگوار ہیں کہ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ بہت دنوں بعد انہیں پتہ چلا کہ یہ سب کارستانی ان کے دوست مولوی عبدالحق صاحب کی تھی۔ دونوں میں خوب چلی۔ ایسی چھیڑوں میں مولوی صاحب کو بہت مزا آتا تھا۔ اور اکثر ایسی چھیڑوں کے لئے وہ سامان بھی پیدا کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کی طبیعت بہت مشکل پسند تھی۔ انہیں پرسکون زندگی سے نفرت تھی۔ وہ ہر آن ایک نیا ہنگامہ چاہتے تھے۔ علمی و ادبی ہنگامے آپسی تعلقات میں ہنگامے، کشیدگی، کھنچاؤ اور پھر میل ملاپ، خوف اور ڈر سے وہ واقف نہ تھے۔ طوفان اور زلزلے آتے تو خوب مزے لیتے۔ پانی میں کشتی ڈولتی تو وہ قہقہے لگاتے وہ موت کی ہنسی اُڑاتے تھے۔ ہر وقت مرنے کو تیار رہتے۔

مولوی صاحب کے ایک شاگرد رشید جن سے بعد میں ان کا دوستانہ ہو گیا تھا۔ ان کا نام نواب منظور جنگ بہادر تھا۔ نواب صاحب نے اپنے صاحبزادے کو ہوائی جہاز خرید کر دیا۔ صاحبزادے نے اسے ایک درخت سے دے مارا، جان بچ گئی، ہوائی جہاز پاش پاش ہوا نواب صاحب نے دوسرا جہاز خرید کر دیا۔ اب صاحبزادے کی یہ خواہش ہوئی کہ ان کے ابّا جان ان کے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھیں اور ان کی ہوابازی کے کمالات دیکھیں۔ ایسی حالت میں جب نواب صاحب برخوردار سعادت آثار کی ہوائی اڑان کی مہارت کا ایک نظارہ دیکھ ہی چکے تھے وہ کس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے، جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ صاحبزادے بہت افسردہ ہو رہے ہیں وہ بغیر کسی خوف و خطر کے ہوائی جہاز میں جا بیٹھے۔

نواب منظور جنگ بہادر سے مولوی صاحب کو بہت محبت تھی۔ انہیں اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ نواب صاحب لوہارو کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے (سید ہاشمی فرید آبادی، جمیل الدین عالی، اور آمنہ ممتاز ان کے قریبی رشتہ دار ہیں، نواب صاحب کی ایک صاحبزادی مہرالنساء ناظم آباد

کراچی میں مقیم ہیں) نواب مولوی صاحب کو بہت ستاتے تھے اور چھیڑتے تھے، مولوی صاحب کو اس چھیڑ چھاڑ سے بہت مزا آتا تھا۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصے پہلے حیدرآباد دکن میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا ان کی صاحب زادی منیر بانو کراچی آگئیں۔ مولوی صاحب منیر بانو کو مثل اپنی اولاد کے سمجھتے تھے اکثر ان کے ہاں جاتے اور گھنٹوں بیٹھا کرتے اور پرانے قصے سنتے سناتے۔

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب منصور یار جنگ بقید حیات اور حیدرآباد سندھ میں مقیم ہیں مولوی صاحب کی ان سے خط و کتابت آخری دم تک جاری رہی۔

مولوی صاحب بڑے وضع دار آدمی تھے لیکن لڑنا بھڑنا اور تھوڑے عرصے کے لئے تعلقات منقطع کرکے پھر آملنا یہ بھی ان کی وضع داری میں شامل تھا۔ مولوی صاحب کے انتقال پر نواب صاحب کے خاندان کے افراد کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے مولوی صاحب کی میت اسی گھر سے اٹھی ہے اور جیسے نواب منظور جنگ کے بعد وہی اس گھر کے سربراہ تھے۔

مولوی صاحب کا اپنا کوئی گھر نہ تھا لیکن ہر گھر میں ان کا ماتم ہوا۔ مولوی صاحب کے دوست کم تھے اور دشمن زیادہ لیکن ان کی موت نے ان کے دشمنوں کو ان کا دوست بنا دیا اور دوستوں سے زیادہ ان کے دشمنوں نے ان کا غم کیا بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے لڑنے بھڑنے اور ان کی مخالفت کرنے میں دوستی کا مزا آتا ہے مولوی صاحب کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔ ان سے لڑنا بہت معمولی بات تھی۔ جب جی چاہے لڑلو لیکن ان کو منانا اس سے بھی آسان تھا۔ اردو کے حق میں کوئی بیان دے دو۔ انجمن کے لئے تھوڑا سا کام کردو بس اتنی ہی بات پر مولوی صاحب اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کردیا کرتے تھے۔

مولوی صاحب کی ادبی خدمات کے علاوہ ان کی تعلیمی خدمات بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ وہ استاد۔ صدر مدرس انسپکٹر مدارس اور کالج کے پرنسپل کے عہدوں پر کام کرچکے تھے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام میں مولوی صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔

مولوی صاحب اردو یونی ورسٹی کے نام سے پاکستان میں ایک یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی مولوی صاحب کے اس خیال کی پہلی کامیاب شکل تھی، جس کے قیام سے یہ ثابت ہوچکا تھا کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بناکر اعلیٰ پائے کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ مولوی صاحب کی نگرانی میں اور ان کی ذاتی کوشش سے عثمانیہ یونی ورسٹی کے نصاب کی تمام کتابیں دو سال کی قلیل مدت میں چھپ چھپاکر تیار ہوگئی تھیں۔

آخری عمر تک مولوی صاحب کے کمزور جسم میں عمل کے طوفان متحرک رہے۔ بستر علالت پر بھی ان کے عزائم اور حوصلوں میں بڑی جان تھی۔

اس تاجرانہ ذہنیت کے زمانے میں شاید اب کوئی عبدالحق پیدا نہ ہو جو اپنے مقصد کی لگن میں اپنے مقصد پر اپنا سب کچھ قربان کردے۔ مولوی صاحب نے کبھی

انجمن سے اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ اور نہ اپنی تصانیف کی کوئی رائلٹی قبول کی۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنے پاس سے انجمن کو ہزاروں روپیہ دیا۔

مولوی صاحب نے انجمن کو اپنی آنکھوں کی روشنی دی۔ اپنی ہڈیوں کا گودا، اپنے دماغ کی قوت اپنے جسم کی طاقت اور ان ہزاروں قیمتی نایاب قلمی نسخوں اور تصانیف کا خزانہ دیا جو انہوں نے بڑی جانکاہی اور محنت سے برصغیر کے کونوں کھدروں سے ڈھونڈ نکالا تھا اور جس کے بل بوتے پر اردو ادب کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ ہوا۔

اب انجمن ترقی اردو مولوی عبدالحق کی حیات ثانیہ ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے لئے مولوی عبدالحق کا قائم کردہ مینارۂ نور و ہدایت، ملک اور قوم کے لئے مولوی صاحب کا ایک جاوداں تحفہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تحفے کے عوض قوم اپنے اس محسن اعظم کو کیا دیتی ہے۔

جس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولوی صاحب نے اپنی جان دی ہے اس مقصد کو پورا کرنا اب قوم کا کام ہے بس یہی بہترین خراج عقیدت ہے مولوی صاحب کی خدمات کا سب سے بڑا معاوضہ۔

ماہنامہ "ہم قلم" کراچی

ستمبر ۱۹۶۱ء

بقیہ

عظمت کا نوحہ

بسلسلہ صفحہ (۸۱)

مقالات انجمن سے شائع کئے، اسی ذیل میں شمالی ہند کی نثری داستانیں، جلال لکھنوی اور رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اپنی جگہ اردو کی یہ بہت بڑی خدمت ہے، ورنہ کتنے ہی تاج محل ایسے ہیں جنہیں کیڑے چاٹ گئے اور آج کوئی ان کا نام لیوا نہیں۔

رشید احمد صدیقی نے کہا ہے "مجھ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا غالب، اردو اور تاج محل!" بابائے اردو "ہندوستان کی تہذیبی پیداوار" ہیں اور انہوں نے اس "تہذیبی پیداوار" میں حصہ بھی لیا ہے۔ ان میں جدید و قدیم ہندوستان کے "صوری و معنوی امتیازات جھلکتے ہیں"۔ اس لئے میں اس فہرست میں بابائے اردو کا بصد احترام اضافہ کروں گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!

ظہیر بابر

ایک محترم شخصیت

زندگی میں ایسی شخصیتیں شاذ ہی ملتی ہیں جن کا احترام اختلافات سے متاثر نہیں ہوتا وہ احترام طلب نہیں کرتیں، احترام کرنا سکھاتی ہیں۔ ان کا احترام کرکے ان پر احسان نہیں کیا جاتا۔ ایک ایسا خراج اور ایک ایسا فرض ادا کیا جاتا ہے جسے ادا نہ کرکے انسان خود اپنی نظر سے بھی گر جاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی ایسی ہی چند شخصیتوں میں سے تھے۔ ان کے بدترین مخالف بھی ان کا نام احترام سے لینے پر مجبور رہتے، اس لئے کہ کوئی بھی ان کے خلوص سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ کسی کو بھی ان کے ایثار میں شبہ نہیں تھا اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی جد و جہد کسی ذاتی خواہش یا صلے اور ستائش کی تمنا کا نتیجہ ہے سب یہ تسلیم کرنے پر مجبور رہتے کہ مولوی صاحب جو کچھ بھی کر رہے ہیں، خلوص نیت سے کر رہے ہیں، اپنے ہم وطنوں کے لئے کر رہے ہیں اور اپنے مقصد کی صداقت میں یقین کی بدولت کر رہے ہیں۔ ایسی شخصیت کا اگر کوئی شخص احترام نہیں کرے گا، تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا۔

مولوی صاحب ساری عمر، "سیاسی استعمار" اور ذہنی غلامی کے خلاف سرگرم رہے مگر ان کا مشن ابھی نامکمل ہے۔ اس تلخ حقیقت کا احساس ہمیں اس روز بھی ہوا، بلکہ دلایا گیا جس دن مولوی صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ شام کے وقت ایک صاحب (جو خاصے پڑھے لکھے ہیں اور ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں) تشریف لائے، اور چھوٹتے ہی سوال کیا: "کیوں بھئی آج کیا خبر ہے؟" خبر ظاہر ہے یہی تھی کہ بابائے اردو رحلت فرما گئے ہیں! ــ یہ سن کر بولے:

"اوہ! پُوؤر اولڈ مین!"

اس تبصرے پر ہمیں حیرت ہوئی اور انہیں بھی شاید احساس ہوا کہ کچھ اور کہنا چاہئے تھا مگر ان کا

دوسرا جملہ یہ تھا :-

"وٹ اے کلرفل پرسنیلیٹی!

وٹ اے رِچ لائف!"

اور ہم یہی سوچتے رہ گئے کہ اگر یہ بات مولوی صاحب سن لیتے تو نہ جانے ان صاحب سے کیا سلوک کرتے!

یوم منانا ہماری روایات میں داخل ہے۔ اس لئے بابائے اردو کا یوم بھی ضرور منایا جائے گا۔ (اور منایا جانا چاہئے) اس موقع پر جلسے ہوں گے مقالے پڑھے جائیں گے اور قرار دادیں منظور ہوں گی، پھر حسبِ دستور شاید کچھ ایسے "خلیفے" بھی پیدا ہو جائیں گے، جو مولوی صاحب کا نام بیچنے کی کوشش کریں گے (کئی ستم ظریف تو ان کی زندگی میں بھی یہ حرکت کر گزرے، وہ بھلا اب کہاں نچلے بیٹھیں گے!) مگر خلوص کے ساتھ رسمی یوم منایا جائے یا "چڑھاوے" کی امید پر اسے عرس کی صورت دے دی جائے، دونوں صورتیں مولوی صاحب کی روح کو بے چین رکھیں گی۔ اس لئے کہ انہیں تو باتوں سے نہیں کام سے غرض تھی۔ اور ان کا ادھورا کام اس ذہنیت کو بدلنا ہے جو انگریزی میں رونے، انگریزی میں ہنسنے، انگریزی میں بات کرنے بلکہ انگریزی میں خواب دیکھنے سکھاتی ہے! جو اصحاب اس ذہنیت کو بدلنے کے لئے سرگرم رہیں گے ہم صرف ان ہی کو بابائے اردو کا مخلص مداح اور دیانت دار پیرو تسلیم کریں گے۔

دورِ غلامی کا قصہ ہے کہ ایک ضلعے میں مسلمان ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔ ان دنوں "دیسی" ڈپٹی کمشنر خال خال ہی ملتے تھے۔ ان میں مسلمان تو دو چار ہی تھے اس لئے ضلعے کے مسلمان اس تقرر پر بے حد خوش تھے کوئی غیر مسلم اگر نئے ڈپٹی کمشنر کی کسی بات پر اعتراض کرتا تو مسلمان مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے۔ عید آئی تو شہر کے مسلمانوں نے سوچا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کے ہاں ضرور جانا چاہئے۔ نمازِ عید کے بعد چند بزرگ بنگلے پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ صاحب بہادر ابھی سو کر اٹھے ہیں اس لئے انتظار کرنا ہوگا تھوڑی دیر بعد وہ شب خوابی کے لباس میں ہی باہر تشریف لائے اور حاضرین سے پوچھا "آپ لوگ کیا مانگتا" ایک بزرگ قدرے جرات کر کے بولے "آج عید تھی ہم سب نے سوچا کہ ——" صاحب بہادر نے ان کی بات مکمل نہ ہونے دی اور یہ کہہ کر اندر چلے گئے "اوہ! تم لوگ کا بڑا دن ہے ہم بہت خوش، ہم بہت خوش!"

معززین اپنا سا منہ لے کر واپس آئے! ایسے صاحب بہادروں کی معنوی اولاد آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ یہ تسلیم کہ وہ اقلیت میں ہے۔ مگر بہت سے فیصلے اس کے ہاتھ میں ہیں اور ان ہی میں یہ فیصلہ بھی شامل ہے کہ بڑے بڑے دفتروں میں اردو کا داخلہ کب تک ممنوع رہے؟ اونچی اونچی درسگاہوں میں اردو کب تک اچھوت رہے؟

اور بابائے اردو کو بھی خراجِ عقیدت کب تک انگریزی میں ادا کیا جائے؛ دلیل و نہار

(۲۰ / اگست ۱۹۶۱)

رائے جانکی پرشاد

دوانہ مرگیا....

۱۶ راگست کو میں نے ریڈیو سے جب یہ اندوہناک خبر سنی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق انتقال فرماگئے۔ تو دل و دماغ پر ایک سناٹا چھاگیا اور معاً مدتوں پہلے پڑھا ہوا کسی شاعر کا یہ شعر یاد آگیا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ مولوی عبدالحق اردو کے دیوانے، عاشق اور فریفتہ تھے، ان کے دل و دماغ اور ان کے احساسات پر اردو اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اگر کوئی ان سے کراچی کے موسم کے بارے میں گفتگو کرتا اور کہتا کہ مولوی صاحب یہاں کا موسم آج کل خوشگوار نہیں ہے۔ تو یقین مانئے کہ جواب میں مولوی صاحب یوں گویا ہوتے کہ بھئی موسم تو اسی وقت خوش گوار ہوگا جب کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم ہوجائے۔ اور پاکستان میں اردو کی پوزیشن مزید مضبوط ہوجائے۔

میں نے مولوی صاحب کو حیدرآباد کے سررشتہ دارالترجمہ میں کام کرتے دیکھا ہے۔ اور برسوں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں ان دنوں دارالترجمہ میں اصطلاحات کے تعلق سے روائیداد میں لکھا کرتا تھا STANDARD English Urdu Dictionary، کے مرتب کرنے میں بھی میرا حقیر حصہ رہا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ مولوی صاحب نوجوانوں کی ہمیشہ بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اس تعلق سے وہ بڑے وسیع النظر اور کشادہ دل واقع ہوئے تھے۔ میں نے اردو سے مولوی صاحب کے والہانہ عشق کے اثر انگیز مناظر بھی زیادہ تر یہیں دیکھے۔ وہ دیوانہ وار کام کیا کرتے تھے۔ تھکن کا لفظ تو جیسے مولوی صاحب کی ڈکشنری میں تھا ہی نہیں۔ شاید وہ جانتے ہی نہ تھے کہ تھکن کسے کہتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اردو کے لئے عرق ریزی اور لگن کے ساتھ جانسوز محنت۔ ان میں نئی طاقت و توانائی پیدا کرتی تھی۔ عمر کا لحاظ کرنے۔ وہ جیسے جیسے بوڑھے ہوتے جارہے تھے۔ اردو کی خدمت کے لئے ان میں نوجوانوں کا سا جوش پیدا ہوتا جارہا تھا۔ اردو کی خدمت کا ان کے دل میں وہ ولولہ تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو بقول سروجنی نائیڈو اردو کو ساری دنیا کی زبان بنا دیتے۔ اسی بات کو دیکھئے کہ جب اردو کا پیام گھر گھر پہنچانے کا ان کے سر میں سودا سمایا۔ تو ملک بھر کے دورے شروع کئے اور وہ بھی اس مستعدی اور تیز رفتاری کے ساتھ کہ منزلیں گرد کے مانند اڑنے لگیں۔ اس جذبۂ بے اختیار شوق میں سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر پیرانہ سالی کے باوجود ان کے لئے جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ تصنیف و تالیف کی طرف

مائل ہوئے تو کتابوں کا جنگل کھڑا کر دیا۔ مقدمات لکھنے بیٹھے تو اتنے لکھے اور اس پایہ کے لکھے کہ بعض منچلوں نے انھیں مقدمہ باز کا نام دے دیا۔ مرتبہ نگاری کی طرف توجہ کی تو سرپر قلم سے مسیحائی کا کام کیا۔ اور کتنے ہی مرے ہوؤں کو نئی زندگی عطا کی۔ تنقید کی راہ پر گامزن ہوئے تو ... ایسے پھونک پھونک کر اور بچ بچ کر جیسے کوئی مینا بارِ دوش ہو اور اس خارزار کو اس خرم و احتیاط سے طے کیا کہ مدح و ذم کے کانٹوں سے اپنے دامن کو کبھی الجھنے نہیں دیا۔ اور اس راہ کے نازک مرحلوں سے بڑی آسانی اور کامیابی سے گزر گئے۔ تنقید کے ان نازک مرحلوں میں یہ کامیابی دراصل ان کی سنجیدگی و متانت اور موضوع سے انصاف کرنے کی خصوصیات کا نتیجہ تھی۔ تحقیق کے رسیا ہوئے تو ہماری زبان و ادب کے سرمایہ میں انچہ اعلیٰ معیاری کام سے گراں بہا اضافہ کیا۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا خیال آیا تو جامعہ عثمانیہ جیسی شاندار یونیورسٹی کی تاسیس کے کام کو پورا کئے بغیر نچلا نہ بیٹھ سکے۔ غرض اپنی لائق قدر انشا، تنقید، تحقیق اور فن تعلیم میں مہارت مولوی صاحب نے زمین اردو کو سچ مچ آسمان کر دیا۔ اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو سعدی شیرازی کی زبان میں عرض کروں کہ نگہ التفات سے کلاہ گوشہ اردو بہ آفتاب رسید عبدالحق کی اردو کی ترویج و اشاعت کے مقصد میں بڑی سے بڑی شخصیت بھی اگر رکاوٹ بن کر سامنے آئی تو اس کا انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جسے زندگی کی پروا نہ ہو۔ وہ کب کسی اور چیز کی پرواہ کرتا ہے۔ دراصل اردو کے دوستوں کو مولوی صاحب نے ہمیشہ اپنا دوست سمجھا اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن۔

اردو سے انھوں نے جو کچھ کمایا۔ اسے اسی دیوی کے چرنوں میں خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا۔ لیکن عمر بھر کمانے کے باوجود خود مولوی صاحب کی گرہ میں کیا رہا؟ ان کے حصے میں کیا آیا؟ سرسید اور مولانا حالی کے جانشین کو کیا ملا۔ سرسید کے جانشین کو بجز گالیوں۔ نفرت، حقارت اور روحانی کوفت کے اور مل ہی کیا سکتا تھا؟ تنگ نظر، خود غرض اور اپاہج قوموں میں پیدا ہونے والے سرسیدوں کا ہمیشہ یہی حشر ہوا ہے۔ وہ تو یہ کہیئے کہ اردو ہی کی طرح مولوی عبدالحق بھی سخت جان تھے کہ ہزاروں تلخیوں اور ناخوشگواریوں کے باوجود (۹۱) سال تک زندہ رہے۔ اردو نے بھی اپنی حفاظت کے لئے ایسا جانباز اور سخت جان سپاہی اپنی زندگی کے کسی دور میں کب پایا ہوگا۔ سخت افسوس ہے کہ (۹۱) سال تک زندہ رہنے کے باوجود بابائے اردو کے خلوص اور زبان کے دل کی پوشیدہ سچائی کو دنیا نے نہیں پہچانا۔

کم نظر بے تابیٔ جانش ندید
آشکارش دید و پنہانش ندید

آخر وہ کب تک اور کہاں تک اپنے دل کی بات زمانے بھر کو سمجھاتے۔ بالآخر ۱۶ر اگست کو انھوں نے چپ سادھ لی۔ آج عبدالحق خاموش ہیں۔ ان کی زبان بند ہے۔ موت نے آج ان کی

زبان پر مہر خاموشی لگا دی۔ دیکھئے ان کا چہرہ کیسا پرسکون ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں اب ہم نہیں بولیں گے۔ قیامت تک نہیں بولیں گے۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے متلاطم سمندر نے یکلخت پہاڑ جیسا سکوت اختیار کرلیا ہو۔ اچھا ہی ہوا عبدالحق خاموش ہو گئے۔ برسوں کی دنیا کو وہ کب تک اردو کی بپتا سناتے۔ ایک سچے عاشق کے سے شوق اور انہماک سے عبدالحق نے زندگی بھر اردو کی خدمت اس لئے بھی کی کہ ان کا خیال تھا کہ اردو کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے۔ اپنے اس خیال کا اظہار بابائے اردو نے اردو مجلس کے نام "یوم مولوی عبدالحق" کے سلسلے میں اپنے ایک بصیرت افروز پیام میں کیا تھا۔ بابائے اردو نے فرمایا تھا کہ "اردو کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے۔ اس نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ رواداری اور ملنساری اس کی فطرت میں ہے۔ اس نے اس برِ اعظم کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کیا اور سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اس لئے اُردُو کو اس کی پیدا کردہ تہذیب کو بچانا اور ترقی دینا ہم سب کا فرض ہے۔" دراصل خلوص و بے غرضی کے ساتھ کام کرنے والوں پر ظلم و ستم دنیا میں کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ اپنوں ہی نے ہمیشہ حوصلہ شکن فضا پیدا کر کے ایسے مجنونوں کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ اور وہ ظلم ڈھائے۔ کہ

رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلئے

خدا کا شکر ہے کہ اردو مجلس کو اس بات کا اعزاز حاصل ہوا کہ اس نے بابائے اردو کی زندگی ہی میں ان کی شاندار ادبی خدمات کا بجا طور پر اعتراف کیا۔ اور ماہ مئی ۱۹۶۰ء میں "یوم مولوی عبدالحق" منایا اور اپنے سہ ماہی ترجمان "مجلس" کا "مولوی عبدالحق نمبر" بھی شائع کیا تھا۔ جس پر خود بابائے اردو نے اظہارِ خوشنودی فرمایا تھا۔ اور جس کا ادبی حلقوں نے بڑا حوصلہ افزا خیر مقدم کیا۔

صاحبو! بے شک بابائے اردو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن انھوں نے جو تحریک چلائی تھی اردو کی تحریک ——— اسے زندہ رہنا اور زندہ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ "تحریکوں کی موت ہی دراصل قوم کی موت ہوتی ہے ———" اگر اردو والوں میں صحیح احساس فرض اور جذبہ عمل ہے۔ تو یہ تحریک آئندہ بھی زندہ رہے گی۔ بلکہ میرا یہ خیال ہے۔ کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا۔ اس میں اور تقویت پیدا ہوگی۔ خدا کرے کہ ہمارا شعور بیدار ہو۔ اور ہمارے دل میں اردو کی پرخلوص خدمت کا حقیقی جذبہ پیدا ہو۔

پائندہ باد اردو

(سب رس، حیدرآباد دکن، ستمبر، اکتوبر ۶۱ء)

آخری مُسافر

برسات کی ہلکی سی شام ہے بڑا بے کیف موسم ہے۔گرمی بڑھ گئی ہے بادل آسمان کو ڈھانپے ہوئے ہیں شہر پر کچھ عجب اداسی چھائی ہوئی ہے میں مشن رُوڈ کے چوراہے پر کھڑا ہوں اور سامنے سڑک پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ ایک قافلہ ہے جو میرے سامنے سے گزر رہا ہے جھکی ہوئی نگاہیں۔ پژمردہ چہرے۔سوگوار قدم۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ ان کے کاندھوں پر ایک جنازہ ہے۔ سفید چادروں اور تازہ پھولوں سے ڈھکا ہوا ایک جسم —— یہ کس کا جنازہ ہے۔ یہ کون ہے جو مرگیا۔؟ لوگ غمگین کیوں ہیں —— اداس کیوں ہیں یہ کس کا جسم ہے جو چند لمحوں بعد مٹی میں دفن ہو جائے گا ؟ اور میرے برابر کھڑا ہوا۔ ایک پٹھان مزدور اپنے ساتھی کو بتا رہا ہے —— "بابائے اُردو بہت بڑا آدمی تھا —— وہ —— وہ —— یوں سمجھو وہ اُردو کا قائدِ اعظم تھا۔"

بابائے اُردو کا جنازہ جارہا ہے۔

یہ آتی سردیوں کے دن ہیں۔ موسم خوشگوار ہے اس وقت شام ہوچکی ہے سورج غروب ہو رہا ہے ، اُردو کالج کے صحن میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ میری آنکھیں اُردو کے بے شمار ادیبوں شاعروں اور تنقید نگاروں کو دیکھ رہی ہیں۔ جو خاموشی کے ساتھ فرش پر بیٹھے ہیں۔

یہ یومِ جگر کی ایک تعزیتی محفل ہے اُردو کا سب سے بڑا غزل گو مرگیا ، اُردو کے چاہنے والے اُداس ہیں اور ادب شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی آنکھیں نمناک ہیں ، اُردو کالج کے صحن میں لوگ جمع ہیں ، میں مائیکروفون پہ اعلان کر رہا ہوں خواتین و حضرات اب بابائے اردو آپ سے خطاب فرمائیں گے۔

اور اب لوگ ایک جانی پہچانی بوڑھی آواز سن رہے ہیں۔ ایک بوڑھی آواز جس میں جوانی کی سی توانائی موجود ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اُردو کے سب سے بڑے غزل گو شاعر کی زندگی کے حالات سُنا رہے ہیں۔ اس تعزیتی محفل میں بھی انھوں نے جگر صاحب کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے ایسے واقعات سنائے کہ لوگ چند لمحوں کے لئے اپنے غم بھول کر مسکرا اٹھے ہیں۔

بابائے اُردو سامعین کو اپنے زورِ بیان سے مسحور کر رہے ہیں۔

گرمیوں کی ایک بڑی شگفتہ سی شام ہے —— ایک مقامی تھیٹر کے باہر شائقین کا ہجوم ہے۔ ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا ہے اور انھیں تماشبینوں میں سب سے پہلی قطار میں شیروانی پاجامہ میں ملبوس پرانے قسم کی ترکی ٹوپی اوڑھے۔ ہاتھ میں بیت لئے ایک معزز مہمان بھی موجود ہے۔ وہ اپنے برابر کی نشست

پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے معروف گفتگو ہے
گفتگو کا موضوع تھا اُردو یونی ورسٹی ——
باباۓ اُردو اس یونی ورسٹی کا پروگرام سمجھا
رہے ہیں اب اندھیرا پھیل چلا ہے۔ بادل اور
جھک گئے ہیں۔ میں اُردو کالج کے صحن میں کھڑا
ہوں۔ میرے چاروں طرف سوگوار چہروں کا ہجوم
ہے۔ نمناک آنکھوں میں چھپی ہوئی اداسیاں ہیں ——
سامنے عمارت کے دروازہ پر موٹے موٹے الفاظ میں
اقبال کا شعر لکھا ہے۔

پرانے بزرگوں میں بہت سی خوبیوں کے علاوہ
ایک خوبی یہ بھی بہت بڑی پائی جاتی ہے کہ وہ بڑی
مستقل مزاجی سے اور مسلسل کام کرنے کی صلاحیت
رکھتے ہیں —— باباۓ اُردو میں یہ خوبی عام
بزرگوں سے کچھ زیادہ ہی تھی —— اور پھر سب
سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے زندگی کے مختلف میدانوں
کو چھوڑ کر اپنی زندگی کو صرف ایک ہی کام کے لئے
وقف کر دیا تھا —— اُردو کی ترقی —— اُردو
کی بقا —— اُردو کا استحکام —— اپنی زندگی
کے آخری لمحوں تک وہ کام کرتے رہے اور کہتے ہیں کہ
موت سے چند لمحوں پیشتر بھی جو الفاظ ان کی زبان
سے نکلے وہ انجمن اور اُردو ہی سے متعلق تھے۔

وہ انسان جس نے اس دنیا کو اور اس زندگی کو اتنی
بہت سی توانائی اور کتنے بہت سے نت نئے انداز
بخشے ہوں۔ آخر کس طرح مر سکتا ہے؟ موت ——
جسم کو مٹی میں دفن کر دینے کا نام تو نہیں ہے ——
وہ جس کا انداز فکر تحریر میں محفوظ ہے ——
اور جس کے خیالات انسانوں کی جیتی جاگتی زندگی بن گئے
ہوں اور جو اپنے سے بعد کے زندہ رہنے والوں کی
یادوں میں اور ان کے تصورات میں زندہ رہے۔
موت اسے ہم سے کس طرح چھین سکتی ہے ——

۱۶ اگست کی اس شام کو اُردو کالج کے صحن
میں اس عمارت کے عقب میں جس پر لکھا ہے۔

گیسوۓ اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

ایک انسان کا جسم جس کی عمر ۹۱ سال تھی ——
جو ۱۸۷۰ء میں میرٹھ کے ضلع ہاپوڑ میں پیدا ہوا تھا۔
جس نے علی گڑھ سے بی اے پاس کیا —— سر سید احمد
خاں کے ساتھ مل کر کام کیا —— حیدرآباد دکن میں
ملازمت اختیار کی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی
صدارت کے فرائض انجام دیئے —— جو انجمن ترقی
ہند کا سکریٹری تھا اور جس نے قیام پاکستان کو پہلے
کے نازک دور میں سارے ہندوستان کا دورہ
کر کے گاؤں گاؤں اُردو کا پیغام پہنچایا تھا اور جو
پاکستان میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے سرگرداں
تھا —— اس بوڑھے ۹۱ سال انسان کے جسم کو دفن
کر دیا گیا۔ ہم نے اسے قبر میں اتار کر سینکڑوں من مٹی کے نیچے دفن
کر دیا۔ وہ بوڑھا جسم قبر کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔

لیکن اس کی رُوح آزاد ہے اسے
قبر کے اندھیرے میں کوئی نہیں دھکیل سکتا

وہ زندہ رہے گا ان تحریروں میں جو اس نے لکھیں۔
ان تحقیقات میں جو اس نے زبان اور ادب کے لیے

سرانجام دیں ——— آنے والی نسلوں میں ———
ہماری یادوں میں ——— ہمارے خیالوں میں ———
——— برسات کی ہلکی شام غروب ہو گئی ہے ———
——— ہر طرف گہرا اندھیرا ہے ——— میں اردو کالج کے صحن میں کھڑا ہوں جہاں کچھ دیر پہلے سوگوار چہروں کا ہجوم تھا ——— میری نظروں کے سامنے وہ عمارت ہے جس پر اقبال کا شعر لکھا ہے لیکن اب اندھیرا ہے ———

میں نے کئی بار یہ عمارت دیکھی ہے ——— یہ صحن دیکھا ہے ——— ہر چیز میری جانی پہچانی ہے ——— سب کچھ وہی ہے ——— لیکن نہیں شاید کوئی چیز بدل گئی ہے، کچھ کھو سا گیا ———
اس سامنے والی عمارت کے ایک کمرے میں ایک دل تھا جو دھڑکتا رہتا تھا ——— آج اس دل کی دھڑکن کی گونج نہیں ہے ——— اور ———
اور اس عمارت کے عقب میں ایک قبر ہے جس سے سوندھی مٹی اور تازہ پھولوں کی ملی جلی مہک آ رہی ہے۔
اور قبر کے گہرے اندھیرے اور لامتناہی سناٹے میں ایک بوڑھا جسم لیٹا ہوگا ——— وہ دل جو کل تک دھڑک رہا تھا۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے

اور اس عمارت کے دوسری جانب اب ایک قبر ہے۔ ایک جسم ہے جو مٹی میں دفن ہو گیا۔
یہ بابائے اردو کی قبر ہے

یہ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے خیال ہیں۔ کتنی یادیں ہیں کتنی تصویریں ہیں جو اچانک اس وقت میرے ذہن میں ابھر آئی ہیں ——— مٹتے ہوئے، دھندلائے ہوئے کھوئے ہوئے نقوش اچانک ابھر آئے ہیں ———
اور میرا قلم ٹھہر گیا ہے ——— اور میں سوچ رہا ہوں بابائے اردو کی موت پر میں کیا لکھوں؟
میں لکھ بھی کیا سکتا ہوں اور پھر اس کے متعلق جو اتنے دن ہمارے درمیان رہا ——— روشنی کا ایک بلند مینار بن کر ان اندھیروں میں روشنی بکھیرتا رہا ———
اس کے متعلق لکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے ——— ہم سب انہیں جانتے تھے ہم سب ان کی عظمت سے واقف تھے ——— اور بس ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ ۱۶ ار اگست کی صبح کو ہم نے یہ الم انگیز خبر سنی کہ بابائے اردو رحلت فرما گئے۔

بابائے اردو مر گئے ——— ۱۶ ار اگست کی صبح کو سارے کراچی پھر سارے پاکستان اور پھر ساری دنیا کے ادبی حلقوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔
لیکن ہمارے ذہنوں کو کوئی اچانک دھچکا نہ لگا ——— شاید پچھلے دو ہفتوں سے ہم یہ خبر سننے کے لئے تیار تھے ——— رنج اور غم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے دلوں کے ساتھ ہم گزشتہ کئی دنوں سے اس المناک خبر کے منتظر تھے۔
اور یوں بھی اپنی اس موت سے پہلے بھی کئی بار ہمیں ان کی موت کا گمان ہوا تھا ——— انکی موت کا خیال آیا تھا۔

جب برناڈ شا کی وفات ہوئی تھی تو جانے کیوں لوگوں کو ڈاکٹر عبدالحق کی موت کا خیال آیا تھا۔

جب حسرت موہانی کے انتقال کی اطلاع آئی تھی تو جانے دل کیوں دھڑکنے لگے تھے کہ ایک روز بابائے اردو بھی ہم سے جدا ہو جائیں گے ۔۔ جگر ۔۔ پطرس ۔۔ سالک ۔۔ خواجہ حسن نظامی غرض ہر ادیب کی موت نے جانے ہم پر کیا اثر کیا تھا کہ ہمارے لبوں پر ہمیشہ بابائے اردو کی درازی عمر کی دعائیں آجاتی تھیں۔

ہمارے ان جذبات پر بابائے اردو نے خود بھی بہت اثر ڈالا تھا ۔۔ انھوں نے اتنی بار اپنی موت کا ذکر کیا کہ ہمارے ذہنوں میں یہ خیال رچ بس گیا ۔۔ اپنے ہر خط میں ۔۔ اپنی تمام تقریروں میں اپنی عمر کا تذکرہ ضرور کرتے اور پھر اس ذکر کو ذرا آگے بڑھا کر عمر کو موت کی سرحد تک پہونچا دیا کرتے ۔

لیکن وہ یہ سب باتیں کچھ اس قدر دلچسپ اور پرلطف انداز میں کہتے تھے کہ سننے والے کو اس وقت یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی غمناک بات سن رہا ہے ۔۔ وہ بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج تھے ۔۔ ان کی ہر بات میں مسکراہٹ پوشیدہ ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنی موت کا ذکر بھی کرتے تو سننے والے کو یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ موت کا ذکر کر رہے ہیں۔

کون جانے بابائے اردو نے اسی لئے یہ رویہ اختیار کیا ہو کہ جب سچ مچ موت انھیں ہم سے جدا کر دے تو ہمیں ان کی موت کچھ عجیب معلوم نہ ہو اور ہمیں ایسا لگے جیسے یہ تو کوئی بڑی پرانی بات ہے۔ ہم کئی بار پہلے بھی سن چکے ہیں۔!

بابائے اردو اس قافلے کے آخری مسافر تھے۔ جس کی رہنمائی سرسید نے کی تھی ۔۔ انھوں نے سرسید سے بہت کچھ سیکھا تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھیں دیکھ کر ہمیں ان بزرگوں کا خیال آتا تھا جو ہمارے ادب کے چاسر ۔۔ شیکسپیر اور ملٹن تھے ۔۔ بابائے اردو خود بھی ایسی ہی ہستی تھے۔ ان کی ایک ایک بات سے ان کے کردار کی عظمت اور ان کی ذہنی بلندی کا اظہار ہوتا تھا۔ (ماہنامہ "سات رنگ" کراچی ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء)

(ماہنامہ "سات رنگ" کراچی۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء)

ساجد سنبھلی

بابائے اردو

کل رہگذر غم ہے جہانِ اردو
رخصت ہوئے بابائے زبانِ اردو
سینوں سے ہویدا نظر آتی ہے مجھے
بیتاب سی اک موج فغانِ اردو
دنیا ہے عجب سرائے فانی ساجد
کھا ہی گئی آخر کو نشانِ اردو

(ہفت روزہ "نئی جمہوریت" ۲۶ اگست ۶۱ء)

محی الدین احمد

مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں

ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی مہذب، شائستہ، با اخلاق اور صاحب کردار کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ کمزوریاں اس میں ضرور ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کمزوریاں انسان ہی میں ہوتی ہیں۔ اگر کمزوریاں نہ ہوں تو انسان، انسان نہ رہے، فرشتہ ہوجائے۔ یہی حال مولوی عبدالحق کا بھی تھا۔ یہ بھی انسان ہیں۔ اور ان میں بھی کمزوریاں ہیں۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ میں نہ مولوی صاحب کا شاگرد رہا ہوں۔ اور نہ ماتحت۔ لیکن مولوی صاحب کی اردو خدمات کی وجہ سے ایک خاص عقیدت میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ جو آج بھی ویسی ہی ہے جیسی برسوں پہلے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مولوی صاحب کو دیکھا ہے اور خوب دیکھا ہے۔ گو دور ہی دیکھا ہے۔ لیکن دوربین لگا کر دیکھا ہے۔ اور اس طرح دیکھا ہے۔ جس طرح کوئی نزدیک سے دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ جہاں میں نے ان کی خوبیاں دیکھی ہیں۔ وہیں ان کی بعض کمزوریاں بھی دیکھی ہیں۔

ہم ہندوستانیوں کی قومی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہم وقت کی قدر بالکل نہیں جانتے اور پابندی وقت کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف مولوی صاحب وقت کی پابندی خود بھی سختی سے کرتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی اس پر مجبور کراتے تھے۔ دوسروں کو پابند بنانے کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ سر اکبر حیدری گورنمنٹ نظام میں صدر اعظم باب حکومت تھے۔ ایک بار کسی سرکاری کام سے وہ اورنگ آباد کے دورے پر گئے۔ اسی زمانے میں مولوی عبدالحق نے اردو باغ کے افتتاح کی تقریب رکھی اور اس سلسلے میں ایک عصرانہ ترتیب دیا اور ساڑھے پانچ بجے کا وقت مقرر کیا۔ لیکن حیدری صاحب کسی وجہ سے وقت مقررہ پر نہ آسکے مولوی صاحب نے وقت مقررہ پر عصرانہ شروع کروا دیا۔ حاضرین میں سے بعض لوگوں نے اصرار بھی کیا کہ مہمان خصوصی کا انتظار کر لینا چاہیئے۔ لیکن مولوی صاحب نے ایک نہ مانی۔ بالآخر حیدری صاحب کچھ تاخیر سے پہنچے تو مولوی صاحب نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا کہ وقت مقررہ گزر جانے کے بعد میرے پاس کچھ بھی   حیدری صاحب نے مولوی صاحب سے معافی مانگی۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ جناب آپ بڑے آدمی ہیں اور وقت آپ کا ہے۔ آپ کو ہمارے وقت کی کوئی قدر نہیں

ذرا ملاحظہ فرمایئے ہم ہندوستانیوں کی پسندیدہ روش کی اتنی سخت خلاف ورزی مولوی صاحب

کی کیا بڑی کمزوری نہیں ہے۔

وہ ماتحتین کی غلطیوں کو بھی اپنے سر لے کر ان کو بے قصور قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک بڑی کمزوری تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ مولوی صاحب کے ایک ماتحت (محمد علی صاحب) ان کے دفتر میں اہلکار تھے۔ اتفاق سے اسی دفتر میں ایک جائیداد سررشتہ داری کی تقرر طلب تھی۔ مولوی صاحب نے اس پر ان کی تقرر کر دیا۔ چونکہ سررشتہ دار کے تقرر کا اختیار مولوی صاحب کو حاصل نہ تھا۔ اس لئے توثیق کے لئے جملہ کارروائی نظامت تعلیمات کو روانہ کی گئی۔ وہاں سے مولوی صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ لکھا گیا کہ چونکہ محمد علی صاحب کی نسبت سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹ ٹھیک نہیں ہے اس لئے ان کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ اس کا جواب مولوی صاحب نے یہ دیا کہ اگر سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹ پر ترقی کا انحصار ہے تو میں شاید ملازمت تو کیا ملک میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ کیونکہ سی۔ آئی۔ ڈی میں میری رپورٹ اس سے بھی زیادہ خراب ہوگی۔ پس جب میں ملازمت پر برقرار رکھا جا سکتا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ بے چارے محمد علی کو ترقی سے محروم رکھا جائے۔ چنانچہ لڑ جھگڑ کر مولوی صاحب نے اپنی تحریک منظور کروالی۔

مولوی صاحب کی ایک کمزوری یہ بھی ہے۔ کہ وہ ہر شخص کی سفارش کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک بار کوئی تانگہ والا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں ایک مقدمہ میں پھنس گیا ہوں۔ پیروی کا انتظام نہیں کر سکتا۔ آپ کسی وکیل کے نام سفارشی چٹھی لکھ دیجئے۔ تاکہ وہ میرے مقدمے کی بلاحصول محنتانہ پیروی کرے۔ مولوی صاحب نے بے تکلف ایک خط اورنگ آباد کے ایک مشہور وکیل سید ساجد علی صاحب کے نام لکھ دیا۔ کہ یہ وہی شخص ہے۔ جس نے مجھے اور آپ کو ایک مرتبہ اورنگ آباد کے بازار میں پیٹ دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مولوی صاحب کے منشاء کے مطابق بلاحصول محنتانہ پیروی کی۔

مولوی صاحب اگر کسی کو بلا قصور ڈانٹ دیتے یا بگڑ جاتے تو اس کے بعد اس شخص کے ساتھ کچھ ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ اس ڈانٹ ڈپٹ، زجر و توبیخ کو بالکل بھول جاتا۔ اور یہ عمل معافی طلب کرنے کے معادل و مترادف بن جاتا۔ حالانکہ معافی مانگنا ان کو قطعاً نہیں آتا۔ ایک بار ہوا یوں کہ مولوی صاحب ایک خوش منظر پہاڑی پر بنگلہ بنوانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے لکڑی اور چند ضروری چیزیں خریدی گئیں اور ایک بھٹی اینٹوں کی لگوائی گئی۔ بعد میں وہ بھٹی خراب ہوگئی۔ مولوی صاحب نے بھٹی کے نگراں عبدالرحیم خاں کو ذمہ قرار دے کر ڈانٹنا شروع کیا۔ اور اس قدر سخت سست کہا کہ بے چارہ تاب نہ لا سکا۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کو اٹھا کر ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں اور جب اس کے ہوش و حواس ٹھکانے پر آئے تو

گھر چلا گیا۔ اور نوکری پر حاضر نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کو ان کے ایک دوست نہال احمد نے توجہ دلائی کہ آپ نے عبدالرحیم خاں کو بلا دجہ ڈانٹ پھٹکار کی۔ آج آپ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تو کل میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جاسکتا ہے اس لئے میں بھی اپنا سامان بندھوا لئے لیتا ہوں۔ یہ سنکر مولوی صاحب خاموش ہوگئے۔ دوسرے دن علی الصبح محمد علی صاحب کو ساتھ لے کر صبح کی سیر کی بجائے محلہ عثمان پورہ میں منشی صاحب کے مکان پر جا پہنچے۔ اور فرمانے لگے۔ بھئی عبدالرحیم میں نے تمہارے ہاتھ کی چائے دو، تین دن سے نہیں پی ہے۔ اور آج صرف تمہاری بنائی ہوئی چائے پینے کے لئے آیا ہوں۔ کیا مجھے چائے نہیں پلاؤ گے بے چارے عبدالرحیم نے جلدی جلدی چائے تیار کرکے مولوی صاحب کو پلائی۔ جب واپس ہونے لگے۔ تو مولوی صاحب کے اس طرح عمل کا عبدالرحیم خاں پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ اور واپس آکر حسب سابق اپنے مفوضہ کام پر لگ گیا۔

اب ذرا کوئی مجھے یہ بتلا دے کہ کیا کوئی ایسا شخص جو حکومت کے اعتبار سے ایک ایسے معزز اور جلیل القدر عہدے پر فائز ہو اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے ملک بھر میں خاص شہرت اور عزت و وقعت رکھتا ہو۔ اپنے ایک غریب ماتحت کے گھر جاکر اس قدر بے تکلفی کے ساتھ چاء پی سکتا ہے۔ اگر یہ مولوی صاحب کی کسر نفسی نہیں ہے۔ تو پھر کیا ہے۔ (ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد دکن، ستمبر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء)

رانا محمد بہار الحق اشک

تاریخ وفات بابائے اردو

مولوی عبدالحق کہ شناور
بود ہمہ دم در یم اردو
تا بفراز عرش معلّٰے
شد زجہاں پرچم اردو
گیسوئے اردو گشت مزین
راست از و شد ہر خم اردو
صرف سراسر تا دم آخر
روز و شب او در غم اردو
ہم دم اردو گر بی برآمد
شد چو دم آن ہمدم اردو
وقت چو آن بود چو عرش
ماتم او شد ماتم اردو
اشک بیا بین رفت چو بابا
اشک بچشم پر نم اردو
از سر آہ ہے گفت سروشے
سالش "محسن اعظم اردو"

۱۳۸۰ھ = ۱۳۸۱ھ
(ہفت روزہ لیل و نہار ۲۰ ستمبر ۱۹۶۱ء)

رئیس امروہوی

مولوی عبدالحق جی گئے

مولوی عبدالحق مرگئے!

اور ان کے ساتھ وہ صدی بھی مرگئی جو سرسید مرحوم سے شروع ہوئی تھی۔ ایک روز ہم چند آدمی مولوی صاحب کے ہمراہ کسی جلسے سے آرہے تھے۔ موٹر کی اگلی نشست پر مرحوم تشریف فرما تھے اور پچھلی نشست پر ہم کئی آدمی ٹھسے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا جب مولوی صاحب پر نظر پڑتی ہے تو محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، آزاد، داغ اور شبلی سب یاد آجاتے ہیں۔ مرحوم نے مڑکر دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ۔

ہاں۔ میں نے ان سب بزرگوں کو دیکھا ہے۔ اور ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا ہے۔ خاص کر سرسید کی خدمت میں۔ جو اس قوم کا سب بڑا انسان تھا

تو اب وہ شخص بھی مرگیا۔ جو سرسید اور حالی سے ہمارا رشتہ ملاتا تھا۔ اس قوم کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ جب لکھی جائے گی۔ تب پتہ چلے گا کہ مولوی صاحب مرحوم کے معاصرین کس پائے کے لوگ تھے۔ اور وہ خود کس وزن اور کس قدو قامت کے انسان تھے۔ یہ جلسہ جس کا میں نے ذکر کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ گیارہ سال قبل ڈرگ روڈ میں ۱۴ اگست کے موقع پر ہوا تھا۔ مولوی صاحب اس اجتماع میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے پاکستان ایئرفورس کے نوجوانوں اور افسروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

تم لوگوں کو اپنی تاریخ پڑھنا چاہیئے تاکہ تمھیں سچائیوں کا پتہ چلے، پاکستان کی بنیاد ۱۹۴۷ء میں پڑی۔ بلکہ سرسید کے عہد میں پڑی جب انھوں نے سب سے پہلے متحدہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا پول کھولا تھا۔ اور اعلان کیا تھا کہ اس ملک کے مسلمان ایک جداگانہ اور مستقل قومیت کے مالک ہیں۔ یہ ایک علیحدہ قوم ہیں۔ اس سے پہلے سرسید اردو کو ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومی رشتہ پیدا کرنے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ مگر جب انگریزوں کے اثر سے بعض برادران وطن نے اردو کو بدیسی زبان قرار دیا۔ اور ہندی ناگری کو اپنی قومیت کی نشانی سمجھنا شروع کیا تو سرسید نے کہا کہ اب ہندوستانی قومیت میں ایک ایسی دراڑ پڑگئی ہے۔ جسے کبھی نہ بھرا جاسکے گا۔ اس طرح سرسید احمد خاں پہلا شخص ہے۔ جس نے مسلم قومیت کی نشان دہی کی۔ اس کا اعلان کیا۔ اور عملاً اسے ثابت کردکھایا ـــــ مولوی صاحب عملی سیاست

اور سیاست کے جذباتی نعروں سے نہ کوئی تعلق رکھتے
تھے۔ نہ انھیں پسند فرماتے تھے۔ ہاں ہر قومی سیاست
کے تقاضوں پر ان کی نظر اتنی گہری اور دور رس
تھی کہ شاید ہی ہمارے کسی سیاسی رہنما کو ایسی نظر
نصیب ہوئی ہو۔ وہ علی گڑھ کی تحریک نشاۃ ثانیہ
کے ثمر پیش رس اور طلبا علی گڑھ کے اس گروہ سے
تعلق رکھتے تھے۔ جس نے سر سید اعظم کی نگرانی میں
تربیت حاصل کی تھی۔ اور پھر سر سید محمود اور
محسن الملک مرحوم کے ساتھ کام کرنے کا شرف
حاصل کیا تھا۔ علی گڑھ کی یہ نسل۔ جدید مسلم
قومیت کی ہراول تھی اور اس نسل نے ادب، ثقافت
تعلیم۔ معاشرت غرض ہندی مسلمانوں کی زندگی
کے ہر گوشے میں انقلابی بیداری پیدا کی۔ اس نسل
کے قدم بہ قدم دوسری نسل آئی، جس میں محمد علی
شوکت علی۔ حسرت موہانی۔ سلیمان ندوی اور اقبال
وغیرہ نے نمایاں امتیاز پیدا کیا۔ مسلم قومیت کی
تیسری نسل نے قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان
کا نعرہ بلند کیا۔ اور اب چوتھی نسل پاکستان کے
فوائد و ثمرات سے مستفید ہو رہی ہے گویا مولوی
عبدالحق اپنی زندگی میں برکوچک کے مسلمانوں کی پانچ
پیڑھیوں پر اثر انداز رہے۔ اور اب وہ مرنے کے بعد
ان ستاروں میں شامل ہو گئے؛ جو انجان زمانوں
تک نسلوں اور پشتوں کی راہ حیات کو منور کرتے
رہیں گے! مولوی صاحب کا نعرہ تھا ——— اردو
کو بچاؤ ——— یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں ہے۔ گو بعض
لوگ یہی سمجھتے ہوں۔ بلکہ ایک تاریخی شعور اور
سماجی تقاضے کا غلغلہ ہے۔ مولوی صاحب مرحوم
کی بصیرت نے انھیں اس نتیجے پر پہونچایا تھا کہ اردو
زبان نہ صرف سرسید کے زمانے سے ہماری قومی
نشاۃ ثانیہ کی علامت رہی ہے بلکہ مستقبل میں
مسلمانوں کی سماجی، فکری اور تخلیقی زندگی کو ہم آہنگ
کرنے کا ذریعہ بھی یہی زبان ثابت ہوگی۔ میں تو جب
مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہی تاثر
لے کر اٹھا کہ یہ شخص نہ صرف زبان۔ ادب۔ لسانیت
اور تاریخ کا سب سے بڑا محقق اور مفکر ہے۔ بلکہ
مسلمانوں کا سب سے بڑا سماجی مصلح اور ثقافتی
رہنما بھی ہے۔

ان میں کمزوریاں اور خامیاں بھی ہوں گی
کہ انسان کو انسان کامل بنانے کے لئے ان کا وجود
ناگزیر ہے۔ لیکن ان کی خوبیاں ایسی اور ان میں
عظمتیں اتنی نہیں کہ مجھے تو وہ ہمیشہ ہمالہ پہاڑ کی برابر
نظر آئے، جب ہمارا جی ٹوڈیوں اور ٹیڈیوں
کی صحبت سے اکتا جاتا تو بابائے اردو کی خدمت میں
پہونچتے اور محسوس کرتے کہ کسی جلتی ہوئی دوپہر میں۔
ایک لمبی تھکا دینے والی مسافت کے بعد۔ ہم اچانک
میٹھے ٹھنڈے پانی کی ندی میں اتر گئے ہیں۔ اور
مزے سے غوطے لگا رہے ہیں۔ وہ دیوؤں کے زمانے
میں پیدا ہوتے تھے۔ اور انھیں بونوں اور پودنوں
کے ساتھ زندگی بسر کرنی پڑ رہی تھی۔

مولوی صاحب سے زیادہ علم کا قدردان اور

ادب کا شغف تو کوئی کا ہے کو ہوگا وہ ہر شخص کی ادبی خدمت کو سراہتے۔ اس کا دل بڑھا دیتے اور اسے جونپ ملاتے کہ تم سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہو۔ مثلاً میں جنگ میں جو قطعے لکھتا ہوں مولوی صاحب ان سے میری بہت بڑی تخلیقی ذہانت تصور فرماتے تھے جب بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ایسے الفاظ میں ہمت افزائی کرتے کہ شرم آجاتی۔ وہ ان چار مصری قطعوں کو "نیم چہ" کہا کرتے تھے ۱۶ راگست کی صبح کو جب میں اور نقی۔ مولوی صاحب کی وفات کی خبر سن کر اردو کالج حاضر ہوئے تو حکیم اسرار احمد صاحب نے۔ جو مولوی صاحب کے رفیق خاص اور بابائے اردو کے ایام آخر میں ہر لحظہ ان کے ساتھ رہے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بھرّائے ہوئے لہجہ میں فرمایا کہ۔

رئیس صاحب!

یہ مولوی صاحب مرحوم کی میت دھری ہے۔ میں اسے گواہ کرکے کہتا ہوں کہ انھوں نے اس زمانے میں متعدد مرتبہ آپ کو یاد کیا۔ اور فرمایا کہ وہ شخص ایک قادر الکلام شاعر ہے۔ مگر اپنے کو تباہ کر رہا ہے میں نے اسے بارہا کہا کہ الیڈ کو اردو نظم کا جامہ پہنادو — تم رئیس سے کہدینا کہ یہ کام اس کے کرنے کا ہے۔ اور یہ کام وہی کرسکتا ہے۔

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور شرم و ندامت سے سر جھک گیا۔ سچ ہے مولوی صاحب مرحوم نے جذبۂ شفقت کے پیدا کئے ہوئے بے پایاں جوش کے ساتھ ایک بار نہیں۔ کئی بار میری شاعرانہ صلاحیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یونانی شاعر ہومر کے مشہور حماسے۔ "الیڈ" کے منظوم ترجمے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ تجویز مرتب کی تھی کہ دو تین آدمیوں کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ جو الیڈ کو اس کی یونانی دیو مالائی تشریحات کے ساتھ اردو نثر میں منتقل کرے اور پھر میں اسے اردو زبان کے رزمیہ مثنوی کے قالب میں ڈھال دوں۔

شام کو مولوی صاحب مرحوم کی تدفین کے وقت پھر حکیم اسرار احمد نے نقی کا بازو پکڑ کر مولوی صاحب مرحوم کے یہ فقرے نقل کئے کہ میری خواہش تھی کہ داس کیپٹال اور الیڈ کا اردو نثر و نظم میں ترجمہ ہو جائے۔ ایک بھائی (نقی) نے میری خواہش کی تکمیل کردی کہ داس کیپٹال کا ترجمہ شروع کردیا، دوسرے بھائی (رئیس) سے کہدینا کہ وہ الیڈ کی طرف توجہ کرے یہ میری وصیت ہے۔

اس وصیت کا خیال کرتا ہوں اور روتا ہوں اب مولوی عبدالحق کہاں سے آئیں گے کہ الیڈ کے ترجمے کے سر و سامان فراہم کریں گے۔ اور میں اس یونانی مثنوی کو اردو نظم کا جامہ پہناؤں گا۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

یہ واقعہ میں نے اپنی کسی بڑائی کے اظہار کے لئے کے لئے بیان نہیں کیا۔ اس سے مرنے والے کی بڑائی اور اونچائی ثابت ہوتی ہے۔ یہ تو بڑے ہوتے ہیں جو چھوٹوں کو بڑا بنا دیتے ہیں۔ سورج چمکتا ہے تو ذرے دمک اٹھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی چمک دمک نے ہزاروں چہروں

کو جگمگا دیا تھا۔ اس روشنی کے بجھنے کے بعد کچھ چہرے بجھ جائیں گے۔ اور جنہوں نے ڈوبنے والے سورج سے کچھ نور اخذ کرلیا ہے۔ وہ ٹمٹماتے رہیں گے!

مولوی صاحب مرحوم نے اپنے معاصرین کی وفات پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔ جو زبان و بیان گہرائی اور گیرائی اور لفظ و معنیٰ - ہر لحاظ سے اردو ادب کا انمول سرمایہ ہیں۔ اب ان کی موت کے قومی اور ادبی نقصان پر قلم اٹھانے کے لئے ایک عبدالحق ہی کی ضرورت ہے۔ مولوی صاحب کی مدت حیات شمسی مہینوں کے حساب سے اکیانوے سال اور قمری سال و ماہ کے اعتبار سے ۹۴ سال ہوئی ان کی ادبی عمر کی ساٹھ پینسٹھ سال سے کیا کم ہوگی - . عبدالحق جیسے عظیم و ذہین انسان کی زندگی کے ۶۰، ۶۵ سال اردو زبان کے عشق اور اس کی خدمت میں بسر ہوئے۔ بیسوی صدی کے نصف اول میں تمام اہل قلم اور تمام اہل علم حضرات نے مل کر اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت کی ہے اکیلے بابائے اردو نے اس سے کم خدمت نہیں کی۔ مولوی صاحب مرحوم کی تخلیقی اور ادبی زندگی کا سب سے بڑا رجحان - ان کی عقلیت پسندی تھی۔ یہ رجحان انھیں سرسید و حالی سے ورثے میں ملا تھا۔ اردو زبان کا نام سن کر تو کبھی کبھی ان پر جذباتیت کا دورہ ضرور پڑجاتا۔ اور یہ اس لئے۔ کہ انھوں نے دنیا کی ہر خوشی کو تج کر اردو اور صرف اردو کو اپنا لیا تھا۔ ویسے زندگی کے ہر شعبے میں ان کا نقطۂ نظر بے حد متوازن ہوا کرتا تھا۔ وہ اسلاف کی اچھی اور ستھری روایات کے نہ صرف قدردان بلکہ ان پر کاربند بھی تھے۔ اور جس چیز کو حق سمجھتے۔ پھر اس پر مجاہدانہ شان سے ڈٹ جاتے۔ میں نے ایک سے زیادہ مواقع پر۔ بابائے اردو کو - اہل اقتدار کے مجمع میں دیکھا ہے۔ اس طرح کہ وہ سربلند نظر آتے تھے۔ اور سب خمیدہ کمر۔ انھیں اپنے گردوپیش ہر جگہ بھنگے منڈلاتے ہوئے دکھائی دیتے۔ جس شخص نے سرسید کی آنکھیں دیکھی اور حالی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ تھا۔ وہ بڑے تحمل سے ان بھنگوں کا مقابلہ کرتا۔ اور اپنی عظیم شخصیت کو ان کی یلغار سے بچائے رکھتا۔

مولوی صاحب کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جو اینٹ گارے کے بغیر پورا مکان چن لیا کرتے ہیں۔ جب ۱۹۱۲ء میں انھیں انجمن ترقی اردو (ہند) کا سکریٹری چنا گیا تھا۔ تو نئی خدمت کا جائزہ لیتے وقت مولوی عبدالحق کو اپنے پیش رو۔ مولانا شبلی مرحوم سے انجمن کا جو اثاثہ اور سرمایہ ملا تھا۔ وہ چند رجسٹروں اور ایک ٹوٹے پھوٹے صندوق پر مشتمل تھا۔ اس ٹوٹے پھوٹے صندوق سے رفتہ رفتہ مولوی صاحب نے پوری انجمن ترقی اردو کو برآمد کرلیا۔ جیسے جادوگر طلسمی ٹوکرے میں رومال بند کرکے زندہ خرگوش نکال لیا کرتے ہیں۔ کراچی کا مشہور اردو کالج بھی بابائے اردو کے اسی معجزہ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ ۹۰ سال کی عمر میں انھوں نے اردو یونیورسٹی کا نعرہ بلند کیا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اک نہ اک دن مولوی صاحب کے خواب کی تعبیر نکل آئے گی۔ اردو یونیورسٹی بن جائے گی۔ حکومت

نہ بنائے گی تو عوام بنائیں گے۔ عوام سو جائیں گے تو انھیں طلباء جگائیں گے۔ وہ طلباء جن کے حقوق کے لئے بابائے اردو بستر مرگ پر بھی کوشاں رہے

مولوی عبدالحق کی زندگی (اور موت بھی) ان لوگوں کے لئے نمونہ عمل ہے، جو علم و ادب کی خدمت کو اپنی زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ کراچی میں اگر لوگوں نے مکان بنائے۔ کارخانے کھولے، جائدادیں پیدا کیں۔ اور بنک بیلنس قائم کئے۔ مولوی صاحب مرحوم و مغفور نے صرف اردو کالج قائم کیا۔ اور انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی بنیاد ڈالی۔ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ یہ ہم سے سن لیجئے۔ مستقبل میں یہ ہونے والا ہے۔ مکان ڈھ جائیں گے۔ مکین مر جائیں گے۔ کارخانے بند ہو جائیں گے۔ جائدادیں چھین لی جائیں گی اور بنک دیوالیہ ہو جائیں گے۔ مگر مولوی عبدالحق کا قائم کیا ہوا۔ "اردو کالج" نہ صرف دن بدن چھوٹا اور اونچا ہوتا چلا جائے گا بلکہ وہ ایک روز تمام پاکستان کا احاطہ کرے گا۔ وہ علم کے لئے جئے اور علم کے نام پر مرے۔ اب یہ ابدی اور غیر فانی علم ہی ہے۔ جو عبدالحق کی نہ مٹنے والی شخصیت اور عظمت کے فتح مندانہ جلوس کی رہنمائی کرے گا۔

میں خود اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ میں نے ہر کو چک کے کسی بڑے سے بڑے سیاسی رہنما یا صاحب اقتدار کی خبر مرگ سن کر اپنی زندگی میں خلاء محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب اسی کراچی میں مولانا سیماب مرے، آرزو لکھنوی مرے۔ سلیمان ندوی کو موت آئی۔ یا جب میں نے مولانا ظفر علی خاں۔ چراغ حسن حسرت اور مولانا عبدالمجید سالک کی وفات کی خبریں سنیں تو ہر شخص کی موت مجھے اپنا نقصان نظر آئی۔ مرحوم حرمان خیرآبادی کی موت تک ــــ جو غریب کس مپرسی کے عالم میں مرگیا۔ تمام زندہ انسان۔ عدم کی منزل کی طرف دو راستوں سے سفر کرتے ہیں۔ ایک راستہ نیستی کا راستہ ہے کہ آدمی مرا تو سچ مچ مرگیا۔ دوسرا راستہ غیر فانی زندگی کا ہے کہ مرنے والا مرتے ہی پہلے کی نسبت زندہ تر اور پائندہ تر ہو جاتا ہے۔ جیسے غالب۔ جیسے حالی۔ جیسے اقبال اور جیسے عبدالحق ــ لہٰذا یہ مت کہو کہ مولوی عبدالحق مرگئے ــ یہ کہو کہ مولوی عبدالحق جی گئے ــ

مولوی عبدالحق زندہ باد

تحریک اردو یونیورسٹی پائندہ باد

ــــ روزنامہ جنگ کراچی ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء

رانا محمد بہاء الحق اشک

قطعہ تاریخ وفات

فریاد ازیں گنبد گردان فریاد
از دست او وقت اشک باری بیداد
بسپرد بخلاق چو جان عبدالحق
سالش شدہ "شد خانہ اردو برباد"

۱۳ ہ ۸۱

"لیل و نہار" ۳ر ستمبر ۱۹۶۱ء

افضال صدیقی

بزمِ سیّد کی آخری شمع بجھ گئی

کسی مفکر نے سچ ہی کہا ہے کہ ایک عالم کی موت ایک عالم کی موت ہوتی ہے۔ یہ قول بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی المناک وفات پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ واقعی ان کے اٹھنے سے ایک فرد کی موت نہیں ہوئی بلکہ ایک عہد مرگیا ہے۔ ان کی رحلت تہذیب و ثقافت، زبان و ادب کی ایک صدی کی موت ہے۔ بابائے اُردو کیا گئے کہ انجمن کی بساط ہی سمٹ گئی۔ زبان کی تاریخ کا پورا دور ختم ہوگیا۔ اردو کے سر پر سے سایۂ عاطفت اٹھ گیا۔ بزمِ سرسید کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔ وہ ایک مقصد کے لئے جئے اور اسی مقصد کے لئے اس جہاں سے سدھار گئے۔

"جو لوگ کسی مقصد کے لئے کام کرتے ہیں وہ مرتے نہیں ہیں" یہ بابائے اردو ہی کا قول ہے کون کہہ سکتا ہے وہ رحلت کر گئے ہیں۔ جسنے تمام عمر زندہ دلی کو اپنا شعار بنائے رکھا ہو، جس نے سچی لگن۔ اور جوانوں کی سی ہمت اور توانائی کے ساتھ آخر دم تک ایک ہی دھن دل میں اور ایک ہی سودا سر میں لئے کام کیا ہو۔ جو مرتے دم تک دوسروں کی خیریت پوچھتا رہا ہو۔ مزاج پرسی کرتا رہا ہو۔ انجمن کے کاموں کے سلسلے میں اپنے معاونوں کو ہدایتیں دیتا رہا ہو۔ وہ کیونکر مر سکتا ہے۔ موت خود ان کے پاس آتی ہوئی گھبراتی تھی۔ وہ ہر لحظہ اس پر خندہ زن رہے اور اس کی ایک بھی پیش نہ چلنے دی۔ مگر پھر بھی موقع پاکر یہ ظالم چور دروازے سے ان پر حملہ آور ہو ہی گئی۔ آج وہ عظیم، بھرپور، جاندار اور توانا شخصیت ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے حبیب خاص حکیم اسرار احمد کریوی سے ٹھٹھول کر رہے ہیں۔ مشفق خواجہ کو ہدایت دے رہے ہیں کہ وہ مولانا صدق جائسی کی کتاب کا خیال رکھنا جلد چھپ جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں حسب معمول ان کے ناشتہ کے وقت ان کے پاس پہنچا ہوں۔ اور وہ کافی پیتے ہوئے مجھ سے پوچھ رہے ہیں "سناؤ بھئی اور کتنے پیسے جمع ہوئے؟" اور میں انہیں اردو یونیورسٹی کی تحریک سے بچوں اور نوعمر ادیبوں کی وابستگی اور دلچسپی کا حال سنا رہا ہوں اور وہ بار بار "واہ واہ خوب ہے بھئی شاباش" کہتے جاتے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھ رہے ہیں ایک ایک منظر نظر سے گذر رہا ہے۔ میں ریڈیو پاکستان میں ملازم

ہوں یہ ذکر ۹ برس پہلے کا ہے۔ میں بچوں کے پروگرام کے انچارج کی حیثیت سے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں، ان سے درخواست کرتا ہوں پرسوں اتوار کو سرسید کی برسی ہے۔ آپ کو ان کے بارے میں جتنا کچھ معلوم ہے وہ شاید دوسروں کو معلوم نہ ہو اسلئے آپ زحمت فرما کر بچوں کے پروگرام میں ان کے بارے میں تقریر کر دیجئے۔ وہ کہتے ہیں "ارے بھئی چھوڑو بچے بڑے شیطان ہوتے ہیں" میں بڑی مشکل سے انہیں راضی کر لیتا ہوں۔ وہ میرے صرف اس فقرہ کی وجہ سے راضی ہو جاتے ہیں کہ بچے آپ کی زبان سے سرسید مرحوم کا حال سنکر بہت خوش ہوں گے۔ بس یہ بات انھیں بھا جاتی ہے اور وہ تقریر کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ میں ان سے کہہ رہا ہوں "آپ کو براڈ کاسٹنگ ہاؤس تک زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ میں کل صبح ٹیپ ریکارڈ لے آؤں گا"۔ وہ کہتے ہیں۔ "کیوں، کس لئے میں کیا اپاہج ہوں؟" اور میں یہ سنکر خاموش ہو جاتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگتی ہے کہ میں نے ایسی بات کیوں کہہ دی۔ اچھے خاصے تیار ہو گئے تھے تقریر کے لئے خواہ مخواہ ناراض کر دیا خیر وہ منانے سے مان جاتے ہیں۔ طے پاتا ہے کہ اتوار کو صبح پروگرام سے کچھ دیر پہلے میں انہیں لینے آجاؤں۔ وہ تقریر تیار کر لیں گے۔ اتوار کو اسٹیڈیو میں اندازاً ستر اسی بچوں کو بٹھا کر مولوی صاحب کو لینے کے لئے اسٹاف کار میں انجمن کے دفتر پہنچتا ہوں۔ وہ شیروانی ٹوپی پہنے۔ چھڑی ہاتھ میں لئے تیار بیٹھے ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں "بیٹھو بھئی بیٹھو۔ ذرا سانس لے لو تو چلتے ہیں" میں کہتا ہوں "وقت بالکل نہیں ہے۔ پروگرام شروع ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ کار نیچے کھڑی ہے۔ آپ جلد تشریف لے چلئے" وہ کہتے ہیں۔ "تو پھر پہلے سے کیوں نہ آگئے میں تو بہت دیر سے تیار بیٹھا ہوں۔ اچھا خیر چلو"۔

اور میں مولوی صاحب کو براڈ کاسٹنگ ہاؤس لے آتا ہوں۔ یہاں بچوں نے غدر مچا رکھا ہے کئی چپراسیوں کے سنبھالنے سے قابو میں نہیں آرہے ہیں۔ ایک چپراسی ایک بچہ کو زبردستی پکڑ کر بھگا رہا ہے۔ مولوی صاحب یہ دیکھ کر کہتے ہیں۔ "اس شخص کا کیا کوئی بچہ نہیں ہے؟" میں چپراسی کو روک دیتا ہوں کہ بچہ کو وہیں بیٹھا رہنے دیا جائے۔ مولوی صاحب اسٹیڈیو کے اندر آگئے ہیں۔ سب بچے ملکر سلام کرتے ہیں مولوی صاحب کے چہرے پر شگفتگی آگئی ہے وہ مسکرا رہے ہیں، سلام کا جواب دیکر بیٹھ جاتے ہیں پروگرام شروع ہونے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں۔ آپ دوسرے اسٹیڈیو میں تشریف لے چلئے۔ تقریر وہیں سے نشر ہوگی بچے یہیں بیٹھے سنیں گے" مولوی صاحب کہتے ہیں۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے، زندوں سے تو باتیں کی جا سکتی ہیں۔ خالی مائکروفون سے کیا کہوں مجھے باتیں کرنی ہیں۔ تقریر نہیں"۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا کروں۔ وقت تنگ ہے۔ عین موقع پر اسٹیڈیو تبدیل نہیں ہو سکتے۔ فوراً بھاگتا ہوں۔ کنٹرول روم والوں

سے اسٹیڈیو تبدیل کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ جو قبول ہو جاتی ہے۔ مولوی صاحب اسی اسٹیڈیو نمبر۱۴ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو پاکستان کراچی کا سب سے بڑا اسٹیڈیو ہے جہاں مشاعرے۔ موسیقی کی محفلیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ بچوں کا پروگرام شروع ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کا بچوں سے تعارف کرایا جاتا ہے بچے ایک بار پھر کورس میں "سلام علیکم" کہتے ہیں اور اب مولوی صاحب سرسید کے بارے میں بچوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ بڑا ٹھہرا ہوا۔ سنبھلا ہوا انداز ہے۔ ایک ایک لفظ کو الگ الگ سمجھا سمجھا کر ادا کرتے ہیں۔ بچے چوں چاں کرتے جاتے ہیں مگر وہ انھیں ٹوکے بغیر تقریر کرتے جاتے ہیں۔

بچوں سے بابائے اردو کو کس قدر پیار اور لگاؤ رہا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا یا پھر دو سال پہلے یعنی ۱۶ اگست ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ نوعمر ادیبوں کی انجمن "بزم امروز" کے پہلے عام اجلاس کا افتتاح بابائے اردو ہی کو کرنا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے میں نے انہیں اس کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ میں نے انھیں بتایا تھا۔ یہ اردو کے ننھے منے سودائیوں کی انجمن ہے اور آپ کی رہنمائی کی طالب ہے۔ آپ ہدایت کیجئے "کام ہم کرینگے" وہ بڑی خوشی سے تیار ہو گئے۔ وقت مقررہ پر میں طفیل احمد جمالی۔ اور عزیز کارٹونسٹ انہیں وکٹوریا میں پاکستان چوک پر انجمن ترقی اردو کی لائبریری میں لا رہے ہیں۔ اپنے دفتر کی سیڑھیوں سے اترنے پہلے میں نے مولوی صاحب کا بازو تھام لیا ہے۔ مگر انہوں نے یہ کہکر چھڑا لیا "کیوں؟ کیا تم مجھے بوڑھا سمجھتے ہو؟" اور جب وہ وکٹوریا سے اترنے لگے تو جمالی صاحب نے انہیں سہارا دینا چاہا مگر وہ اس سہارے کی پرواہ کئے بغیر اپنی چھڑی نیچے ٹیک کر اتر آئے۔ جلسہ گاہ میں پہنچے۔ ابتدائی تقریروں کے بعد مولوی صاحب سے تقریر کے لئے درخواست کی گئی انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ جمالی صاحب نے ان سے درخواست کی "مولوی صاحب اس جلسہ میں اندرون سندھ کے بھی بہت سے بچے شریک ہیں۔ جنہیں شاید آئندہ کبھی آپ کے منہ سے چند الفاظ سننے کا موقع نہ ملے اسلئے آپ کا تقریر کرنا ضروری ہے۔ آپ کے چند الفاظ ان بچوں کو زندگی بھر انسپائر کرتے رہیں گے۔" یہ سن کر مولوی صاحب چونک سے پڑے "میری تقریر سے انسپائر ہوں گے۔ کیا مذاق کر رہے ہیں آپ؟" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ وہ اور زیادہ بوڑھے نظر آنے لگے ایک وہ زمانہ بھی تھا جب وہ دریا گنج دہلی میں بیٹھ کر جوانوں سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اردو زبان کی حمایت میں گاندھی اور نہرو جیسی شخصیتوں سے ٹکر لیتے تھے۔ اور سارا ہندوستان ان کی آواز پر کان لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ اور اب ان آنکھوں نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ مولوی صاحب پاکستان چوک کراچی کی ایک فرسودہ بوسیدہ سی میلی کچیلی عمارت کے ایک چھوٹے سے ہال میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے

تقریر کرنے سے اسلئے انکار کر رہے ہیں کہ ان کے خیال
میں اب ان کی بات سننے اور سمجھنے والا کوئی نہیں
رہا۔ بڑے تو بڑے، چھوٹے بچے بھی انہیں مردہ ماضی
کی زندہ تصویر کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ مولوی صاحب
بار بار اپنی تھکی ہوئی مایوس آنکھوں سے چاروں طرف
دیکھتے تھے شاید وہ ہمارے چہروں سے یہ معلوم
کرنا چاہتے ہوں کہ ہم ان کے بارے میں کیا سوچ
رہے ہیں۔ "ایک بے جان ماضی کا جنازہ یا ایک
درخشاں مستقبل کی پکار!" بہزار دقت مولوی
صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ ان سے بہت
کہا کہ آپ بیٹھے رہیں۔ مگر وہ نہ مانے اور کھڑے
کھڑے تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ "اردو صرف
ایک زبان نہیں ہے بلکہ ہماری قوم کی پوری تاریخ
ہے۔ اگر تاریخ مٹ جائے تو زبان گناہ گار سمجھی جائے
گی کوئی شخص غیر زبان کو کتنا ہی سیکھ لے پھر بھی وہ
غیر زبان ہوتی ہے اپنی زبان سے محبت کرنا دراصل
اپنے ملک اور قوم سے محبت کرنا ہے۔ جو لوگ اپنی
زبان استعمال نہیں کرتے یا استعمال کرنے میں شرم
محسوس کرتے ہیں وہ بے غیرت ہیں۔ آخر میں بابائے
اردو بڑے رقت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔ بچو! لوگ
مجھے بابائے اردو کہتے ہیں مگر پاکستان میں آکر تو
میں "طفل اردو" ہوگیا ہوں۔ وہ کام اب تم لوگ
پورا کرو جسے میں پورا نہ کرسکا۔" یہ کہتے کہتے ان کی
آواز گلے میں رندھ گئی۔ اور پھر بڑی مشکل سے
وہ اپنی تقریر جاری رکھ سکے۔

اس کے ایک سال بعد بابائے اردو کی اپیل
پر سب سے پہلے بچوں نے لبیک کہا اور چند ماہ
کے اندر اردو یونیورسٹی فنڈ میں دینے کے لئے دو سو
ستر روپے جمع کر لئے۔ میں یہ مژدہ سنانے مولوی
صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے سنا تو بڑے خوش
ہوئے انہیں ایسا لگا جیسے ان کی نظروں کے سامنے
اردو یونیورسٹی کی عمارت تعمیر کی جارہی ہے۔ میں
نے درخواست کی کہ بزم امروز کے اراکین یہ حقیر رقم
ایک جلسہ میں آپکو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر وہ
فوراً تیار ہوگئے۔ یہ جلسہ اردو کالج کے ہال میں ہوا۔
پورا ہال بچوں اور بڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ مولوی صاحب
اس مجمع کو بڑی توقعات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔
محسن علی خاں ڈپٹی کلکٹر شاہد احمد دہلوی اور چند
بچوں کی تقریروں کے بعد مولوی صاحب کی خدمت
میں ۲۷۰ روپیہ کا نذرانہ پیش کیا گیا تو ان کے ہاتھ یہ
رقم لیتے ہوئے کانپ گئے۔ خلاؤں میں گھورتے ہوئے
انہوں نے بچوں کا شکریہ ادا کیا اور بڑے دکھ بھرے
لہجے میں کہنے لگے۔

"تقریروں میں میرے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے
اس کا میں مستحق نہیں ہوں۔ یہ سنکر مجھے ایسا
محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔
آپ نے بار بار مجھے بابائے اردو کے نام سے
یاد کیا مگر میں کیا کہوں میں تو یہاں طفل
اردو بنکر رہ گیا ہوں بچوں سے اسلئے مجھے امید
اور انہی سے توقع بھی ہے جس کام کی میں تکمیل تک

نہ پہنچا سکا اسے یہی پورا کرینگے۔ اس سے بڑھکر میرے لئے مسرت کی بات اور کیا ہوگی کہ بزم امروز کے بچوں نے سب سے پہلے اردو یونیورسٹی کے لئے رقم دی۔ اس رقم کا ایک ایک روپیہ میرے لئے ایک ایک ہزار روپے کی برابر ہے۔ ان بچوں نے جس ایثار سے کام لیا ہے بڑوں کو اس پر شرم آنی چاہیئے کہ جو کام وہ نہ کرسکے اس میں بچوں نے پہل کردی۔

اور پھر انہوں نے کہا۔

"اردو یونیورسٹی پاکستان میں اردو کے وقار کو بڑھائے گی۔ اسے وسعت دے گی۔ اور پھر اس زبان کا شمار دنیا کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ زبانوں میں ہونے لگے گا۔ اردو یونیورسٹی بلاشبہ اردو کا بہت بڑا قلعہ ہوگی۔ اور پھر ایک دن یہ یونیورسٹی بین الاقوامی یونیورسٹی بن جائے گی۔

اس جلسہ کے بعد متعدد مقامات پر طلبا نے اردو یونیورسٹی فنڈ کے لئے رقومات جمع کیں اور بابائے اردو کی خدمت میں پیش کردیں۔ مگر بڑوں کی طرف سے بڑی رقم اس فنڈ میں آجتک پیش نہیں کی گئی۔ بس مولوی صاحب نے خود وہ دس ہزار روپے اردو یونیورسٹی فنڈ میں دیدیئے جو صدر ایوب نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں دئے تھے۔ صدر ایوب کو اس بات پر حیرت تھی کہ یہ کیسا شخص ہے جس کا نام میں آٹھ سال کی عمر سے سن رہا ہوں اور یہ ایک ہی دھن کے ساتھ ایک ہی مقصد کے لئے مستقل طور پر سرگرم عمل ہے۔ ان کی اسی والہانہ عقیدت کا نتیجہ تھا کہ بابائے اردو کو انہوں نے کمال محبت سے علاج کے لئے مری بلالیا اور آخر وقت تک اپنی تمام تر توجہات ان ہی پر مرکوز رکھیں مگر لاعلاج مرض نے صدر کی مہربانیاں بھی مجبور بنادیں۔ یہ اردو کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی، اور یہ اردو کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ آج وہ واقعی یتیم ہوگئی ہے۔

جس روز بابا کا انتقال ہوا اس روز میں صبح ساڑھے نو بجے ریڈیو پاکستان پہنچا تو خبر ملی کہ اردو کا سہاگ لٹ گیا۔ اسی روز صبح یہ خبر اخباروں میں نظر سے گذرچکی تھی کہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ مولوی صاحب پر آج کی رات کٹھن ہے دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ لاعلاج مرض کی خبر سنکر لوگ پہلے سے ذہنی طور پر اس صدمۂ عظیم کو سہنے کے لئے آمادہ تھے۔ ان کی رحلت کی خبر لوگوں پر برق بنکر تو نہیں گری مگر سب کو نڈھال ضرور کرگئی۔ میں سیدھا روزنامہ "جنگ" کے دفتر پہنچا۔ دروازہ پر جنگ کے جنرل منیجر صاحب مل گیئے۔ وہ اسی حادثہ کی تفصیلات معلوم کررہے تھے۔ ضمیمہ نکالنے کا پروگرام منسوخ ہوچکا تھا۔ دوسرے روز شائع ہونے والے اخبار کے اندر کے صفحات کی کاپیاں پریس جانے والی تھیں۔ اب یہی صورت تھی کہ اول اور آخر صفحے پر اس واقعہ کی تفصیلات شائع کردی جائیں۔ وہاں سے ایک صاحب مجھے لے کر انجمن ترقی اردو کے دفتر پہنچے کہ مولوی صاحب کی کچھ غیر مطبوعہ تصویریں مل جائیں۔ اردو کالج کے احاطے میں داخل ہوئے تو کمشنر مدنی صاحب اور ڈی آئی جی پولیس کو

مصروف گفتگو پایا۔ ایک طرف ایمبولینس کھڑی تھی جس میں بابائے اردو کی میت جنرل ہسپتال سے یہاں لائی گئی تھی۔ اور دوسری طرف ایک شامیانہ میں بابا کی میت رکھی ہوئی تھی۔ مدنی صاحب طے کر رہے تھے کہ نماز جنازہ شام کو پونے چھ بجے ادا کی جائے اور تدفین ساڑھے چھ بجے عمل میں آئے۔ پل اور وہ مجھے انہیں مصروف گفتگو چھوڑ کر انجمن کے دفتر کی طرف جانے لگے۔ نیچے کتب خانہ عام سے آگے باورچی خانہ اور گیراج کو ڈھایا جا رہا تھا۔ بابائے اردو کی آرام گاہ کے لئے جگہ نکالی جا رہی تھی۔ مری سے واپسی پر بابائے اردو نے وصیت کی تھی۔ مجھے اُردو کالج کے احاطہ ہی میں دفن کیا جائے۔ ان کی وصیت پر عمل کیا جا رہا تھا۔ ہم اوپر پہنچے۔ کتب خانۂ خاص کو مولوی صاحب کے انتقال سے کئی روز پہلے ہی سر بمہر کر دیا گیا تھا تاکہ امانت میں خیانت نہ ہو، یہ مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ ہے اتنا بیش قیمت کتب خانہ کوئی اور نہیں ہے۔ پتہ چلا کہ مولوی صاحب کی کوئی ایک ہزار مختلف تصویریں ہیں جو کتب خانہ ہی میں مقفل ہو گئی ہیں۔ ہر شخص ہراساں اور سوگوار تھا۔ کسی کو ان کی تصویر تلاش کرنے کی فرصت اور مہلت نہ تھی۔ تلاش بسیار کے بعد بالآخر مشفق خواجہ ایڈیٹر "قومی زبان" نے ایک تصویر نکال ہی دی۔ جو مولوی صاحب کی تازہ ترین تصویر تھی جس میں کوئی اور شامل نہیں تھا۔ یہ تصویر مئی میں کرنل رشید صاحب نے کھینچی تھی (یہی تصویر جنگ میں شائع ہوئی)، قومی زبان کے دفتر میں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ سب کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ساری فضا پر اداسی طاری تھی۔ یہیں باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے آخری خط جناح ہسپتال سے انجمن کے دفتر بھجوایا تھا۔ خط دیکھا۔ انگریزی میں تھا۔ اس پر ۲۰ مئی کی تاریخ پڑی ہوئی تھی جبکہ وہ صدر ایوب کے مہمان کی حیثیت سے مری نہیں گئے تھے۔ اس میں لکھا تھا۔

"تمام ڈاکٹر ناکام ہو چکے ہیں۔ میں نے ان سب کو چار روز کا الٹیمیٹم دے دیا ہے۔ میری حالت بہت نازک ہو چکی ہے اور اللہ مجھ سے بہت دور ہے۔ اور صدر ایوب تک رسائی ممکن نہیں۔

اس خط کے بارے میں میں کچھ اور نہیں بتا سکتا لیکن اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بابائے اردو کی طبیعت بہت دنوں پہلے کس حد تک بگڑ چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے آخر وقت تک انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر انھیں اپنے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے۔ مایوسی کو ایک بار بھی انہوں نے اپنے قریب نہیں آنے دیا جس تمنا نے عمر بھر انہیں جواں رکھا اسی تمنا کے سہارے مرتے دم تک وہ موت سے پنجہ کش رہے۔ اسی طرح زندگی اور زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے رہے جیسے وہ بالکل صحت مند چاق و چوبند ہوں جیسے یہ بیماری بہت معمولی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے ایک طرف بابائے اردو کے چھوٹے بھائی مولوی احمد حسن ریٹائرڈ انجینئر آبدیدہ بیٹھے تھے۔ وہ بتلانے لگے کہ مری جانے سے پہلے میرے بیٹے نے مولوی صاحب کے بازو پر امام ضامن باندھا رومال بہت قیمتی تھا۔ مولوی صاحب اسے دیکھ کر کہنے لگے اسے

بھی بہ گیا۔ کچھ باندھ دیا ہے۔ "تمہیں خبر نہیں میرے ساتھ
حکیم اسرار احمد بھی جا رہے ہیں"۔ گویا اس حالت میں بھی
زندہ دلی کا یہ عالم تھا۔ مولوی صاحب کے ساتھ انکے
چھوٹے بھائی احمد حسن۔ مولوی صاحب کے بھتیجے اور حکیم
اسرار احمد کریوی۔ اور مولوی صاحب کا خادم سوائی
سب پنڈی سے آئے تھے اور ہسپتال میں بھی ساتھ ہی
تھے۔

مغموم حکیم اسرار احمد کریوی بتانے لگے "میرا ان کا
تیس چالیس برس تک ساتھ رہا ہے انہیں اب
مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے مسلم لیگ
کی تحریک آزادی کی شہ رگ کو جو خون ملا ہے۔
وہ اردو تحریک ہی سے ملا ہے جسے برصغیر میں مولوی
صاحب ہی نے شروع کیا تھا جس کے لئے انھوں
نے ہندوستان بھر کا سفر کیا۔ اور بڑے بڑوں کو
نیچا دکھا دیا۔ انسان کی سیرت و کردار کا جتنا
اچھا مطالعہ اس کے ساتھ سفر کرنے میں کیا
جا سکتا ہے وہ کسی اور طرح نہیں ہو سکتا۔
میں نے اس دوران ہمیشہ انہیں صاحب عزم
و ہمت پایا۔ اور کبھی اردو یا انجمن کی سرگرمیوں
سے غافل نہ دیکھا"۔

اور مولوی احمد حسن مولوی صاحب کے آخری ایام
کا ذکر کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔
"میرے مرحوم بھائی بیحد مشفق اور محبت کرنے
والے انسان تھے۔ مجھ سے اور میرے بچوں سے
قلب کی گہرائیوں کے ساتھ محبت بلکہ عشق کرتے
تھے۔ جب کسی بچے کی بیماری کی خبر سنتے فوراً دیکھنے
آجاتے۔ تیمارداری اور دلداری کرتے۔ سب کی
ڈھارس بندھاتے۔ اپنے ساتھ پھل لاتے اور
بعد میں بھی پھل وغیرہ بھجوا کرتے۔ آخری دنوں میں
میرے پوتے کے واسطے گاڑی خریدی اور خود
لا کر پیش کی۔ جب وہ مری میں تھے تو وہاں مال روڈ
سے میرے لئے ایک قیمتی چھڑی خریدی تھی۔ جب
وہ نیول ہسپتال آئے تو سب سے پہلے انہوں
نے چھڑی مجھے پیش کی۔ میں کیا کہوں۔ ایک ایک
بات کے ذکر پر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ آج میرے خاندان
کا آخری سہارا اٹھ گیا ہے۔ یہ دکھ کوئی میرے دل
سے پوچھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے"۔

اور وہ یہ کہہ کر ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے۔ ان
کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی غم سے نڈھال تھے۔ اور
مولوی صاحب کا ایک ایک واقعہ اپنے آپ ہی اس
طرح دہرا رہے تھے جیسے وہ سب کچھ دوبارہ اپنی آنکھوں
سے دیکھ رہے ہوں"۔

ہم ان لوگوں کو مولوی صاحب کی باتیں کرتے چھوڑ
کر نیچے اترے تو اردو کالج کے باہر لوگوں کا بے پناہ ہجوم
تھا جو بابائے اردو کے آخری دیدار کے لئے مضطرب تھا
پولیس کا زبردست پہرہ تھا کسی کو اندر آنے کی اجازت
نہ تھی۔ ہجوم میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عرش صاحب
کی کار میں بیٹھے ہوئے شہر سے گزرے تو دکانیں بند ہوئی
تھیں۔ موٹروں میں اعلان کیا جا رہا تھا کہ بابائے اردو کا
آج صبح انتقال ہو گیا۔ ان کی نماز جنازہ شام کو پولو نے

چھ بجے میونسپل گراؤنڈ میں ادا کی جائے گی اور ساڑھے چھ بجے انہیں سپرد خاک کیا جائے گا۔ سارے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ مغموم اور اداس گھروں سے دفتروں سے اور طلبا اسکولوں اور کالجوں سے نکل کھڑے ہوئے۔ سہ پہر تک سارا شہر غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ شام سے پہلے ہی کارپوریشن سے لے کر عیدگاہ تک ٹریفک بند کر دیا گیا۔ ہر طرف لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ اسقدر نظم وضبط اور بابائے اردو سے اسقدر والہانہ عقیدت کا اظہار کسی اور بڑے آدمی کی موت پر بھی نہیں دیکھا گیا۔ باقی ساری تفصیلات اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

صحیح حالات زندگی

میں نے مختلف مقامات سے اور مختلف لوگوں سے مل کر بابائے اردو کے جو حالات زندگی معلوم کئے ہیں انہیں مختصر طور پر بیان کئے دیتا ہوں۔ مولوی صاحب کی عمر گذشتہ کئی دنوں سے ۹۳ یا ۹۴ سال لکھی جارہی ہے جو غلط ہے۔ کل بھی مولوی صاحب کی صحیح تاریخ شائع نہیں ہوئی مارچ ۱۸۷۰ء لکھا گیا۔ اصل میں بابائے اردو ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۹۱ برس اور ۴ مہینے ہوتی ہے یہ بھی غلط ہے کہ وہ ہاپڑ میں پیدا ہوئے۔ ہاپڑ کے قریب ایک مقام ہے سراوان۔ مولوی صاحب اسی قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان میرٹھ اور دہلی کے نواح میں "قانون گو شیوخ" کے لقب سے مشہور رہے "قانون گو" کا لقب اس نسبت سے ملا کہ ان لوگوں میں محکمہ مال کی ملازمت پشت ہا پشت سے چلی آتی ہے۔ مولوی صاحب کے والد جناب شیخ علی حسن مرحوم مدت مدید تک پنجاب کے محکمہ مالگذاری سے وابستہ رہے اور اسی تعلق کی بنا پر مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم پنجاب کے علاقوں فیروزپور لائلپور وغیرہ میں ہوئی جہاں سے مڈل کے بعد انہیں ۱۰ سال کی عمر میں علی گڑھ بھیج دیا گیا مولوی صاحب نے وہیں سے ۱۸۹۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ مولانا حالی ان پر بطور خاص مہربان تھے چنانچہ مولوی صاحب کی تحریر اور ان کی سادہ زندگی پر مولانا حالی کا اثر نمایاں بلکہ غالب ہے علیگڑھ کے زمانہ میں مولوی صاحب سرسید احمد خاں کے بڑے چہیتے طالب علم تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب سرسید نے علیگڑھ کے طلباء کے لئے سیاہ ترکی کوٹ۔ اور ترکی ٹوپی کی یونیفارم تجویز کی تو خود تین کوٹوں کا کپڑا خریدا۔ ایک اپنے کوٹ کے لئے۔ دوسرا سید محمود کے لئے اور تیسرا ہمارے مولوی صاحب کے لئے۔ سرسید کی ذات سے مولوی صاحب کو بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر سرسید کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہی سرسید تحریک کے آخری نمائندے تھے۔ گویا آج اتنے برسوں بعد اس تحریک نے آخری سانس لیا ہے

شروع میں ریاضی مولوی صاحب کا خاص مضمون رہا۔ اور اپنے ہم سبق ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم کے حریف مانے جاتے تھے۔ بی اے میں فلسفے سے شغف ہوا۔ سولہ سترہ برس بعد تک شمس العلماء مولوی خلیل احمد

انہیں فلاسفر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مولانا ظفر علی۔ میر محفوظ علی بدایونی۔ خواجہ غلام الثقلین اور چوہدری خوشی محمد ناظر ان کے معاصرین میں تھے۔

بی اے کے بعد مولوی صاحب کاروبار کے ارادہ سے بمبئی چلے گئے۔ وہاں نواب محسن الملک نے انہیں کچھ دنوں تک انگریزی خط و کتابت میں لگایا۔ پھر کرنل افسر جنگ بہادر ان کو اپنے ساتھ حیدر آباد دکن لے گئے۔ اور مدرسہ آصفیہ کا صدر مقرر کر دیا ۱۸۹۶ء میں مولوی صاحب نے وہیں سے رسالہ "افسر" جاری کیا۔ جو کچھ دنوں تک چل کر بند ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ہوم سکرٹری کے دفتر میں منتقل ہو گئے۔ اور تقریباً پندرہ برس تک مترجم کی خدمات انجام دیتے رہے۔

مولوی صاحب ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ اگرچہ انجمن ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت عالم وجود میں آچکی تھی۔ اور اس شعبہ کی انچارج مولوی عزیز مرزا اور مولانا شبلی جیسی عظیم و مقتدر شخصیتیں رہ چکی تھیں لیکن جس وقت مولوی صاحب کو انجمن ملی۔ اس وقت اسکا سرمایہ ایک شکستہ صندوق جو رسی کے ٹکڑوں سے بندھا ہوا تھا ایک قلمدان جس کی دوات خشک ہو چکی تھی۔ اور ایک قلم جس کی نب ندارد تھی۔ مولوی صاحب کے چارج میں آیا۔ حالات حوصلہ شکن تھے۔ اور سرسید اور محسن الملک کے بعد مسلمانوں کی نئی نسل جو انگریزی مدارس میں تربیت پا کر نکل رہی تھی۔ اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی ثقافتی روایات کی عظمت و اہمیت سے یکسر بے خبر و بیگانہ ہو چکی تھی۔ ان صبر آزما حالات میں مولوی صاحب نے شبانہ روز محنت کر کے انجمن کو ایک مستقل حیثیت عطا کی اور ان تھک کام کر کے اسے ایک جداگانہ تحریک کی صورت بخشی۔

مولوی عبدالحق صاحب گذشتہ پچاس برس تک تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ ایک ہی لگن تھی اور وہ تھی اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔

مولوی صاحب کی پہلی تصنیف:۔ مولوی صاحب کی پہلی تصنیف اردو زبان کا قاعدہ ہے۔ اردو صرف و نحو یہ کتاب پہلی بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسے پڑھ کر ہمارے دل میں اردو زبان کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ زبان دنیا کی علمی زبانوں میں شمار ہونے کا حق رکھتی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت سے کئی سال پہلے مولوی صاحب کے عزیز دوست اور ہم سبق مولانا ظفر علی خاں مرحوم حیدر آباد پہنچے وہ سرکاری فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دو رسالے بھی نکالتے تھے۔ ایک افسانہ جس میں انگریزی ناولوں کے ترجمے قسط وار چھپتے تھے۔ دوسرا "دکن ریویو" جو عام ادبی ماہنامہ تھا۔ مولوی صاحب کو ہر مہینے اس کے لئے مضمون لکھنا ہوتے تھے۔ انہی میں ایک مبسوط مقالہ "عالم اسلام"

چند قسطوں میں کوئی تین سو صفحات پر چھپا پھر بھی ناتمام رہا اس مقالہ کا اقتباس مولانا حسرت موہانی کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" میں نقل ہوا۔ اور اسی بنا پر ان کے سر الزام بغاوت آیا۔ بہت سی ادبی تنقیدات بھی مولوی صاحب کے قلم سے "دکن ریویو" میں نکلتی رہیں ان میں سے دو نے خاصی ہلچل مچادی تھی۔ ایک "مثنوی گلزار نسیم" پر دوسری جلیل مرحوم کی کتاب تذکیر و تانیث پر

انہی ایام میں مختلف کتابوں پر مقدمے لکھے۔ ان کی کثرت کی بنا پر صدر الصدور مولانا شیروانی (صدر یار جنگ بہادر) کی ادبی عدالت سے مولوی صاحب کو "مقدمہ باز" کا خطاب ملا یہ اس موقع پر جب حیدرآباد کے محمد بیگ صاحب نے تیس کے قریب مقدمے "مقدمات عبدالحق" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کئے (۱۹۳۱ء) ان میں مولانا ظفر علیخاں کے ترجمہ معرکۂ مذہب و سائنس" کا مقدمہ بجائے خود ایک فاضلانہ محاکمہ ہے۔ انہی کے ڈرامے "جنگ روس و جاپان" پر ایک اور دلچسپ مقدمہ تحریر کیا تھا جس میں دول یورپ خصوصاً برطانیہ کی ہوس ملوکیت پر تعریض کے نشتر چلائے تھے۔ ایک قابل ذکر مقدمہ وہ ہے جو کتاب "فلسفہ ازدواج" پر لکھا درآں حالیکہ مولوی صاحب کی عمر خود تجرد میں بسر ہوئی۔ تاہل کی مسرت و مصیبت دونوں سے عملاً ناآشنا رہے۔

۱۹۱۱ء میں مولوی صاحب حیدرآباد کی نوکری سے کچھ دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ ادھر مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے مجوزہ اخبار "ہمدرد" کی ادارت کی دعوت بھیجی۔ مولوی صاحب طویل رخصت لینے پر تیار ہو گئے لیکن محکمۂ تعلیم کے ناظم ڈاکٹر سراج الحسن مرحوم نے عماد الملک سے کہکر انہیں روک لیا۔ اور پہلے مددگار ناظم اور پھر صدر مہتمم تعلیمات کے عہدے پر ترقی دی۔ اگلے سال کے آخر میں علیگڈھ کی تعلیمی کانفرنس نے اپنے شعبہ (ترقی اردو) کا سکرٹری منتخب کیا اور اس کا دفتر بھی اورنگ آباد منتقل ہو گیا

مولوی صاحب کی زندگی کا یہ (اورنگ آبادی) دور علمی اور عملی دونوں اعتبار سے پہلے پر فوقیت رکھتا ہے۔ اورنگ آباد میں شہر کے باہر مقبرہ رابعہ درانی بیگم کے پیچھے سیدھے سادے بنگلے میں اقامت اختیار کی تھی۔ اس کے آگے کھیت جنگل پہاڑیاں چلی گئی ہیں ایک اور اقامت خانہ ویران دولت آباد کے باہر (رسالے میں) بنا لیا تھا۔ علمی مشاغل کے لئے یہ تنہائیاں بہت عزیز تھیں۔ اردو کے لئے بعض تحقیقی مضامین انہی ایام میں شائع ہوئے۔ یہ دور بارہ تیرہ سال تک رہا۔ انجمن ترقی اردو کی تنظیم، توسیع، تبلیغ، روپے کی فراہمی، نئی کتابیں لکھوانا۔ ان کی طباعت واشاعت کا انصرام بھی بجائے خود بڑی مصروفیت اور محنت مشقت کا کام تھا۔ اسے مولوی صاحب نے جس محنت اور محبت سے انجام دیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ بیس پچیس برس کی ایسی بے غرض اور بلا وقفہ عرق ریزی کا ثمرہ تھا کہ انجمن

ایک مستقل موقر ادارہ بن گئی۔ اور اس کے بلا واسطہ اثرات نے اردو کو دنیا کی ترقی پذیر زبانوں میں شمولیت کا مستحق ٹھہرایا۔

جامعہ عثمانیہ کی تجویز و تاسیس میں مولوی صاحب کا شروع سے دخل تھا اس کی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لئے پہلے اواخر ۱۹۱۷ء میں "دارالترجمہ" قائم کیا گیا۔ تو اسے چلانے کی ذمہ داری بھی انہی پر آپڑی۔ مہینے کے دو تین ہفتے حیدرآباد میں گذارتے اورنگ آباد کے کام وہ جا کر انجام دیتے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے جو اعلیٰ معیاری کتابیں ان ایام میں تالیف یا ترجمہ ہوئیں۔ تحقیق و تنقید کے جو نئے ابواب کھلے ان کی کیفیت انجمن کی "پنجاہ سالہ تاریخ" میں دیکھنی چاہیئے۔

اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج قائم ہوا تو مولوی صاحب صدر مہتمم کے بجائے صدر کلیہ بنائے گئے (۱۹۲۴ء) پانچ سال بعد پنشن لے لی تھی۔ مگر حکومت حیدرآباد نے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کا صدر مقرر کر دیا۔ پوری تنخواہ کے علاوہ ۱۲۰ ہزار سالانہ کی امداد اردو لغت کے لئے منظور کی۔ انجمن کا دفتر اورنگ آباد ہی میں رہا۔ یہ مقام انہیں وطن سے بھی عزیز تر ہو گیا تھا۔ حیدرآباد سے برابر آتے اور اکثر چھٹیاں یہیں گذارتے تھے۔ انجمن ترقی اردو کا شہرہ ان کے کاموں کے ساتھ بڑھتا گیا۔ ہر سال نئی معیاری کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ دو بلند پایہ رسالے "اردو" اور "سائنس" جاری تھے۔ ٹائپ کا مطبع قائم کیا گیا تھا۔ انجمن کے روز افزوں کاروبار پھر علمی اور تعلیمی مشاغل انہیں مہلت نہ دیتے تھے نہ طبعاً اس طرف رجحان تھا کہ سیاسی نوعیت کے ہنگاموں میں حصہ لیں۔ لیکن ارباب سیاست زبان کو اپنے اکھاڑے میں کھینچ لائے۔ مولوی صاحب کو اردو کی مخالفت دیکھ کر سخت تشویش ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ایک خاص کانفرنس علیگڑھ میں منعقد کرائی۔ اس میں زبان کے حفظ و بقا کی تجویزیں سوچی گئیں۔ پوری تحریک کا مرکز عملاً انجمن کا دفتر بن گیا۔ اور پھر صدر دفتر دہلی منتقل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ قرارداد کے مطابق مولوی صاحب جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری سے دست بردار ہو گئے — اورنگ آباد کی سکونت چھوڑنی پڑی۔ ۱۹۳۸ء کے آخر تک انجمن کا دفتر۔ ذاتی کتب خانہ اور سامان لے کر دہلی چلے آئے۔ پہلے نئی دہلی اور پھر دریاگنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں قیام ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک خود وہ اور ان کے رفیق پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نیز عملہ کے متعدد اشخاص اسی کوٹھی میں رہتے تھے۔ انجمن کے علمی کاموں میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔ تین رسالے اور ایک اخبار "ہماری زبان" پندرہ روزہ شائع کئے جانے لگے۔ مگر ان ترقیوں کے ساتھ مولوی صاحب کے وقت کا بیشتر حصہ اس دفاع جدوجہد کے لئے وقف رہا جس کے سلسلے میں انہوں نے ہندوستان

کے بعید ترین گوشوں میں گشت لگایا۔ انجمن کی صد ہا شاخیں پھیلائیں۔ اردو مکتب۔ مدرسے کتب خانے قائم کرائے۔ جا بجا جلسے مناظرے اور مشاعرے کئے ان سرگرمیوں کے بیان کے لئے جگہ نہیں۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ علمی تگ و اعمال میں مولوی صاحب مذہبی یا سیاسی فرقہ پرستی سے کبھی ملوث نہیں ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں سید سر راس مسعود کے انتقال پر انجمن کی مجلس نظما کا صدر سر تیج بہادر سپرو کو منتخب کیا اور وہ جیتے جی (۱۹۴۸ء تک) اس کے معین و مددگار رہے۔ مولوی صاحب کے دل سے قدر دان تھے غالباً انہیں کی تحریک پر جامعہ الہ آباد نے مولوی صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ سند عنایت کی۔ اس کے تین سال بعد یہ اعزاز مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے حاصل ہوا۔

آزادی اور قیام پاکستان کے بعد مولوی صاحب کی انجمن کا سفینہ دریا گنج سے بہہ گیا اور ساحل کراچی پر جا کر ٹک گیا۔ ۱۹۴۷ء تک عمر بھر کا دوختہ انجمن کو دے چکے تھے۔ باقی تاعف ہوا۔ ہندوستان میں اگرچہ بنا بنایا کھیل بگڑتے اور اپنے ہاتھ کا باغ اجڑنے کا صدمہ سہنا پڑا اور ان کی صحت پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہا۔ مگر دھن۔ لگن۔ محنت۔ شوق اور عالی ہمتی نے سب کڑیاں جھیل گئے۔ ذاتی طور پر مولوی صاحب نہایت سادہ اور راہبانہ زندگی گذارتے رہے۔

مسلسل دماغی محنت میں کوئی نوجوان بھی ان سے بازی نہیں لے جا سکا۔ ہمارے ملک میں بے غرض بے ریا کام کرنے والے کم ہیں۔ مگر کیف وکم دونوں لحاظ سے اتنا کام کرنے والا شاید ایک بھی نہ ملے۔ جن لوگوں نے دہلی میں اور یہاں کراچی میں بارہ بارہ گھنٹے تک مسلسل میز کرسی پر کام کرتے دیکھا ہے وہ آج بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں یہی کام یہی جستجو۔ اور مقصد کی یہی لگن تھی جس نے انہیں اتنی طویل زندگی عطا کی۔ اور وہ اس دنیا سے اٹھ جانے کے باوجود ہمارے درمیان سانس لیتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں" جو لوگ کسی مقصد کی خاطر جیتے ہیں وہ مرتے نہیں" کون کہتا ہے کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور جب تک اردو زبان زندہ ہے وہ بھی زندہ رہیں گے۔ اور ان کا مقصد اب قوم پورا کرے گی۔ اردو یونیورسٹی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا جس طرح پاک سرزمین عالم وجود میں آئی کمشنر مدنی صاحب نے اردو یونیورسٹی کی عمارت کے لئے زمین دینے کا وعدہ کر لیا ہے اب دیر کیا ہے۔ کچھ کام حکومت کرے۔ کچھ عوام کریں گے پھر دیکھیں اردو یونیورسٹی کی تعمیر میں کونسی رکاوٹ باقی رہتی ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی
(۱۴-۱۱-۶۱)

شہلا عاصم ایم اے

ایک فرد۔ ایک تحریک

بابائے اردو کی وفات نہ صرف دنیائے اردو کا ایک عظیم سانحہ ہے بلکہ ان کی موت سے ملک نے ایک گوہر نایاب کھو دیا۔ سرسید اور حالی تحریک کا علمبردار خاموش ہوگیا اور اس طرح وہ ایک پوری صدی جس میں سرسید کا تدبر، حالی کا خلوص شبلی کی علمیت اور نذیر احمد کی طباعی تھی اس کا خاتمہ ہوگیا بابائے اردو کی ہمہ گیر شخصیت نے ان اشخاص کی انفرادی خصوصیات کو اس طرح اپنے اندر سمولیا تھا کہ وہ ان تمام حضرات کی نمائندگی تنہا ہی کر رہے تھے اگرچہ ان کی تمام تر کوششوں کا محور اردو تھی لیکن اس مقصد کے حصول میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے اور جو جد و جہد کی اس نے بابائے اردو کی شخصیت کو زندہ جاوید بنادیا جب تک اردو زبان زندہ ہے بابا بھی زندہ رہینگے۔

بابائے اردو اُن خصوصیات کے مالک تھے جو صرف بڑی شخصیتوں ہی کا حصہ ہوتی ہیں اردو ان کا نصب العین تھا لیکن وہ اس نصب العین کے حصول کیلئے جن دشواریوں اور مصیبتوں سے دوچار ہوئے اور ان دشواریوں اور مشکلوں کے سامنے انہوں نے جس عزم اور حوصلے سے کام لیا اس نے نہ صرف اردو کے مستقبل کو استحکام بخشا بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی علمی ادبی ترقی اور ثقافتی کاموں کا راستہ سمجھایا

شخصیت کی عظمت خاندانی دولت ثروت عزت وجاہ کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ شخصیت انسانی اعمال کا ایک ایسا عکس ہے جو کسی بھی فرد کو انفرادیت بخشتا ہے بابائے اردو کی شخصیت بھی ان کے اطوار، و اعمال کا پرتو تھی جس میں سادگی جفاکشی اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک خود پرداختہ انسان تھے جنہوں نے ایک معمولی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی لیکن شروع ہی سے کچھ کرنے کی لگن تھی۔ جب انسان میں کام کرنے کی لگن ہو اور ساتھ ہی اس میں اس کا خلوص اور دیانت بھی شامل ہو تو منزل کی پرپیچ راہیں بھی ہموار ہو جاتی ہیں بابائے اردو سادگی اور جفاکشی کی زندہ تصویر تھے انہوں نے مشکلات کا مقابلہ خاموشی اور استقلال سے کرنا سیکھا تھا۔ بڑی سے بڑی مصیبت کے سامنے بھی اُن کے یہاں جی چھوٹنے کی کیفیت پیدا نہ ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ نازک سے نازک حالات میں بھی اردو کی ترقی کے لئے کوشاں رہے یہ زبان ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی اور آج اس مقام پر ہے جہاں وہ بول چال کی زبان سے آگے بڑھ کر ایک پوری قوم کی تہذیب اور ثقافت کی نمائندگی کر رہی ہے۔

بابائے اردو نے اپنی محنت اور کاوش سے نہ صرف اردو زبان کو زندہ رکھا۔ بلکہ آپ کی تحقیقی کوششوں کی بنا پر اردو ادب کا وہ سرمایہ آج تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا آج ہمارے سامنے ہے۔ اس طرح آپ نے اس کو نہ صرف از سرِ نو زندگی بخشی بلکہ اپنی بیش قیمت تحقیق کے ذریعہ لوگوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا ان کے تخلیقی کارناموں میں سب سے نمایاں اُن کا انداز تحریر ہے جو سادگی کا مجسمہ ہے لیکن اس سادگی میں کتنی شیرینی کس قدر روانی اور کتنا مٹھاس ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ ہم اُن کے ان مقدمات اور خطبات کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں ادبی تحقیق اور لسانیات کے خشک مسائل سے بحث کی گئی ہے لیکن پڑھنے والا ان خشک مسائل کو بھول کر آپ کی شگفتہ اور رواں دواں تحریر میں کھو جاتا ہے مولوی صاحب کی تحریریں پڑھتے وقت ایک ایسی شخصیت سامنے آتی ہے جو سادگی، خلوص، متانت، عزم اور حوصلہ کا مجسمہ ہے جس کے دل میں قوم کا درد ہے اور ملک کی محبت ہے۔ جب دل پر خلوص جذبات سے سرشار ہو تو تحریر وہ روپ دھار لیتی ہے جو صرف بابائے اردو کا ہی حصہ ہے لیکن بابائے اردو کی صحیح قدر و قیمت ہمیں اس وقت تک نہیں معلوم ہو سکتی جب تک کہ ہم اس اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں جو اردو کو ہماری زندگی میں ہے۔

ہم لوگ عموماً کسی چیز کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے عادی ہیں۔ اس میں تو ہماری یہ فطرت مستور رہتی ہے جس کی بنا پر انسان فطرتاً آرام طلب واقع ہوا ہے یا اس میں ہماری لاپرواہی یا پھر دیگر مصروفیات زندگی شامل ہیں بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے بابائے اردو کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے" ان کے نزدیک وہ صرف صرف ایک اسکالر تھے اور وہ بھی اردو کے۔ اُردو ان کا نصب العین تھا۔ اس وجہ سے وہ اردو کے لئے جئے اور اردو کا داغ لے کر چلے گئے لیکن جو لوگ واقعات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے عادی ہیں۔ انہیں اس کا اندازہ ہوگا کہ بابائے اردو کی وفات نہ صرف دنیائے اردو کا عظیم نقصان ہے بلکہ اس سے ملک اور قوم کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔ اردو کی حفاظت کرنا ہمیں اسلئے ضروری ہے کہ وہ ہماری تاریخ اور ثقافت کی اس دور سے نمائندگی کر رہی ہے جبکہ پہلے پہل مسلمانوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اس طرح اردو کا زوال (خدانخواستہ) نہ صرف ہماری ادبی دنیا کا زوال ہے بلکہ ہماری قومی دنیا کے لئے باعث خطرہ ہے کیونکہ کسی بھی قوم کو اس وقت انفرادیت حاصل ہوتی ہے جبکہ اس کی ایک تہذیب اور ایک خاص زبان ہو جو اس کے ماضی کے واقعات اور روایات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔ اس طرح اگر کوئی قوم اپنی تہذیب اپنی زبان اور اپنی تاریخ کو کھو دیتی ہے تو اس وقت اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔

بابائے اردو کی رحلت اہل اردو کے لئے ایک زبردست سانحہ ہے۔ اس لئے وقت کا تقاضہ ہے کہ وہ ذمہ داریاں جو اب تک صرف بابائے اردو کے ضعیف کاندھوں نے اٹھا رکھی تھیں آج ہم انفرادی طور پر ان ذمہ داریوں کو محسوس کریں بالکل اسی طرح جس طرح ایک گھر کا بزرگ جب تک زندہ رہتا ہے اس وقت تک دیگر افراد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے لیکن اس کے مرتے ہی بے پرواہی کا دور ختم ہو جاتا ہے اور ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگتا ہے بابائے اردو کی حیثیت بھی اسی بزرگ جیسی تھی جنہوں نے تمام تر ذمہ داریوں کو اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ لیکن افسوس اب وہ ہستی نہیں رہی اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے فرض کی انجام دہی میں تغافل نہ برتیں

جہاں تک بابائے اردو کی وفات کا تعلق ہے ہمیں اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے اگر بابا گذر گئے اور وہ اردو یونیورسٹی قائم نہ کر سکے تو یہ ان کی ناکامی نہیں۔ بابا کی موت ایک کامیاب انسان کی موت ہے وہ اپنی زندگی میں کامیاب رہے اور کامیاب گئے اگر کام پورا نہ ہو سکا تو یہ ان کی ناکامی نہیں بلکہ ہماری بدنصیبی ہے کیونکہ ہم نے تساہلی اور لاپرواہی سے کام لیا اور پوری طرح ان کا ساتھ نہ دیا۔ اب اس ادھورے کام کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے ورنہ آنے والی نسلیں ہمیں اچھے الفاظ میں یاد نہ کریں گی۔

آرزو ڈبائیوی

غمِ بابا میں چند شعر

زندگی خدمت تکمیل زباں میں کاٹی
عمر بھر خون سے سینچا کئے باغ اردو

خطۂ پاک، دکن اور علی گڑھ رہ کر
جستجو کی ہے لگایا ہے سراغ اردو

آپ کی سعیٔ مسلسل کو ملی یہ معراج
فلکِ پیر سے اونچا ہے دماغ اردو

دہر پر راز حقیقت یہ کھلا بعد فنا
جگر بابا میں سرطان تھا داغ اردو

قمقمے سیکڑوں روشن ہیں نہیں اس کا جواب
جو اجل تو نے بجھایا ہے چراغ اردو

۱ ۹ ۶ ۶۱

ربیعہ فخری

پاک دل پاک ذات پاک صفات

"مس فخری آپ نے بابائے اردو کی حیات کے متعلق کچھ مواد اکٹھا کیا ہے؟ میرے افسرِ اعلیٰ نے مجھے بلا کر پوچھا۔ "تو ... کیا..."

"ہاں۔" انھوں نے میرے سوال کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔"

میرے ذہن کے تمام تار یکلخت جھنجھنا اٹھے۔ مجھے اپنے دماغ کے اندر عجیب قسم کی گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی۔ اور پھر ایک دھکا لگا جیسے کوئی تیز رفتار گاڑی دور سے گھڑگھڑ کرتی آئے۔ اور ایک دم پٹڑی سے اتر جائے۔ اور پھر۔ پھر جیسے میں کسی گڑھے میں اتر گئی۔ اترتی چلی گئی۔ نیچے اور نیچے۔

ڈاکٹر عبدالحق سے میری ملاقاتیں نہ تو تعداد میں زیادہ ہیں اور نہ ان کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے۔ میں جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتی انتہائی عقیدت کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھ جاتی۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے میری اور جملہ افراد خانہ کی خیریت پوچھتے۔ اور موڈ میں ہوتے تو چند نصیحتیں کر دیتے اور بس۔!

ان کے روبرو میری توجہ ان کے الفاظ کی طرف کم ہی ہوتی تھی۔ میں ان کی شخصیت کے سحر میں کھو سی جاتی مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے منہ سے الفاظ کی بجائے پھوار سی چھوٹ رہی ہے۔ شیریں اور خنک پانی کی پھوار جو میرے دل پر قطرہ قطرہ پڑتی اور میرے قلب و جگر کو طمانیت بخش رہی ہے۔ میں اس طمانیت بھرے احساس سے سرشار اور مدہوش سی ہو جاتی۔ یہاں تک کہ مجھے یہ احساس بھی نہ رہتا کہ میں اس قدر رفیع الشان شخصیت کے روبرو بیٹھی ہوں۔

یہ شاید ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے۔ میرے والد نے ایک روز مجھے بلا کر پوچھا۔ یہ جو اردو کانفرنس ہو رہی ہے۔ کچھ پتہ ہے کون کرا رہے ہیں۔ میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔ ابا اور کسی کانفرنس سے دلچسپی کا اظہار کریں! انھیں تو کانفرنسوں۔ مباحثوں مذاکروں اور مشاعروں وغیرہ سے جیسے بغض للّٰہی ہے!

انجمن ترقی اردو والے ہی کرا رہے ہوں گے۔" انھوں نے میری خاموشی کو لاعلمی سمجھتے ہوئے کہا۔ "نہیں" میں نے جواب دیا اور کانفرنس کے متعلق جو معلومات مجھے تھیں۔ بتا دیں۔ کہنے لگے "مولانا عبدالحق اس کی صدارت کر رہے ہیں۔ میں ان سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ کہاں تو اس قسم

کے ہنگاموں میں شرکت کے لئے سوسو بہانے تراشنے پڑتے تھے۔ اور کہاں یہ کہ وہ خود ساتھ لئے جا رہے ہیں۔ نصیب!

بہرحال کانفرنس شروع ہوئی۔ میں والد کے ساتھ گئی۔ والد کو دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب بے اختیار دوڑ کر ان سے بغلگیر ہوئے۔ فرمانے لگے "تقسیم ہند کے ہنگاموں میں آپ بھی لاپتہ ہوگئے۔ اگر مجھے آپ کا پتہ معلوم ہوتا تو ضرور آنے سے قبل آپ کو اطلاع دیتا" ابا نے معذرت کی اور کہا آپ کو معلوم ہی ہے میں خطوط ہی کیا۔ ہر معاملہ میں سست ہوں۔

مدت کے بعد دونوں ملے تھے۔ دیر تک ایک دوسرے سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں خاموش بیٹھی سنتی رہی کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگے "یہ کونسی ہے"؟ ابا نے کہا"

یہ ہے کہنے لگے "اوہو یہ تو اپنی بیٹی ہے۔ نا جو حیدرآباد میں پیدا ہوئی تھی"

ابا نے تصدیق کی انھوں نے دوبارہ میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پوچھنے لگے کیا کر رہی ہو آجکل؟" کالج میں پڑھتی ہوں" میں نے جواب دیا" اردو سے بھی کچھ دلچسپی ہے کہ نہیں"۔ انھوں نے کہا۔ ان کے سامنے یہ کہنا کہ دلچسپی ہی نہیں۔ قلبی لگاؤ ہے شاید سوئے ادب ہوتا۔ لہذا میں نے مسکرا کر گردن جھکالی۔ کہنے لگے انگریزی سے شغف جس قدر اچھی بات ہے۔ اردو سے بیگانگی اسی قدر بری بات ہے"

ارے صاحب کیا فرماتے ہیں۔

ابا بولے۔ اب اردو کہاں۔ اب تو میرے بچوں پر بھی پنجابی لب و لہجہ کا اثر پڑتا جا رہا ہے" ڈاکٹر صاحب مسکرائے، کہنے لگے" علاقائی زبانوں کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ اور قومی زبان کا اپنا مقام دونوں کو گڈمڈ نہ کرنا چاہیئے" پھر والد صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے" آج کل کی نئی پود کی مشکل یہ ہے۔ کہ وہ انگریزی کے پروں پر اڑ کر اردو کی اقلیم کو سر کرنا چاہتی ہے۔ وہ یہ بھول چکی ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک نہ تو قوم کہلانے کی مستحق ہو سکتی۔ اور نہ اپنی علیحدہ ہستی برقرار رکھ سکتی ہے۔ جب تک کہ اس کی اپنی الگ ایک زبان نہ ہو۔ ایک ایسی زبان جو اس کے خیالات و جذبات اور احساسات و واردات قلبی کی آئینہ داری کر سکے۔ جس کا دامن اس کی تہذیب و تمدن سے مالامال ہو۔ اور جس کا جام اس کے اخلاقی اور معاشرتی معیاروں سے لبریز ہو۔ قومی زبان پر دسترس تامہ رکھے بغیر ترقی کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے۔ جیسے بیج کو زمین میں دبائے بغیر اسے پھلتا پھولتا اور تناور درخت بنتا دیکھنے کی تمنا"

یہ تھی بابائے اردو سے میری پہلی ملاقات
اور اردو سے میرا پہلا تعارف!

یوں تو اردو کی محبت مجھے اپنے خاندان سے ورثے میں ملی تھی۔ لیکن کسی چیز سے والہانہ محبت ایک الگ بات ہے۔ اور اس کی اہمیت و حقیقت کا شعور علیحدہ چیز ہے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ زمانہ بدلتا گیا۔ اس ملاقات کے نقوش ذہن میں دھندلاتے چلے گئے۔ میں نے تعلیم سے فارغ ہوکر ملازمت اختیار کرلی۔ پھر ایک بار کسی سلسلے میں مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ کام بہت تھے۔ اور وقت بہت کم۔ میں نے سب کاموں کو بھگتایا۔ سیر و تفریح کے لئے بھی کچھ وقت نکالا اور پھر واپسی کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔ معاً مجھے محسوس ہوا جیسے میں کچھ بھول کے جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر دماغ میں عجب الجھن سی رہی۔ پھر بے اختیار ڈاکٹر صاحب کا خیال آیا۔ کراچی آنا اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے ملے بغیر چلے جانا۔ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے۔ میں فوراً رکشہ میں بیٹھی۔ اور اردو کالج کی طرف روانہ ہوگئی

گرمی کا موسم تھا۔ مولوی صاحب باہر برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں نے حاضر ہوکر آداب عرض کیا۔ انھوں نے کتاب سے نظریں ہٹاکر میری طرف دیکھا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر کہنے لگے "میں پہچانا نہیں" میں نے نام بتایا فرمانے لگے۔ بیٹا بوڑھا ہوگیا ہوں۔ بینائی کمزور ہوتی جارہی ہے کانوں سے اونچا سنائی دیتا ہے پھر دیگر احوال دریافت کرنے لگے۔ میں نے اپنی ملازمت کا ذکر کیا۔ کہنے لگے "اگر تم کہیں اردو کی پروفیسر ہوتیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی" میرے ساتھ میری چھوٹی ہمشیرہ بھی تھیں۔ جو اتفاق سے پروفیسر ہیں۔ گرچہ اردو کی نہیں ہیں۔ میں نے ان سے تعارف کرایا۔ خوش ہوئے اور انھیں اردو میں ایم اے کرنے کی تلقین کرنے لگے۔

اس کے بعد میں جب کبھی کراچی جاتی۔ ان سے ملنے ضرور جاتی اور طمانیت و سکونِ قلب کی آسودگی دولت سے مالا مال ہوکر لوٹتی۔ آسودگی و سرشاری کا وہ اولین احساس جو پہلی بار ان سے ملنے پر مجھے محسوس ہوا تھا۔ آخری ملاقات تک برقرار رہا۔ نہ معلوم کیوں ان کی موجودگی میں مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں تپتی جھلساتی ہوئی دھوپ میں سے کسی گھنے سے سائے میں آبیٹھی ہوں۔ اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں اور بھینی بھینی سی ہوا میری تشنگی کو تر و تازگی بخش رہی ہے۔

پھر ایک دن بابائے اردو کراچی سے مری پہنچ گئے پنڈی سے مری جانا آسان تھا۔ میں ان کی عیادت کے لئے گئی۔ اتوار کا دن تھا۔ ملاقات کا وقت صبح ساڑھے دس بجے تھا۔ میں عین وقت پر پہونچ گئی۔ دیکھا تو بابائے اردو محوِ خواب تھے اور مولوی اسرار صاحب ملحقہ کمرے میں ان کی بیداری کا انتظار فرما رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اسرار صاحب بولے "آپ کہیں تو انھیں بیدار کردوں" میں نے منع کیا۔ میں ان کو بے آرام کرنے تو نہ گئی تھی۔ میں انتظار کرتی رہی۔ حتیٰ کہ ایک نرس انجکشن دینے آگئی۔ انھیں بیدار کیا گیا۔ میں نے بھی حاضر ہوکر سلام عرض کیا۔ اس مرتبہ انھوں نے پھر مجھے نہیں پہچانا۔ بتایا تو خوش ہوئے۔ ابا کا حال پوچھا۔ میں نے کہا علیل ہیں۔ بینائی زائل ہوگئی تھی۔ اب ایک آنکھ کا آپریشن کرایا ہے۔ خدا رحم کرنے والا ہے کہنے لگے۔ میری طرف سے انھیں پوچھنا۔ پھر پوچھا تم آج کل کیا کرتی ہو۔ میں نے کہا پریس انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوں۔ مگر وہ میری بات نہ سمجھ سکے۔ غالباً وہ بہت اونچا سننے لگے تھے۔ اور میں اس خیال سے چیخ کر بولنے سے احتراز کر رہی تھی کہ کہیں میرا چیخ کر بولنا انھیں ناگوار نہ گزرے۔ بہرحال پھر اسرار صاحب میری مدد کو آئے۔ انھوں

نے میری بات ان تک پہنچائی۔ انھوں نے سُن کر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری طرف دیکھا "اچھا" کہا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ پہلی بار تھی کہ انھوں نے مجھے کوئی نصیحت نہیں کی تھی۔ ان کی حالت دیکھ کے دکھ ہوتا تھا۔ نقاہت کے باعث آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ رخسار زرد تھے۔ اور پتلیاں بھی زرد اور پتھرائی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں۔ زندگی کے آثار تقریباً مفقود تھے۔ میں کچھ دیر قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر واپس آگئی۔ میری طبیعت بوجھل سی ہورہی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی فرحان احمد میرے ساتھ تھا وہ ڈاکٹر صاحب کے بستر کے قریب نہ گیا تھا۔ دور سے کھڑا دیکھتا رہا تھا۔ مجھے مضمحل دیکھ کر کہنے لگا "آپی تم خوامخواہ غمگین ہوتی ہو۔ وہ بچ جائیں گے۔ میں نے کہا "بھائی تم نے قریب سے نہیں دیکھا۔ اس لئے کہہ رہے ہو۔ کہنے لگا "آپی کمال کرتی ہو" جو اتنی عمر میں اتنی بیماری کے باوجود تم تک سے باتیں کرلیں۔ وہ بھلا اتنی جلدی مر سکتے ہیں؟ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ میں مطمئن سی ہو کر واپس آگئی۔

کچھ روز بعد مولوی صاحب پنڈی تشریف لے آئے میں پھر عیادت کو حاضر ہوئی۔ اس روز انھوں نے مجھے دیکھا۔ صرف اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ میں نے ان کے کان کے قریب منہ لے جاکر ان کی طبیعت پوچھی۔ انھوں نے نحیف سی آواز میں کچھ کہا۔ شائد یہی کہا ہوگا کہ ٹھیک ہوں۔ میں بیٹھ گئی۔ دیر تک بیٹھی۔ ان کے چہرے کو تکتی رہی۔ اتفاق سے ایک مکھی آکر ان کے چہرے پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموش لیٹے رہے۔ شاید اب ان کے بازوؤں میں مکھی تک اڑانے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ خدا کی شان وہ شخص جس کی تمام زندگی عمل تھی۔ ایک مسلسل اور پیہم عمل آج اس حد تک معذور ہوگیا تھا۔ آج وہ سیماب مجسم ہاتھ کو جنبش دینے کے قابل نہ رہا تھا۔ جذبہ و جوش اور قوت و طاقت کا وہ منبع جو عمر بھر ہزاروں چھوٹے بڑے دریاؤں کو سیراب کرتا رہا تھا آج خشک ہورہا تھا۔ عزم و استقلال کا وہ سرچشمہ جو تمام دنیا کو فیض پہنچانے کے بعد بھی جاری و ساری تھا آج . . . . اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکی۔

اور آج میں نے یہ خبر سنی تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں خنک چھاؤں سے یکایک کڑکتی دھوپ میں نکل آئی ہوں میرے ذہن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اور کنپٹیاں جلنے لگیں۔ اور کچھ یوں لگا۔ جیسے کسی نے سینے میں ہاتھ ڈال کر کلیجہ مروڑ دیا ہو۔ جیسے کسی نے ایک دم جھٹکا دے کر وہ ہاتھ نوچ کر پھینک دیا ہو، جو آج تک میرے سر پہ سایہ فگن تھا۔

روزنامہ تعمیر راولپنڈی ۲۰ اگست

زندگی ہم فانی و ہم باقی ست
ایں ہمہ خلاقی و مشتاقی ست
زندہ ئی مشتاق شو، خلاق شو
ہم چو ما گیرندۂ آفاق شو
(اقبال)

بیگم سروری عرفان اللہ

محسنِ قوم کی یادیں

اردو کے فروغ میں ادیبوں اور شعراء نے حتی الامکان کوشش کی اور جدوجہد برابر جاری رکھی اردو زبان میں جاذبیت ضرور تھی۔ مگر الفاظ کا ذخیرہ نہ ہونے کے باعث عجیب وغریب الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔ اس کے باوجود مفہوم ضرور سمجھ میں آجاتا تھا۔ جس طرح کہ - ع

" ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے"

اسی طرح ایک اور مصرعہ

" ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا"

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اردو زبان سے محبت رکھنے والے کس قدر اس کی ترقی میں کوشاں رہے، یقینی امر ہے۔ کہ کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔ یہ زبان منزل بہ منزل ترقی کی راہوں میں گامزن رہی اور ہر فرد اس کو اپنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مختلف زبانوں کے عام فہم الفاظ اس میں شامل کئے گئے۔ رفتہ رفتہ اردو زبان نے کافی ترقی کی ـــ عوام اردو بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ ادیبوں اور شعراء کی تحریروں میں انقلاب آتے رہے۔ اردو کی اعلیٰ ڈگریاں بھی حاصل کی جانے لگیں اس زبان نے شباب کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کہ انگریزی دور کا آغاز ہوا۔ اور انگریزی قوم نے اپنی زبان کو فروغ دینے کے واسطے کیا کچھ کیا اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں۔ بہرحال یہ انسانی فطرت ہے کہ نئی چیز کی طرف دل جلد ہی راغب ہوتا ہے۔ لہٰذا سرسید احمد خاں مرحوم کی کوششوں سے مسلم قوم نے انگریزی کو بھی اپنانا شروع کیا اور عوام نے اس کو اس درجہ اپنایا کہ بس ـــ انگریزی کے ہی ہوکر رہ گئے ـــ اپنی زبان جس کو کہ اپنے ہی بزرگوں نے سینچا۔ اولاد کی طرح پرورش کیا۔ پروان چڑھایا۔ غفلت کے باعث اندوہناک انبار میں دبلاتے چلے گئے۔

ہر دور میں اچھے اور برے سب ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ آبادی کا زیادہ حصہ انگریزی کی طرف مائل ہوگیا۔ پرانی روش کو نہ چھوڑنے والے اردو کے متوالوں نے اپنے بزرگوں کی تقلید میں قیمتی وقت کو اردو زبان کی ترقی کے لئے وقف رکھا۔ اور بتدریج کوشش کرتے رہے۔ ادیبوں نے نثر میں رنگینی پیدا کی۔ شاعروں نے دلچسپ انداز میں ادبی ذوق کو قائم رکھا۔ "تک" اور "کسو" وغیرہ الفاظ کی جگہ خوبصورت سے خوبصورت الفاظ استعمال

گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی چیز کو فروغ دینے میں کافی مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ انسان کے لئے محنت، قوت ارادی اور استقلال ہی ایسے بیش بہا قدرتی عطیے ہیں۔ جس سے انسان ہر قسم کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرسکتا ہے۔ بہرحال اردو زبان کے بہی خواہوں نے اس کو عروج دینے میں جس حد تک کوشش کی اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوسکتا ہے۔

جھک کر ستارے روئے قمر دیکھتے رہے
گردوں کی رات اپنی سحر دیکھتے رہے
چلمن تک ان کے جانے کی ہمت نہیں پڑی
جھونکے صبا کے دور سے در دیکھتے رہے۔

عروج و زوال ہر ایک شے کو رہا۔ اور رہے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ قدرت نے انسانوں کو عقل سلیم عطا کی تاکہ صحیح معنوں میں نشیب و فراز سمجھ سکیں۔ انگریزی دور کے چند مفاد پرستوں نے اردو کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں طرح طرح سے اس قومی زبان کو نقصان پہونچانے کے درپے ہوئے۔ ان کے ناپاک ارادوں کا اردو کے دلدادہ عوام نے جہاں تک بھی ان کے امکان میں تھا۔ مقابلہ کیا۔ اور کرتے رہے اسی دور میں جب کہ یہ کشمکش جاری تھی۔ قدرت نے ایک حسین ستارہ بہت معمولی گھرانے میں بھیجا۔ رفتہ رفتہ اس ستارے کی چمک سے قرب و جوار کے عوام نے فائدہ حاصل کیا۔ بہرحال اسی ستارے نے چند سال اس یونیورسٹی میں تعلیم پائی جس کو فخر سے ہم کبھی اپنی بہترین درسگاہ کہا کرتے تھے۔ صرف اور صرف اس درسگاہ کو یہ فخر حاصل رہا ہے۔ کہ ہونہار حصول تعلیم سے فارغ ہوکر گورنر جنرل وزیر اعظم، وزراء، سفیر، لیڈر غرضکہ بڑے اور چھوٹے سب ہی عہدوں کو ان ہونہاروں نے سنبھالا۔ اور نام پیدا کیا۔ تاریخ ان سب کو اچھے ناموں سے یاد کرتی ہے۔ اور کرتی رہے گی۔ انہی زیر تعلیم طلبا میں عبدالحق نامی ایک طالب علم نے طالب علمی کے زمانے میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھلائے۔ اور ان مفاد پرستوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور جو اردو زبان نقصان پہونچانے میں مصروف تھے۔ اس مقابلہ کے دوران اردو کے بہی خواہوں کی تعداد کافی ہوگئی۔ متفقہ طور پر ان کو اردو کا لیڈر تسلیم کیا گیا۔

جس قوم میں یہ قومی جذبہ کارفرما ہو۔ مجموعی حیثیت سے وہ ایک قوت کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور یہ قوت بڑی سے بڑی طاقت کا منہ پھیر کر رکھ دیتی ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ مرد مجاہد نے اپنے رفقاء، ہمدرد ہم خیال۔ اور ہم عصروں کی مدد سے ان مفاد پرستوں کو جو جڑ پکڑتے جارہے تھے۔ ان کی جڑیں کھوکھلی کردیں ان کا مصنوعی تاج۔ ظاہری لبادہ منظر عام پر اتار کر ان کی کھلم کھلا قلعی کھولدی۔ یہیں سے ہونہار طالب علم عبدالحق کے ستارے نے عروج کی طرف دوڑنا شروع کیا۔

مختلف مقامات کی سیاحی کے بعد عرصہ دراز تک حیدرآباد دکن میں اردو زبان کو ترقی دینے کے بہترین مواقع ان کو حاصل رہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے۔ کہ

کہ وہی ہستی فن کو ترقی دے سکتی ہے جس کی پشت پناہی کی جائے۔ ہر قسم کی مالی مدد اس کی اسکیموں کو ملتی رہے۔ ایسے ماحول میں جبکہ حالات سازگار ہوں۔ ترقی کی راہیں وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

انتھک محنت، خلوص، بے لوث خدمت کے باعث عوام کے دلوں کو انھوں نے موہ لیا تھا۔ دل ہمیشہ اسی ہستی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ جو بے غرض خدمت قوم میں زندگی کو وقف کر دے۔ بے لوث خدمت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ ان کی صلاحیتیں روشن میں نمودار ہوئیں۔ عوام نے ان کی محنت کو اپنایا! تحریروں سے فائدہ حاصل کیا۔ ان کی سچ گوئی سے عوام متاثر ہوتے۔ اردو کے عروج کے واسطے انھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ اور قوم نے ان کو ان کی محنتوں کے عوض "بابائے اردو" کا خطاب دیا۔ چاند جب چڑھتا ہے تو سارا عالم دیکھتا ہے دیگر ممالک نے بھی اسی ہستی پر فخر کیا۔ اور ان کی تصانیف کا اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کراتے رہے۔

میں بابائے اردو کے عروج کی داستانیں اخبارات میں پڑھتی رہی۔ ان کی کئی تصانیف کا میں نے بغور مطالعہ کیا۔ مذہبی معلومات۔ الفاظ کی بندش محاورات، فصاحت و بلاغت سے بہت متاثر ہوئی۔ مجھ کو شروع سے ہی قابلِ فخر ہستیوں سے ملاقات کے مواقع ملتے رہے۔ اور بابائے اردو سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ دوران گفتگو کئی خواتین اور مردان کے پاس موجود تھے۔ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ بے کار باتوں میں انھوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کیا۔ پہلی ملاقات میں چند کام میرے سپرد کئے گئے۔ انتہائی محنت اور جانفشانی سے میں نے وہ کام پایۂ تکمیل تک پہونچائے۔ میری اس پرخلوص محنت سے "بابا" بہت خوش ہوئے۔ وقتاً فوقتاً کام بتاتے رہے اور میں اپنی محنت سے امتحان میں کامیاب ہوتی رہی یہاں تک کہ اہم کاموں میں بھی حصہ لیا۔ تھوڑی ہی مدت میں اس مشن میں رکن کی حیثیت سے فرائض انجام دینے کا فخر مجھ کو بھی نصیب ہوا۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جن کو بابا کا قرب حاصل رہا اور ان کی علمی قابلیت سے فیض پہونچا۔

ایک دن وہ بہت خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا "بابا" اردو کی ترقی کے لئے آپ جو کچھ کر سکتے تھے کیا۔ اس ترقی کا راز کیا آپ مجھ کو بتا سکیں گے۔ بابا نے فرمایا "بیٹی" تم واحد خاتون ہو جو یہ راز معلوم کر رہی ہو۔ انسان اپنی زندگی کے لئے کچھ اصول بناتا ہے۔ اگر وہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر قائم رہے۔ اور جد و جہد جاری رکھے تو ایک نہ ایک دن کامیابی یقینی ہوگی۔ ان اصولوں میں چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ سچ گوئی، بحث سے گریز، کارآمد لوگوں کو اپنانا۔ کسی کی تنزلی سے نہ جلنا۔ بھٹکے ہوئے کو اپنی کوششوں سے صحیح راہ پر لانا۔ غصہ نہ کرنا۔ مختصر بات کرنا۔ زیادہ نہ بولنا۔ یہی باتیں میری ترقی کی راہ کو ہموار کرتی چلی گئیں۔

سوال و جواب کا سلسلہ میرے اور بابا کے درمیان رہتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھے۔ ہمیشہ بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے، اچھے اچھے مشورے دیا کرتے۔ اسلامی اصولوں کو اپنانا اولین فرض سمجھتے تھے۔ میں نے جب بھی ان کو دیکھا کام کرتے ہوئے، مطالعہ کرتے ہوئے" اردو کی ترقی کی اسکیموں پر صلاح و مشورہ کرتے ہوئے۔ ان کی طبیعت میں غصہ نام کو نہیں تھا۔ بات کا جواب دیتے وقت چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہ مجھ کو نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ مختلف نصیحت آمیز مثالیں دیکر اپنے رفقائے کار کو سمجھایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا "بابا" آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز چیز کون سی ہے۔ بابا نے جواب دیا، میں نے اردو کی ترقی میں اپنی دانست میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور انسان کو جو چیز زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اس میں وہ برابر جدوجہد کرتا ہے۔ جس طرح کہ خان لیاقت علی خاں مرحوم نے قوم کی فلاح و بہبود کے لئے قوم کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیا۔ انشاء اللہ میں بھی اپنی کوشش میں کامیاب ہوکر رہوں گا۔

بابائے اردو نے میری محنت کے صلہ میں مجھ کو اپنے دست مبارک سے چند فوٹو عنایت کئے اور کہا کہ ان کو بہت احتیاط سے رکھنا۔ وقت ضرورت ان سے سبق حاصل کرنا۔ اس مضمون کے ساتھ وہ فوٹو بھی شائع کرائے جارہے ہیں۔ مجھ سے ایوب گورنمنٹ کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ کہ مجھ کو موجودہ دور کی حکومت کی پالیسی پسند ہے۔ اردو کی ترقی کے لئے جس قدر احکامات صادر کئے۔ وہ قابل تحسین ہیں —— بابائے اردو یونیورسٹی کے لئے کوشاں رہے —— مگر اس خواب کی تعبیر وہ نہ دیکھ سکے اور ۱۶ اگست کی صبح کو اندوہناک خبر سنی گئی۔ اور میں "بابا" کے آخری دیدار کے واسطے اردو کالج پہونچی —— وہ میرے سامنے تھے —— میں ان کو دیکھ رہی تھی —— وہ خاموش تھے —— آنکھیں بند کئے ہوئے ایسی جگہ پہونچ چکے تھے۔ جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا —— اس وقت ماضی کی یادیں میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اور لوگوں کو کہتے سنا —— اردو یتیم ہو گئی —— اردو لاوارث ہوگئی —— اردو کی ترقی کی راہیں محدود ہوجائیں گی —— موت کے فرشتے نے بے وقت ان کو اپنی آغوش میں لے لیا —— نہیں نہیں سب غلط —— بلکہ —— بابا کی اسکیموں نے یتیمی کا جامہ پہنا —— ان کا اپنا خاص الخاص کتب خانہ لاوارث ہوگیا —— موت کا ایک وقت مقرر ہے —— موت برحق ہے۔ ایک نہ ایک دن ضرور سب کو اسی جگہ جانا ہے۔ جہاں آج بابا جاچکے ہیں۔

مجھ کو ایک بات کا اس وقت زیادہ احساس ہے کہ بابا کی آخری تمنا انکی زندگی میں پوری نہ ہوسکی۔ قوم بابا کی خواہش کو ضرور ضرور پورا کریگی۔ عوام۔ اردو کالج بابائے اردو کے آخری دیدار کے واسطے آرہے تھے، در و دیوار پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ میں بابا کے پاس سے یہ شعر پڑھتی ہوئی رخصت ہوئی

بشر بھی آکے دنیا میں عجب شانیں دکھاتا ہے۔
کھلونا بن کے آتا ہے۔ تماشا بن کے جاتا ہے

(روزنامہ "جنگ" ۳۰ ستمبر ۱۹۶۱)

آمنہ صدیقی
(ایم۔اے (بی ایڈ)

بابائے اردو کی شخصیت نگاری

انسان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ خود انسان ہے۔ کسی ایک انسان کی سیرت کو بے نقاب دیکھ لینا، بہت سی کتابیں پڑھ لینے سے کہیں زیادہ مفید ہے، کیوں کہ کتابیں محض علم میں اضافہ کرتی ہیں، اور سیرتیں انسانی تجربات و مشاہدات ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ علم بغیر تجربہ اور مشاہدے کے جہالت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ انسان کی دلچسپی کی سب سے بڑی چیز خود انسان ہے۔ اسے دوسروں کی شخصیتوں کو بے نقاب دیکھنا اس حد تک پسند ہے کہ وہ بعض اوقات خود اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ دنیا کی ادبیات میں فنِ سوانح نگاری کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔ سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں، انہی میں سے ایک شخصی خاکہ ہے۔ یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جس میں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے جن کے امتزاج سے کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستانِ حیات نہیں ہوتا، بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں تفصیل سے زیادہ اجمال اور توضیح سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے۔

شخصیت کی تصویر کشی کرنا بڑا مشکل فن ہے۔ کوئی شخصی خاکہ اس وقت تک کامیاب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا کہ جب تک اس میں موضوع کی تصویر اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر نہ آئے۔ موضوع کی خوبیوں یا خامیوں کی پردہ داری کی کوشش، خود مصنف کی نااہلیت کی پردہ دری بن جاتی ہے۔ اچھا خاکہ وہی ہوتا ہے جس میں موضوع کو اسی رنگ میں پیش کیا جائے جو اس کا خاصہ ہے۔ اسے صرف فرشتہ یا صرف شیطان بنا کر پیش نہ کیا جائے۔ اسے ان دونوں کا مجموعہ سمجھ بنے دیا جائے۔ کیونکہ اسی مجموعے کا نام، انسان ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو صرف "اچھے" یا صرف "برے" ہوں۔ اچھائی اور برائی دونوں اضافی قدریں ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ان کا مفہوم بدلتا رہا ہے۔ اس لئے مصنف کو خاکہ نویسی کرتے وقت اپنے، اچھائی برائی کے معیار کو سامنے نہیں رکھنا چاہئے۔ بلکہ اصل حقیقت کو پیش کرنا چاہئے۔ خاکہ نویس کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے اور مصور کے موقلم سے لکھنے کا فن آنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے

تو اس کی تحریر موضوع کے مزار کا کتبہ تو بن سکتی ہے، لیکن اس کی زندگی کا آئینہ نہیں۔

اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصی خاکہ نویسی کے لئے کس قسم کی شخصیتوں کا انتخاب کرنا چاہئے۔ یہ سوال اس وقت بیکار نظر آتا ہے جب یہ حقیقت فاش ہو جائے کہ ہر انسان بجائے خود ایک وسیع دنیا ہے، اس میں اچھے برے، اونچ نیچ اور سفید و سیاہ کی کوئی قید نہیں۔ یہ چیزیں شخصیت کو بناتی ہیں نہ بگاڑتی ہیں۔ اور نہ ہی بنیادی طور پر ان خوبیوں یا خامیوں کا اثر انسان کی "انسانیت" پر پڑتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف انہی لوگوں کی زندگی کے حالات قلم بند کرنا چاہئیں کہ جنہوں نے کوئی بڑا کام کیا ہو اور شہرت و ناموری حاصل کی ہو۔ یہ خیال شہرت و ناموری کی حد تک رسوا ہو چکا ہے، اس لئے کہ وہ لوگ جنہوں نے کبھی کوئی بڑا کام نہیں کیا اور کبھی شہرت و ناموری حاصل نہیں کی ان کی زندگی کے حالات بھی دوسرے انسانوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اور اس کی مثالیں دنیا کے ہر ادب میں موجود ہیں۔

اردو زبان میں شخصی خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ لیکن وہ خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتے۔ اس قسم کی سب سے پہلی مثال "آب حیات" میں ملتی ہے۔ مولانا آزاد نے بڑی چابک دستی سے ایسی تصویریں بنائی ہیں کہ جو اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض جگہ انہوں نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ یہی مبالغہ بعض اوقات موضوع کے بارے میں بہت سی ناگفتنی باتیں کہہ گیا۔ آزاد نے ذوق کا جو تذکرہ لکھا ہے، وہ اردو خاکہ نویسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد کی تصانیف کے علاوہ بعض اور کتابوں میں بھی ضمنی طور پر شخصیت نگاری پائی جاتی ہے لیکن اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس صنف کو اردو میں صحیح طور پر متعارف کرنے کا سہرا مولوی عبدالحق کے سر ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مختلف لوگوں کے حالات مضامین کی صورت میں لکھنے شروع کر دئے۔ جب ان مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی تو انہیں کتابی شکل میں "چند ہم عصر" کے نام سے یکجا کر دیا گیا۔ یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں اونچا مقام رکھتی ہے۔

مولوی صاحب نے صرف ان لوگوں کی سیرت پر قلم اٹھایا ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں۔ جس شخص کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ اس قدر مکمل ہے کہ اس میں کسی کمی بیشی کی مطلق گنجائش نہیں۔ موضوع کی تصویر بڑی وضاحت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہے۔ بعض لوگوں (مثلاً سرسید اور حالی) کے حالات لکھتے ہوئے اگرچہ عقیدت مندی کا اظہار بھی جا بجا ہوتا ہے، لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مولوی صاحب کی عقیدت موضوع کی تصویر کشی میں حائل ہو رہی ہے۔

یہاں یہ توضیح کر دینا ضروری ہے کہ "چند ہم عصر" میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو مرتب (شیخ چاند مرحوم) نے محض اس بنا پر شامل کر لئے کہ ان میں بعض شخصیتوں کا ذکر ہے۔ ایسے مضامین "شخصی خاکے" نہیں ہیں (مثلاً حکیم امتیاز الدین اور مولانا گرامی وغیرہ کے متعلق تحریریں) اس لئے ہماری بحث کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پیش نظر وہی مضامین ہیں جن میں مولوی صاحب

نے موضوع کی شخصیت کو پوری طرح سامنے رکھ کر قلم اٹھایا ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف ایسے ہی لوگوں پر قلم اٹھایا ہے کہ جن کی زندگی کسی نہ کسی اعتبار سے قابل تقلید ہو سکتی ہے۔ مگر انہوں نے ان خاکوں سے اخلاقی درس دینے کا کام نہیں لیا، کیوں کہ یہ خصوصیت کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے موضوعات میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ سرسید اور حالی جیسے بڑے ادیب بھی ہیں، عماد الملک اور محسن الملک جیسے مدبر بھی۔ حسرت موہانی اور وحید الدین سلیم جیسے شاعر و محقق بھی اور نام دیو مالی اور نور خاں جیسے عام انسان بھی۔ مولوی صاحب نے اپنے موضوع کے انتخاب کا معیار انسانیت کو قرار دیا ہے، نہ کہ دنیاوی شہرت کو۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنے کا فن خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے شخصی خاکے مختصر ہیں لیکن اس اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت بھی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سرسید کے متعلق انہوں نے تقریباً ایک سو صفحات لکھے ہیں لیکن ان کی اپنی افادیت کے اعتبار سے یہ صفحات آٹھ سو صفحے کی "حیات جاوید" سے کسی طرح کم نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "حیات جاوید" اردو کی بہترین سوانح عمری ہے اور اس کا مقابلہ مولوی صاحب کے مضمون سے نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس مضمون میں بعض ایسی معلومات ہیں جو "حیات جاوید" میں نہیں، اس اعتبار سے اسے "حیات جاوید" کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب موضوع کی صرف اچھائیوں ہی سے سروکار نہیں رکھتے بلکہ برائیاں بھی بیان کرتے ہیں، کیونکہ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے، اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا"۔ (چند ہم عصر ص ۹) سید محمود سے جو انہیں تعلق خاطر تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مولوی صاحب ان کی شراب نوشی کی عادت پر پردہ ڈالتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ سرسید کے حالات میں اس طرف واضح اشارے ہیں اور خود سید محمود کے بارے میں جو مضمون ہے اس میں ان کو "ایک نشان دار انسانی کھنڈر" سے تشبیہ دی ہے۔ واضح رہے یہ مضمون سید محمود کی وفات کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ تعزیتی جلسوں میں عموماً رسمی باتیں ہوتی ہیں اور بقول سعادت حسن منٹو مرنے والے کو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے اس مضمون میں موقع کی مناسبت سے رسمی باتیں نہیں کہیں۔ سید محمود کی شخصیت پر بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ اس طرح مولانا محمد علی جوہر کے متعلق بڑی متوازن رائے دی ہے:

> "اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا، ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے"
>
> "وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذرا سی بات

پراس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی ۔ دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے ؛

ان دو جملوں میں مولوی صاحب نے مولانا محمد علی کے کردار کی بڑی شاندار تصویر کھینچی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کے بعض عقیدت مند یہ تصویر پسند نہ کریں ، لیکن وہ یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ مولوی صاحب کی بے باکی ، حقیقت پر مبنی ہے ۔

مولوی صاحب کے دو شخصی خاکے ایسے ہیں جن کی اردو ادب میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے ۔ یہ دونوں مضمون ایسے اشخاص کے بارے میں ہیں جو نہ تو بڑے سیاست داں تھے نہ ادیب نہ شاعر ، یہاں تک کہ ان میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ جس کی وجہ سے ان کے جاننے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا ان میں ایک مالی تھا اور ایک سپاہی ۔۔۔

" دولت مندوں ، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے ۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے "

(چند ہم عصر ص ۱۲۴)

یہ وہ تمہیدی سطور ہیں جو مولوی صاحب نے " نور خاں " کے حالات لکھنے سے پہلے سپرد قرطاس کی ہیں ۔۔۔ " نور خاں ۔۔۔ گدڑی کا لال " معمولی آدمی تھا ۔ لیکن اس کے کردار کی بعض خصوصیات بڑی غیر معمولی تھیں ، انہیں خصوصیات نے مولوی صاحب کو متاثر کیا اور انہوں نے یہ خاکہ لکھا ۔ اسی طرح نام دیو مالی ایک عام طرح کا انسان تھا ، لیکن اسے اپنے کام سے جو لگن اور عشق تھا وہ مولوی صاحب کے لئے کشش کا باعث ہوا اور انہوں نے اس کی سیرت کشی کی ۔۔۔ یہ دونوں شخصی خاکے بہترین انسانی مطالعے ہیں ۔ یہ دونوں کردار ہمارے ادب میں لافانی حیثیت حاصل کر چکے ہیں ۔ یہ مولوی عبد الحق کے قلم ہی کی مسیحائی ہے کہ معمولی آدمیوں کو انہوں نے زندہ جاوید کر دیا ۔

مولوی صاحب کے شخصی مضامین کی ایک خصوصیت اور بھی بہت دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ ، اگر اس مجموعے کا نام " چند ہم عصر " کے بجائے " یاد رفتگاں " ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا ۔ مولوی صاحب نے اپنے کسی ہم عصر کا خاکہ اس کی زندگی میں نہیں لکھا ۔ تمام خاکے ہم عصروں کے مرنے کے بعد لکھے گئے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان خاکوں کی صورت ، موجودہ صورت سے مختلف ہوتی ۔ بات یہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں تعریف و مدح کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ لکھنا ذرا جرات کی بات ہے ۔ مجھے مولوی صاحب میں اس جرات کی کمی نظر آتی تھی لیکن یہ کمی اس وقت کچھ زیادہ اہم معلوم نہیں ہوتی جب ہم اس حقیقت پر غور کریں کہ ان مضامین کے لکھنے کی محرک شخصیتوں کی موت ہے ۔ اگر یہ لوگ مولوی صاحب کی زندگی میں نہ مرتے تو مولوی صاحب کبھی ان پر قلم نہ اٹھاتے ۔ ان لوگوں کی دائمی

(باقی صفحہ پر)

صدق جائسی

قطعہ تاریخ وفات بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم

صدر ذی قدر انجمن ترقی اردو کل پاکستان

گئے سوئے عدم، بابائے اردو — یہ غم ہے اے صدق ہے صبر آزما غم
سنائی تیر بن کر دل پہ بیٹھی — پڑھا آغا[1] کا خط، با چشم پرنم
عجب عالم ہوا جو ہش گیا سے — نظر میں ہو گیا تاریک عالم
نہ سمجھا، ہائے غفلت کا برا ہو — کہ کیوں پچھلے پہر رو لی تھی شبنم
دوا کی لاکھ، صدر محترم نے — مگر حکم قضا تھا حکم محکم
مشیت سے چلا ہے زور کس کا — بلاوا آ چکا تھا دے دیا دم
وفا کرتی نہیں دنیا کسی سے — کوئی ٹھہرا بہت، کوئی ذرا کم
ابھی کل جس کا جشن جوبلی تھا — اسی کا ہو رہا ہے آج ماتم
تجھے اہل ادب روئیں گے برسوں — عزیز خلق، اے خلق مجسم
نہ بھولیں گے تجھے اردو کے شیدا — حبیب بے دلاں پیر معظم

۱۳ ھ ۸۱

ڈھکی تربت رہے پھولوں سے تیری — سر تربت رہے گلشن کا عالم
رہے تا حشر تیرا بول بالا — سدا اونچا رہے اردو کا پرچم

خدا بخشے تجھے اے مرنے والے
کہ سال فوت ہے مغفور دائم

۱۳ ھ ۸۱

[1] جناب آغا افتخار حسین صاحب، اسسٹنٹ سکریٹری فیڈرل سروس کمیشن (کراچی)

عبدالعزیز فطرت

نذرِ بابائے اردو

محترم و مکرم بندہ — سلام مسنون

بابائے اردو کی حیات میں یہ خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ ان کے بعد حالات کیا ہو جائیں گے۔

اب کہا جاتا ہے: اردو بے سہارا ہو گئی۔ یقیناً بڑا نقصان ہے۔ لیکن یہ بد دلی کا موقع نہیں۔ انشاءاللہ اردو کو اور نام ملیں گے، اور جس کام کو اس محترم بزرگ نے ترقیاتی مرحلے طے کرا دیے، دوسرے خدام اس رفتار و معیار سے نہ سہی بہر حال کسی نہ کسی طرح سنبھال لیں گے۔

میری نظم میں بھی یہی تاثر ہے:

مخلص
عبدالعزیز فطرت

•

زندہ باد اے رہِ محبوب میں مرنے والے
صورتِ زلف، بکھرنے میں نکھرنے والے
جو ادب پارے کہ نادر تھے کئے تو نے بہم
موتی یکجا وہ کئے، تھے جو بکھرنے والے

ہیں تری یاد میں جو اشک درخشاں انہیں دیکھ
کہ ہیں یہ لفظ ہر اک دل میں اترنے والے

ہم دلاتے ہیں یقیں تجھ کو، کہ اردو کے لئے
ابھی زندہ ہیں بہت جاں سے گذرنے والے

جس اُفق میں ہو اک خاور صد سالہ غروب
اُس اُفق سے کئی خاور ہیں اُبھرنے والے

ہر سحر گلشن اردو میں کھلا کرتے نئے پھول
دامن شوق گلِ تازہ سے بھرنے والے

جان جائیں یہ سب اعدائے زبانِ اردو
خادمِ اردو کے ہیں جتنے، نہیں ڈرنے والے

زندہ باد اے شہہ تسلیم حسین اردو
تا ابد زندہ ہیں دم عشق کا بھرنے والے

خندہ پیشانی سے ہم کرتے ہیں تجھ کو رخصت
تیری پیشانی پہ لکھا ہے، یہ، مرنے والے

"حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش، کارے کردم"

جمیل نقوی

مولوی عبدالحق غفراللہ لہٗ (۱۲ م ۸۱)

وحیدِ عصر و یکتائے زمن تھا
نشانِ عظمتِ اہلِ وطن تھا

سخن، روئے سخن، جانِ سخن تھا
سریر آرائے بزمِ اہلِ فن تھا

وہ حق اندیش، حق آگاہ، حق کوش
حریفِ سازشِ دار و رسن تھا

وہ سرخیلِ گروہِ اہلِ دانش
علم بردارِ اقدارِ کہن تھا

قلندر تھا مگر با ریشِ طیب
وہ خود اک بت تھا لیکن بت شکن تھا

عجب تیور تھے اس کے بانکپن میں
ہر اک تیور میں اس کے بانکپن تھا

اسیرِ کاکلِ لیلائے اردو
مجسم درد، سر تا پا لگن تھا

خزاں میں بھی بہاروں سے ہم آغوش
اسے معلوم ہر رازِ چمن تھا

امارت میں فقیروں کے سے انداز
زمانہ سے جدا اس کا چلن تھا

وہ دیوانہ تھا فرزانوں کا ہمسر   مگر اس کا عجب دیوانہ پن تھا
فسانوں پر کبھی ایمان کامل   کبھی سچائیوں پر خندہ زن تھا
کبھی خود اپنے سایہ سے گریزاں   کبھی ہر سائے سے گرم سخن تھا
کبھی احبابِ صادق سے بھی بدظن   کبھی غیروں سے بے حد حسنِ ظن تھا
کبھی شفقت سراپا مثلِ یزداں   کبھی آتش نفس تھا، اہرمن تھا
کبھی شیخ حرم سے دل گرفتہ   کبھی شیدائے حسن برہمن تھا
بظاہر رند تھا لیکن بباطن   پرستارِ خدائے ذو المنن تھا
ہزاروں الجھنیں تھیں ہر قدم پر   مگر ہر حال میں خوش تھا، مگن تھا

کہاں سے لائیں اب اس مردِ حق کو
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھا

(۲)

وہ خلاقِ ادب، بابائے اردو   عجب جادو رقم، جادو بیاں تھا
وہ لاثانی زباں آور، زباں داں   مقاماتِ ادب کا رازداں تھا
وہ دریائے لطافت کا شناور   دمِ تحریر اک جوئے رواں تھا
سخن سنجی میں یکتائے زمانہ   امانت دارِ سرِّ دلبراں تھا

کبھی دستاں طراز عصر حاضر | کبھی صدیوں پرانی داستاں تھا
کبھی حسن یقین سے لطف اندوز | کبھی معروف تنقید فغاں تھا
کبھی سر میں ہوائے الف لیلہ | کبھی شیدائی سحر البیاں تھا
کبھی زرتشت سے مصروف گفتار | کبھی رطب اللساں گارساں تھا
کبھی مدحت سرا تھا نصرتی کا | کبھی قطب دکن کا ہم عناں تھا
کبھی حاضر تھا بزم صوفیا میں | کبھی بزم ولی کے درمیاں تھا
کبھی گردیزی و فائق کا ہم راز | کبھی قائم پہ لطف بے کراں تھا
کبھی گھل مل کے باتیں مصحفی سے | کبھی مرزا علی پر مہرباں تھا
کبھی اللہ بخش میر کا ذکر | کبھی مرحوم سودا کا بیاں تھا
کبھی باغ و بہار میر امن | کبھی وجہی کا شستہ ترجماں تھا
جدائی میں کبھی سید کی گریاں | کبھی حالی کے غم میں سرگراں تھا
کبھی مداح پنڈت برج موہن | کبھی سرور کا مخلص قدرداں تھا
حفاظت میں زباں کی اس طرح محو | کہ جیسے خود ہی وہ اردو زباں تھا

عجب شے تھا وہ مرد راست گفتار

بڑھاپے میں بھی اک کڑیل جواں تھا

(۳)

بظاہر خود پرست و خود نگر تھا مگر رسمِ جہاں سے با خبر تھا
وہ اک صوفی تھا بیزار طریقت طریق اس کا با ندازِ دگر تھا
وہ نقادِ جمالِ لفظ و معنی بلا کا نکتہ رس، بالغ نظر تھا
زمانہ بھر کے فرزانوں سے بیزار مفکر سے زیادہ دیدہ ور تھا
غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ سے آزاد سبک سر تھا، حریف خیر و شر تھا
خزاں دیدہ بہاروں کا مورخ اسے اندازۂ برق و شرر تھا
نظر میں اس کی ہر اک شے تھی لاشے بس اک حسنِ تصور جلوہ گر تھا
وہی ظاہر، وہی باطن تھا اس کا نہ پردہ تھا نہ کوئی پردہ در تھا

لئے ہمراہ اردوئے معلّٰی

بڑے آرام سے گرمِ سفر تھا

(۴)

نہ اب منزل، نہ منزل کا نشاں ہے مگر اک غم، کہ زیبِ داستاں ہے
دھند لکا جس پہ منزل کا گماں تھا جو اب دیکھا تو گردِ کارواں ہے
جو کل تک صدرِ بزمِ اہلِ فن تھا وہ چہرہ آج تربت میں نہاں ہے

جدائی میں تری ہر دل ہے بیتاب
کہاں ہے، اے مرے محسن کہاں ہے؟

ترا قصرِ ادب سنسان، ویران
"زمیں دشمن، فلک نا مہرباں ہے"

عجب حالت ہے خدامِ ادب کی
لبوں پر آہ، سینہ میں فغاں ہے

مجھے تجھ سے نہیں کوئی شکایت
حدیثِ غم ہے اور میری زباں ہے

بتا کیا اب بھی تو مجھ سے نہیں صاف
بتا کیا اب بھی مجھ سے بدگماں ہے

بہت آساں سہی ترکِ تعلّق
مگر اک حرفِ الفت درمیاں ہے

فسانہ بن سکیں حسن و محبت
وہ اگلا سا زمانہ اب کہاں ہے

خلوصِ بندگی اللہ اکبر
جبینِ عشق جز در آستاں ہے

جسے کل چند ہم عصروں کا غم تھا
جمیلؔ آج اس کے غم میں نوحہ خواں ہے

کہو فرہاد سے تیشہ اٹھائے
محبّت آج پھر کوہِ گراں ہے

یوسف جمال انصاری
لیکچرار ۔ اسلامیہ کالج ۔ لاہور

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رحلت پر

سید احمد خاں کی رحلت آج تازہ ہو گئی
آج عبدالحق بھی دُنیا سے روانہ ہو گیا

صرصرِ غم بن گئی وجہِ نشاطِ جاوداں
شاخ[1] سے اک پھول ٹوٹا اور ستارا ہو گیا

کام سے ہے نام باقی کارگاہِ دہر میں
جس نے خدمت کی، جہاں میں نام اس کا ہو گیا

جام کو جم پہ ہے، آئینے کو اسکندر پہ ناز
بے زباں اردو کے حق میں تو مسیحا ہو گیا

تو نے خالی ہات یوں جھٹکے ہوا چلنے لگی
تو نے جنبش لب کو دی اور نغمہ برپا ہو گیا

قبلۂ[2] آخر سے پلٹا قبلۂ اوّل کی سمت
ابرِ تر کو گوہر افشانی کا سودا ہو گیا

جیسے تنہا رازداں و ہم نفس جاتا رہے!
آج سے بوڑھا سمندر یوں اکیلا ہو گیا

---

[1] یونانیوں کی دیو مالا میں بڑے آدمی دنیا سے رحلت کے بعد ستارے بن کر امر ہو جاتے ہیں ۔

[2] قبلۂ اول سے مراد کراچی ہے اور قبلۂ آخر سے دہلی۔ اردو کراچی کے نواح میں پیدا ہوئی، دہلی میں پروان چڑھی۔ یہ الٹا [illegible] ہے ۔

شہاب رفعت

انجمن تنہا

(بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی وفات پر چند تاثرات)

مرگ و حیات انسانی کا وہی قدیم افسانہ تو ہے
تاخت و تاراج ہستی کا مشغلۂ روزانہ تو ہے
دستِ فنا کی وحشی دستک جاری خانہ بہ خانہ تو ہے
دنیا پہلے بھی تھی ویرانہ اب بھی ایک ویرانہ تو ہے
وہی ہے ترکش، تیر وہی، صیاد کا زیست نشانہ تو ہے
وہی ہے شمع کی لو کا خنجر وہی تن پروانہ تو ہے
وہی ہے میت برگِ گل کی وہی ہوا کاشانہ تو ہے
قاصد ملکِ عدم کی آمد ہر صف میں و ترانہ تو ہے
وہی ہیں چالیں وہی شبخوں وہی ستیز شبانہ تو ہے
وہی دلیری آزاداں ہے وہی نبردِ یگانہ تو ہے
وہی ہیں مرحب، وہی ہیں عنتر وہی رجز شیرانہ تو ہے
رنگا رنگ ہوں موت کے حیلے ان کی روش ترکانہ تو ہے

کل تک جو موجود تھا ہم میں آج وہی بیگانہ تو ہے
چھوڑ کے انجمن ہستی کو تنہا دور روانہ تو ہے
پہلے تھا آزادانہ مسلک اب بھی آزادانہ تو ہے
ہاں لیکن جب بزمِ جہاں سے اس کے چشم و چراغ سدھاریں
کیسے نہ ان کے غم کے مارے پروانے رہ رہ کے پکاریں

ساری محفل سرد مگر اک گرم نفس دیوانہ تو تھا
اک مہجورِ وطن کی خاطر مدِّ نظر کاشانہ تو تھا
دُرد ہی دُرد تھی تہہ میں لیکن گردش میں پیمانہ تو تھا
دُور بہت ہی دُور حقیقت اک جیتا افسانہ تو تھا
ایک جہیتی بستی بسانے کے لئے اک ویرانہ تو تھا
بے حس نادانوں کے جہاں میں اک باحس فرزانہ تو تھا
تھے تو جیتے جاگتے بازو جدّ و جہد کا شانہ تو تھا
کاروبارِ شوق کی خاطر باقی ایک بہانہ تو تھا
دل میں ولولۂ بے پایاں لب پر ایک ترانہ تو تھا
وحشی دہشت ناک سمندر، اس کا کوئی کرانہ تو تھا
اک مے باقی، کہنہ ساقی مژدۂ کیف شبانہ تو تھا
بام و درِ میخانہ نہیں تھے شائبۂ میخانہ تو تھا
بے مے و ساغر، بے خم و مینا ولولۂ رندانہ تو تھا
جلوۂ جاناں آنکھ سے پنہاں سحرِ رُخِ جانانہ تو تھا
اک درویش بے سر و ساماں عزم مگر شاہانہ تو تھا
خانہ خواب و خیال سراسر لیکن صاحبِ خانہ تو تھا

(ماہِ نو کراچی ستمبر ۶۱ء)

عاصمہ حسین

سارا چمن ماتم میں ہے

یہ نظم بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم) کی وفات کی خبر سن کر القا ہوئی اور
ان کے سوگ میں پیش کی جاتی ہے۔

اب آنسوؤں کا سیلاب بہے اور آہوں کے طوفاں چھا جائیں
اب کالے کالے بادلوں کی گھنگھور گھٹائیں لہرائیں
اب سورج کا لا سورج ہوا ور چاند مسلسل گہنائیں
اب کرن کرن ہو تاریک اور اجلی دھوپیں کجلائیں
صبحوں کا سنہری روپ ڈھلے اور کہرے کہرا پھیلائیں
ہر جانب سائے ہی سائے اور دھرتی دھرتی پرچھائیں
پھنکارتے ناگ اندھیرے کے بل کھا کھا کر پھن پھیلائیں
تن تن کے بگولے رقص کریں، بڑھ بڑھ کر آندھیاں بولائیں
اب رونی رونی فضائیں ہوں، اور سونی سونی دنیائیں
کھو جائے دھنک کا سب جادو، رنگوں کی دھاریاں سنولائیں
کوئی شام ڈھلے دیپک نہ جلے اور کلیاں صبح نہ مسکائیں
اب کریں خزائیں من مانی، ہر پھول پہ شعلے برسائیں

دل دل کی کلی کملا جائے ، من من کی کونپلیں مرجھائیں

اب آنسوؤں کا سیلاب بہا اور آہوں کے طوفاں چھائے
اب غم کے بادل ٹوٹ پڑے اور زہر کے دھارے بہ جائے
سب دنیا سونی سونی سی ، ہر او رہیں سلگے ہی سائے
سانسیں ہیں اوکھی اوکھی سی ، ہر سانس سے دل بیٹھا جائے
باتیں ہیں تو اُلجھی اُلجھی سی ، اب بات لبوں پر کیا آئے
راتیں ہوں کہ دن اک بے چینی ، جی بیٹھے ہی بیٹھے گھبرائے
ٹیسیں ہی ٹیسیں من سے اٹھیں ، رگ رگ میں نشتر تیرائے
چرکوں پہ چرکے ایسے لگے آنکھوں میں لہو بھر بھر لائے
نس نس اک کرب کی لہر اٹھی ، رہ رہ کے جو تن من تڑپائے
رگ رگ میں چبھن تیکھی تیکھی ، جیسے کوئی ناگن ڈس جائے
اُف اُف یہ عالم کرب و بلا ، یہ درد کی شدت لے جائے
اب گھاؤ ہی گھاؤ ہیں سینے میں ، کیا مرہم سے کوئی سکھ پائے

یہ دنیا بھی کیا دنیا ہے ، ہر گام اجل ، ہر آن فنا
رکھا ہے ہوا کی اور دیا ، اِس آن بجھا ، اُس آن بجھا
کیا جانئے کس دم آ جائے تو اس کی بجھانے کو جھونکا
اِک موجِ ہوا ، اک موجِ جفا ، اک موجِ قضا ، اک موجِ فنا
چھوٹے سے دیے کی بات ہی کیا ، اس مہرے کی اوقات ہی کیا
اک دستِ قضا نے چال چلی اور پٹا یکایک یہ مہرا
کب تک یہ دیا جلتا جائے ، کیا اس کی سکت ، کیا اس کی بقا
جیون کا یہ نقطہ چھوٹا سا ، اک جھلمل کرتا پیر کا لہ
کب تک یہ چمک ، کب تک یہ دمک ، کب تک یہ ہیولیٰ روشنی کا

یہ بلبلہ جوت کا بہتا ہوا، یہ شعبدۂ فانوس نما
دو دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ گیا، لو چلتے چلتے مجو ہوا
اس نیو پر کیا تعمیر کرے کوئی شیش محل امیدوں کا

یہ زورِ فنا تسلیم مگر یہ زور، ابد تا ثیر نہیں
صیادِ قضا کے ہاتھوں میں یہ کون کہے شمشیر نہیں
لیکن ہے برش ہی مات اس کی، جان اس سے نقش پذیر نہیں
ہے جیت میں پنہاں ہار اس کی، انت اس کا بجز تحقیر نہیں
لعنت بر کے گھر میں سب کچھ ہے صرف ایک ہی شے، تقدیر نہیں
بجھ جائے فنا کی موج سے جو وہ ہستی کی تنویر نہیں
مٹ جائے قضا کے ہاتھوں سے وہ جیون کی تصویر نہیں
تسخیر عیاں تسخیر تو ہے، یہ تا بہ ابد تسخیر نہیں
یہ ظاہر کی تعزیر بجا، باطن کی مگر تعزیر نہیں
یہ صبح کو کرنا شام سیہ، لانا کوئی جوئے شیر نہیں
مٹ جائے ہوا کے جھونکے سے یہ نور کی وہ تعمیر نہیں
روشن ہے نہاں میں بجھ کے دیا، یہ خواب فنا کی تعبیر نہیں

شانِ ابدیت پیدا ہو جن سے، ہیں وہ جوہر لافانی
وہ دل ہے کہ جس سے ہوتی ہے تعمیرِ حیاتِ لافانی
اک روشنیوں کی روشنی ہے سامانِ بقائے انسانی
اک دیے کے اندر اور دیا اک نور کہ نورِ وجدانی
وہ نور کہ ہے نور سے بالاتر، اک تاب کہ تابِ نورانی
اک جذبہ کہ دل میں جاگ اٹھے، اک ولولہ، شعلہ پنہانی
اک عزمِ جواں اک شورِ جنوں، تحریکِ دلوں کی جولانی

اک آتشِ شوق کا ہنگامہ۔ اک جوشِ عظیم کی طغیانی
بجھتے ہی دیے کے اور دیا، اک اور ہی اس کی تابانی
دم اک مسیحِ پنہاں کا، اک ہستیِ تازہ کا بانی
باقی ہو کہ فانی روحِ بشر، اس رنگ میں روح نہیں آنی

پھر کیوں اشکوں کا سیل بہے؟ کیوں اٹھیں آہوں کے طوفاں؟
کیوں دل پہ غموں کا بارِ گراں؟ پھر کیوں نہ ہو منزلِ غم آساں؟
کیوں لب ہوں ہمارے نوحہ کناں؟ کیوں آنکھ ہو غم سے اشک فشاں؟
کیوں ہو نمناک سرِ مژگاں؟ کیوں ہوں نہ قضا پر خندہ زناں؟
پلکوں پہ جو آنسو لرزاں ہیں بن جائیں ستاروں کی لڑیاں
پھر کاوشِ سود و زیاں کیسی؟ کیا تذکرۂ پیدا و نہاں؟
مرکب ہے توانا اور بھی جاں، وہ جاں کہ ہے جانِ زندہ دلاں
دیکھوں تو برابر آنکھوں میں وہی برقِ نفس ہے شعلہ فشاں
وہی صاعقے ہیں، وہی کوندے ہیں، وہی شعلوں پہ شعلے گرم زباں
وہی لول ہنسی، وہی چہچہے ہیں، وہی چھوٹ رہی ہیں پھلجھڑیاں
وہی نخلِ قلم کی شادابی، وہی شاخ بہ شاخ گلِ خنداں
وہی موجِ خیال کی جولانی، وہی سطر بہ سطر دُرِ تاباں
وہی لطفِ سخن، وہی سحرِ بیاں، وہی دل روشن، وہی کمت رخشاں،
وہی معجزہ ہائے سینائی، وہی کشف و کرامات مسیحاں
سچ پوچھو تو یوں بھی جاری ہے اس ذات کا سلسلہ بے پایاں
اک لامتناہی سلسلہ ہے اک سلسلۂ بے حد و کراں
اک وقت کے پیچھے وقتِ دگر، اک دہر کے پیچھے دہر رواں
نئے وقت، نئے خواص و صفات، نئے اک تازہ جہاں، نئے کون و مکاں
اک وقت گیا، اک وقت آیا، کرتا اس سے ہے اس میں نقل نشاں

جو حجاب اس میں تو ظہور اس میں، مٹ مٹ کے عیاں، رک رک کے رواں
تخیل کی یہ رعنائی ہے، اک شعبدہ پیدا پنہاں
جو چیز بھی پیدا ہو جائے رہتی ہے ابد تک جلوہ کناں
ہستی کا نہ تار کبھی ٹوٹے، رکتی نہیں سیرِ روحِ رواں
عنصر ہوں وہ یا ہوں سبزہ و گل یا وحش و طیر ہوں یا انساں
پتی جو ذرا سی گر جائے ہوتی ہی نہیں بے نام و نشاں
موجود سدا موجود رہیں تا جملہ نہایاتِ دوراں
تحلیل ہے ماضی حاضر ہیں، ہر چیز بہ ہیئت جسم و جاں
دراصل بہارِ دائم ہے اور یونہی برائے نام خزاں
پیدائش پر موجود کھٹن، مٹنے کا نہیں کوئی امکاں
اک ظرف لامحدود جہاں، یکجا ہیں یہاں سب خورد و کلاں
اک راہ کہ راہ پیچاں ہے، اس رہ پہ رواں افتاں خیزاں
اس راہ میں گو تخریب بھی ہے تعمیر کے بھی ہیں سب عنواں
پھر کیوں ہو سلیماں سرگرداں؟ پھر کیوں ہو ملکِ تباہ ویراں؟

(ماہِ نو " ستمبر ۱۹۶ ء)

---

[1] " سریلزم " کے مشہور جدید نظریئے کی طرف اشارہ ہے۔
[2] ناکارگی (ENTROPY) کے نظریہ کی روشنی میں جو جدید سائنس کا ایک معروف نظریہ ہے۔

ایم۔ ایم فرشوری

دردِ پیری جس کا تھا فخرِ جوانی اُٹھ گیا

ہاتھ سے جاتا رہا کیوں دامن صبر و قرار
اشک آنکھوں سے رواں ہیں کس لئے دیوانہ وار
آج کس کے غم میں ہے یوں چشمِ عالم اشک بار
کس کے ماتم میں ہے آخر ہر بشر سینہ فگار
کیوں مسلط ہے دلوں پر اک قضائے سوگوار
اٹھ گیا بزمِ جہاں سے کون؟ اے اہلِ کبار
آہ بابائے زبانِ شاہجہانِ ذی تبار
عظمتِ دورِ کہن کا اک حقیقی شاہ کار
مخزنِ الفاظ اور گنجِ معانی اٹھ گیا
سرزمینِ ہند کا فخرِ قاآنی اٹھ گیا
السّلام اے کشورِ علم و ادب کے شہریار
خسروِ اقلیمِ فن اردو زباں کے تاجدار
السّلام۔ علم و ادب کے بحرِ ناپیدا کنار
صاحبِ فکر و نظر نقادِ فن معجز نگار
کی عطا اردو زباں کو جس نے شانِ افتخار
جس کا ممنونِ کرم ہے اس کا حسنِ پائیدار
کاوشوں سے جس کی پایا اس نے پھولوں کا نکھار
جس کی بوقلمی نے بخشی اس کو گلشن کی بہار

آہ اپنے طرز کا بہزاد و مانی اٹھ گیا
چھوڑ کر اک نقشِ دائم نقشِ ثانی اٹھ گیا
یادگارِ محسن[1] و شبلی[2] و حالی[3] و وقار[4]
عزمِ سید[5] جراتِ محمود[6] کا آئینہ دار
مشعلِ علم و یقین و آشنائے روزگار
نازشِ و فخرِ علی گڑھ فاتحِ لیل و نہار
خدمتِ اردو زباں جس نے بنایا تھا شعار
اس تہی مایہ کو بخشا جس نے گنجِ بے شمار
جس کے مقصد سے عبارت قوم کا عز و وقار
جو جہادِ زندگی میں کامیاب و کامگار
درس گاہِ نطقِ پاکستاں کا بانی اٹھ گیا
سیدِ عالی ہمم کا نقشِ ثانی اٹھ گیا
یک شہیدِ جستجو و یک زعیمِ پختہ کار
جادۂ عزم و عمل ذوقِ یقیں کا شہسوار
تشنہ کامانِ ادب کے حق میں جامِ مے گسار
دشمنانِ علم کے حق میں برہنہ ذوالفقار
یک محقق یک معلّم یک دلیلِ استوار
محفلِ علم و ادب میں ایک شمعِ اعتبار
عظمتِ انسانیت کی ایک روحِ تابدار
خالقِ طرزِ جدید و علم کا پروردگار
یک امیرِ کاروانِ کامرانی اٹھ گیا
دورِ پیری جس کا تھا فخرِ جوانی اٹھ گیا

۱ محسن الملک ۲ شبلی نعمانی ۳ خواجہ الطاف حسین حالی ۴ وقار الملک ۵ سرسید علیہ الرحمہ
۶ جسٹس محمود (بانیانِ علی گڑھ کالج)

ارشد کاکوی

بابائے اردو

(بابائے اردو کی وفات کی اطلاع سن کر یہ نظم فی البدیہہ کہی گئی ——— ارشد)

موت برحق ہے زندگی کی طرح　　تیرگی سچ ہے روشنی کی طرح
مختصر ہے بہار کا دامن　　اور خزاں ہے حقیقتِ گلشن
صفحۂ زیست، وسعتِ غم ہے　　ہاں خوشی کا وجود کم کم ہے
مے میں جتنی ہے کیف آگینی　　اس سے زاید ہے زہر کی تلخی
گریہ ہے یاں سزا تبسّم کی　　زندگی کی ہے شرط مرنا بھی

"موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے"

سب بجا سب درست سب تسلیم　　ہاں مگر اک سخن ہے ربِّ عظیم
یوں تو ہر چیز رفتنی ٹھہری　　کچھ تو لازم ہے اک توقف بھی
اس کے حق میں جو صاحبِ حق ہو　　جس سے باطل کا رنگِ رخ فق ہو
تھا انہیں اہلِ حق میں عبد الحق　　جس کو روتے ہیں اب لغت کے ورق
اس کی ایک ایک سانس اردو تھی　　ایک مقصد تھی زندگی اس کی

پھول جیسے بسا ہو خوشبو میں
جان اٹکی ہوئی تھی اردو میں

اس بڑھاپے میں نوجوان تھا وہ　　ذات سے اپنی اک جہان تھا وہ

موت سے کچھ گریز اس کو نہ تھا   سب کی منزل کا ہے یہی رستا
جانتا تھا کہ اس کو مرنا ہے   اک اٹل راہ سے گذرنا ہے
ہاں مگر آرزو تھی جینے کی   تاکہ قائم ہو یونی ورسٹی
کب ملا زخمِ مرگ کا مرہم   غم اگر ہے تو صرف اس کا غم

جس کی خاطر وہ جان دیتا تھا
اس کو دیکھے بغیر جانا پڑا

اک تصور نہ بن سکا تصویر   رہ گئے خوابِ تشنۂ تعبیر
اس کو دو چار سال مل جاتے   سارے گلہائے شوق کھل جاتے
جس کو سینچا تھا خون سے اپنے   دیکھ لیتا وہ برگ و بار اس کے
یہی اس کی بڑی تمنا تھی   جس کو مہلت نہ موت نے بخشی
زرد کا فرد اشک بار ہے آج   قوم کی قوم سوگوار ہے آج

" ایک روشن دماغ تھا نہ رہا "
انجمن کا چراغ تھا نہ رہا

گرچہ ہر سمت تیرگی سی ہے   اس دھوئیں میں بھی روشنی سی ہے
جلوہ روشن ہے اور نظر روشن   نقشِ پا سے ہے رہ گذر روشن
آج سے گرچہ راہبر نہ رہا   ہم کو رستہ مگر بتا کے گیا
صرف تنظیم کی ضرورت ہے   چلتے رہنا بڑی قیادت ہے
اس کی تقلید فرض ہے ہم پر   جامعہؔ ایک قرض ہے ہم پر

جلد اس قرض کو چکانا ہے
اس کو اک روز منہ دکھانا ہے

ؔ مجوزہ اردو یونیورسٹی

(پاسبان ڈھاکہ)

۱۸ / ۵ / ۱۹۶۱ء

انور احسن صدیقی

بابائے اردو کے نام

•

شمع فسردہ گل ہو گئی ہے — با دیدۂ تر، با چشمِ پُر نم
ابرِ فنا میں گھنا گیا ہے — ماہِ منور، دردِ مجسّم
چُپ ہو چکا ہے گم ہو چکا ہے — اک سازِ لرزاں اک سوزِ پیہم
اک جانِ بیتاب و روحِ غم گیں — شیون ہی شیون، ماتم ہی ماتم

•

آورش کی لَو دل میں لگا کر — جلتے ہوئے روز و شب گزارے
اہلِ ہوس نے ہم راز بن کر — سینے میں کتنے خنجر اتارے
ان بوڑھی آنکھوں نے خون رو کر — ہر ہر قدم پر ڈھونڈے سہارے

•

پُر پیچ رستے، خوں ناب راہیں — دامِ فریب و سنگیں مراحل
رہ رو، کہ دشمن؟ رہبر، کہ رہزن؟ — بستی، کہ جنگل؟ طوفاں، کہ ساحل؟

حرفِ عنایت یا زہرِ شیریں؟ دستِ محبت، یا دستِ قاتل؟

●

اے مردِ دانا، اے جانِ خرد بیں اے زلفِ دانش سلجھانے والے
جہد و کشاکش کے معرکے میں اُمّیدِ ناکام پانے والے
تیغِ جفا کے صدمے اٹھا کر عزمِ جواں میں کھو جانے والے

●

تو نے امیدِ مہر و وفا میں جن بارگاہوں سے لَو لگائی
لُٹتا ہے ان میں ناموسِ آدم ملتا ہے درسِ عجز و گدائی
تو نے یہاں کے جام و سبو سے کام و دہن کی تلخی ہی پائی
ترسے سدا وہ تیرے کرم کو قبضے میں جن کے ساری خدائی

●

پھر بھی وہ تیرے مدحت سرا ہیں تحسین جن کی تحسینِ دائم
آئے ہیں لے کر نذرِ عقیدت پیشِ خلوص و صدقِ مکرّم
آورش، اور شانِ سرفروشی تقدیسِ ہستی، معراجِ آدم
ٹھوکر میں جن کی پیہم رہے ہیں سرہائے دارا و قیصر و جم

●

راز یوسفی

آہ ! بابائے اردو

کس کی خاطر ہو رہے ہیں دیدۂ دل اشکبار
کیوں شکیب و صبر کا دامن ہوا ہے تار تار؟

گونجتا ہے کیوں فضا میں آہ و نالہ کا خروش؟
کس کی خاطر بلبلِ رنگیں نوا ہے غم خروش؟

○

کس کے اٹھ جانے سے محفل ہوگئی ویران سی؟
غم کا پیکر بن گئی ہے کس کی خاطر زندگی ؟

دے کے اک داغ جدائی چل بسا ہے آج کون؟
موت کے پہلو میں جا کر سو گیا ہے آج کون ؟

○

کون گلشن کی بہاریں ساتھ اپنے لے گیا؟
چھین کر پھولوں کی نزہت غم کے کانٹے دے گیا

دستِ خونیں بن گیا، دستِ صبا کس کے لئے؟
صبحِ رنگیں لائی پیغامِ قضا کس کے لئے؟

○

محشرِ غم ہے بپا ، بابائے اردو چل بسا!
ہے فغاں "واحسرتا! بابائے اردو چل بسا"

چل بسا وہ لیلیٰ اردو کا جو دیوانہ تھا!
"گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ تھا"

○

ضعفِ پیری میں بھی اک تاب وتواں رکھتا تھا وہ — جرأت مردانہ اور عزم جواں رکھتا تھا وہ
پیکرِ فکر و عمل تھی اس کی ذاتِ پُرصفات — اس کے جوہر کار سے واقف ہے ساری کائنات

○

عمر بھر جیتا رہا اردو زباں کے واسطے — حالِ غم بیتا رہا اردو زباں کے واسطے
ڈرنا حالات سے تھا اس کی فطرت کے خلاف — دشمنوں کے منہ پہ کہہ دیتا تھا باتیں صاف صاف

○

تلخیاں وہ گردشِ ایام کی سہتا رہا — لاج رکھ کر نام کی حق بات ہی کہتا رہا!

○

ہے مقامِ یاس اے اردو زباں تیرے لئے! — پیدا ہوگا ایسا محسن اب کہاں تیرے لئے
کون ہوگا وقف یوں تیری حفاظت کے لئے؟ — جان کردے گا نچھاور تیری عظمت کے لئے

○

کون لائے گا ترے گلشن میں اب فصلِ بہار؟ — عارض و رخ پر ترے آئے گا اب کیسے نکھار؟
زلفِ پیچاں کو تری اب آکے سلجھائے گا کون؟ — تیری خاطر تلخیٔ غم رات دن کھائے گا کون؟

کاش پھر ہو جائے پیدا ایک عبد الحق یہاں
جادہ پیما سوئے منزل ہو ادب کا کارواں

○

"امروز"۔ لاہور ۲۷ر۸ر۱۹۶۱ء

راگھویندر جذب عالم پوری

آہ بابا

اردو کو بہت خوب سنوارا تو نے — اس کے لئے کتنوں کو ابھارا تو نے
اردو کے لئے تھا یہ زمانہ نازک — یک لخت کیا اس سے کنارا تو نے

تجھ کو اردو سے تھی محبت بابا — کی تو نے بھی جی کھول کے خدمت بابا
بھارت کا ہو یا پاک کا رہنے والا — ہر شخص کو تھی تجھ سے عقیدت بابا

پیدا ہوئی بھارت کے چمن میں بابا — اور وہ بڑھی پنجاب و دکن میں بابا
بابا کہتی تھی تجھ کو اردو دنیا — اب جائے تو وہ کس کے شرن میں بابا

اردو کو تمام عمر تو نے پالا — اردو کو نئے روپ میں تو نے ڈھالا
وہ عزم فقط خواب نہ بن کر رہ جائے — ہو کوئی، تیری راہ پہ چلنے والا

گو تو نو دہ برس سے بڑھ کر ہی رہا — اردو کے لئے تو یہ زمانہ کم تھا
دنیا سے چلا آنکھوں سے اوجھل بھی ہوا — وہ کام ہے تیرا کہ ہے زندہ گویا

روزنامہ "ملاپ" حیدرآباد دکن

۲۳ [illegible] ۹۱

حفیظ تائب

بابائے اردو

ایک دھن، ایک طلب، ایک لگن رکھتا تھا
عین پیری میں جوانوں سا چلن رکھتا تھا

علم و فن کی نئی اقدار کا وہ حامی تھا
طبع گو سادہ تھی اور وضع کہن رکھتا تھا

اس کے تخیل میں، افکار میں اک جدت تھی
اک جداگانہ وہ اسلوبِ سخن رکھتا تھا

زندگی بھر کی جگر کاوئ پیہم کا ثمر
لہلہاتا ہوا اردو کا چمن رکھتا تھا

وہ فقط اردو زباں ہی کا نہیں تھا غم خوار
زندگی وقفِ غمِ قوم و وطن رکھتا تھا

اٹھ گیا دہر سے گنجینۂ معنی تائب
وہ جو الفاظ کے انمول رتن رکھتا تھا

وقار خلیل

سلک غم

اک مردِ حق شناس کا، رہبر کا ذکر ہے
بحرِ ادب کے ایک شناور کا ذکر ہے

اردو زباں کی بزم میں اے روحِ عصرِ نو!
اردو زباں کے ایک پیمبر کا ذکر ہے

اردو زباں کہ جس نے دبستاں بنا دیا
اور نغمۂ حیاتِ بہاراں سنا دیا

وہ عہدِ حق مزاج شناسائے ماہ و سال
اردو کا اس کے ساتھ رہا ہر گھڑی خیال

اک انجمن کہ صدر نشینے بہ انجمن
اس عہدِ پرفتن میں وہ تھا صاحبِ کمال

تہذیب کی زبان کہ اردو کا تھا مزاج
عاجز ہے نطقِ الحسن اردو کو دیں خراج

ہر لب پہ ایک فردِ مکرم کا نام تھا
پیری میں جس کا عزمِ جواں تیز گام تھا

اردو ہو سربلند زمانے میں اور بھی
پیشِ نظر بھی تو فقط ایک کام تھا

ایماں جس کا جہد و عمل تا حیات تھا
جو پیکرِ خلوص تھا قند و نبات تھا

خاؔلی کے جانشین کا ماتم ہے صاحبو!
دل سوگوار، آنکھ بھی پُرنم ہے صاحبو!
اک ذاتِ انجمن تھی کہ اک فردِ جامعہ!
کچھ جی ہی جانتا ہے کہ کیا غم ہے صاحبو!

میخانۂ ادب میں ہے کہرام ہم نشیں!
ساقی اُداس، چُور ہیں سب جام ہم نشیں!

اردو آفتاب چرخِ غزالاں ہے سرنگوں
اور قسمتِ عروسِ بہاراں ہے سرنگوں
اک خاورِ ادب ڈھلا نصف النہار پر
اک پرچمِ عروجِ کمالاں ہے سرنگوں

اردو کی سرفراز جبیں خم ترے حضور
فکر و سخن کی محفلیں پُرنم ترے حضور

ہر عہد میں، ہر آئینہ، ہر رخ سے فروزاں
نقشِ کفِ پا ہوں گے ترے بزمِ چراغاں
اور قافلۂ عمر رواں بڑھتا رہے گا
مہکیں گے ترے نام پہ صد سنبل و ریحاں

ہر پیرہنِ گل سے جو آئے گی تری یاد
خوں روئیں گے پھر صحنِ چمن میں سرو شمشاد

جوہر صدیقی

بابائے اردو

بمبئی

۱۶؍اگست ۱۹۶۱ء

آج موجودہ صدی کے سب سے اندوہناک اور عظیم ترین حادثے کی خبر ملی۔ بابائے اردو کی موت نے اردو اور اردو والوں کو اپنے سچے سرپرست اور رہنما سے محروم کر دیا، پیرانہ سالی کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو دنیا کے موجودہ سنگین مسائل کے پیش نظر ان کی موت نا وقت ہوئی!

خدا مرحوم کی قبر پر تا ابد قیام رحمتوں کی بارش فرمائے اور پس ماندگان کو صبر کا حوصلہ بخشے۔

ان کی جدائی نے ہمارے دلوں کو سخت مایوسی سے دوچار کر دیا ہے لیکن اپنے مشن سے ان کی سچی لگن بے غرض خدمات اور پیری میں ان کے جواں عزم کارنامے ہمیں سخت سے سخت حالات میں بھی ہمت اور سلامت روی کے حوصلے عطا کرتے رہیں گے۔

کشتۂ غم

جوہر صدیقی

قطعۂ تاریخ

رفت چوں بابائے اردو زیں سرا — فکر تاریخ وصالش شد مرا

از سر بام فلک آمد ندا — اہل دل اہل نظر اہل وفا

۲

۱۳۷۹
+ ۲
۱۳۸۱

اے کہ سرتاج ہمالہ تھا ترا عزم صمیم — اے کہ تیرے نام سے لرزاں دلِ امید و بیم

اے کہ پیری میں بھی تھا عزم جواں تیرا ندیم — زندگی بھی تھی عظیم اور موت بھی تیری عظیم

شہسوار اشہبِ ہستی بمیدانِ عدم

السلام اے محفلِ دانش کے صدرِ محترم

فکر تیری جلوۂ معنیٰ سے ٹکراتی ہوئی
اور نظر تیری جمال شوق برساتی ہوئی

گفتگو تیری دل ہستی کو برماتی ہوئی
ہر ادا اخلاص کے اسرار سمجھاتی ہوئی

آبروئے عظمتِ تحقیق تھا تیرا قلم

السلام اے محفلِ دانش کے صدر محترم

زندگی علم و عمل کا وہ حسیں تر امتزاج
جس کے آگے سرنگوں تھا احتشام تخت و تاج

پوچھتی رہتی تھی تقدیر ادب جس کے مزاج
کرسکیں گے کیا ادا اہلِ قلم اس کا خراج

ہے کسے اس بارگہ میں جرأت لا و نعم

السلام اے محفل دانش کے صدر محترم

زلفِ اردو آج بھی تیری رہین شانہ ہے
قلب ارباب زباں یعنی ترا کاشانہ ہے

جس پہ ہے نازاں حقیقت وہ ترا افسانہ ہے
شمع خود پروانہ جس کی تو وہی پروانہ ہے

منزل حسنِ یقیں ہے تیرا ہر نقشِ قدم

السلام اے محفل دانش کے صدر محترم

کتنا عریاں تھا جمالِ آگہی تیرے لئے
تھی اندھیرے میں بھی گویا روشنی تیرے لئے

غم میں بھی پنہاں تھا رازِ سرخوشی تیرے لئے
درحقیقت موت بھی ہے زندگی تیرے لئے

تو نے رکھ دی ہو بدل کر جیسے تاریخ عدم

السلام اے محفلِ دانش کے صدر محترم

قطعاتِ تاریخِ وفات بابائے اردو عالیجناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم و مغفور نوراللہ مرقدہٗ

کاشف الہاشمی اجینی

اپنے غم میں ایک عالم کو تڑپتا چھوڑ کر
ڈاکٹر صاحب روانہ ہو گئے سوئے ارم
سانحے سے کم نہیں بابائے اردو کی وفات
چھا گئی ہے محفلِ اردو پہ کاشف "شامِ غم"
۱۳۸۱ھ

نازشِ ننگ و نامِ علم و ادب
باعثِ عز و افتخارِ زباں
تھا جو بے لوث خادمِ اردو
اٹھ گیا اف وہ "غم گسارِ زباں"
۱۳۸۱ھ

برائے لوحِ تربت

اعتبارِ زباں کا مدفن ہے
افتخارِ زباں کا مدفن ہے
با ادب با ملاحظہ کاشف
"غم گسارِ زباں" کا مدفن ہے
۱۳ ھ ۸۱

پیر غلام دستگیر نامی

دریغا حسرتا بابائے اردو
ہوئے اصعب مرض میں مبتلا آہ
بہت کوشش کی صدرِ مملکت نے
مگر تھا کچھ مرض ہی لا دوا آہ
ہوئیں سب کوششیں ناکام آخر
گئے بابا سوئے دارالبقا آہ
ہوئے جب فوت وہ نامی پکارا
"گرفتارِ مرض بابا جدا آہ"
۱۹۶۱ء

جو ہجری سال ہے مطلوب تو لکھو
"کہ آئی تیز بابا کی قضا آہ"
۱۳ ھ ۸۱

مادۂ سالِ وصالِ بابائے اردو

(از حکیم محمد موسیٰ امرت سری)

"امامِ اردو بدارالنعیم رفت"
۱۳ ھ ۸۱

جمیل نقوی

بعد از مرگ زاد!

ادب کے نام پہ قائم ہیں حلقہ ہائے نہنگ
زباں کے پردۂ زرکار میں چھپے ہیں پلنگ
یہ اہلِ علم، یہ اردو زباں کے شیدائی
بڑے خلوص سے لڑتے ہیں اقتدار کی جنگ
زباں کا زور دکھاتے ہیں اس طرح جیسے
کوئی حریف مخالف پہ پھینکتا ہے خدنگ
مرے بزرگ، مرے رہنما، مرے محسن
قسم خدا کی گوارا نہ تھا تجھے یہ ننگ
تمام عمر اسی فکر میں رہا غلطاں
کوئی سبیل کہ چھٹ جائے فطرتوں سے یہ زنگ
ضمیرِ عصر سے کچھ یوں ستیزہ کار رہا
کہ جیسے شعلۂ مضطر میانِ تیشہ و سنگ
ترا بیاں تھا دلِ قوم کی دکھی آواز
ترا سکوت حریفِ سیاستِ افرنگ
ترے خیال کی رنگینیوں کے محور پر
سمٹ کے آئے ہر اک سمت سے نئے آہنگ

ترے قلم کی روانی، تری زبان کا لوچ
کہ حرف حرف شگفتہ ہے سطر سطر اُمنگ
مقدماتِ فلاطوں، مقدمات ترے
کہ پیش کرتے ہیں تحقیق و جستجو کے ڈھنگ
تری نگاہ کی معصومیت کے پرتو سے
عیاں ہے چہرۂ اردو سے اعتدال کا رنگ
تری حیات تھی حسنِ عمل کی راہنما
تری ممات نئی زندگی کی ایک ترنگ

زمانہ تیری صداقت کا گو رہا شاکی
مگر کبھی نہ زمانہ کی تو نے کی پروا کی
ادب میں حق و صداقت کی لاج تھی تجھ سے
ترے مزاج کا جوہر تھی تیری بےباکی
تری خودی میں تھے اسرار بیخودی پنہاں
ترے جنوں سے گریزاں خرد کی چالاکی
وہ تیرا عزمِ مصمم وہ تیرا جوشِ عمل
دلیلِ عظمتِ کردار آدمِ خاکی
خود اپنا خونِ جگر صرفِ سوزِ غم کر کے
خلوصِ درد کی نادر مثال پیدا کی
ترے خلوص کی شدت سے پارہ پارہ تھا
طلسمِ مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی
سابقِ عصر تھا، تو بھی مثالِ سرسیّد
جہاں سے اٹھ گیا دے کر نوید فردا کی

(رسالہ ماہ نو کراچی اکتوبر ۱۹۶۱)

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

ہفت روزہ لیل ونہار - لاہور

بابائے اردو کی رحلت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے رسمی یا محدود معنوں میں نہیں بلکہ ہر اعتبار سے اور ہر معیار سے، اس مرد بزرگ کے ساتھ ایک پورا دور ختم ہوا ہے، ایک نہایت اہم باب تمام ہو گیا ہے۔ ایک تہذیب کی روشن علامت مٹ گئی ہے۔ ایک روایت مر گئی ہے، ایک ایسا ستارہ غروب ہو گیا ہے جس نے کئی نسلوں کو راہ دکھائی تھی، اور ایک ایسا تعلق اور ایک ایسا رشتہ ٹوٹ گیا ہے جس کی بدولت ماضی اور حال کے درمیان ایک ربط قائم تھا!

اس مختصر سے کالم میں اتنی گنجائش کہاں کہ قبلہ مولوی صاحب مرحوم کی صفات وعنایات اور احسانات صرف گنا ہی دیے جائیں۔ اس کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے اور اس مقصد سے بھی ایک مورخ اور محقق کے قلم کی ضرورت ہے۔ دراصل مولوی صاحب پچاس برس تک ایک ایسی تحریک کے روح رواں رہے جو ہماری تہذیبی اور قومی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ ان کی زندگی ایک ایسی عبادت میں بسر ہوئی ہے جس میں صلے کی توقع، اجر کی آرزو یا مادی فائدے کی امید نام کو نہ تھی۔ خدمت ان کا مسلک تھا اور اسی میں ان کی عظمت تھی۔ ہمارے سامنے کئی بزرگ شخصیتیں اس دنیا سے اٹھی ہیں جن کے ماتم میں پوری قوم شریک ہوئی۔ مگر ان میں سے ہر ایک کی عظمت میں کسی اعلیٰ منصب یا اعلیٰ عہدے کا دخل تھا۔ مولوی صاحب اس سے بے نیاز تھے۔ ان کی شخصیت کسی منصب کی محتاج نہیں تھی۔ اسی لئے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کی رحلت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کے پُر ہونے کی امید نہیں ہے تو یہ جملہ واقعی بامعنی ہے۔ ہمیں دور دور تک مرحوم کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا!

زندگی کے آخری ایام میں انسان گوشۂ عافیت ڈھونڈتا ہے، اطمینان اور آرام کا متلاشی ہوتا ہے، اپنے ماضی سے کٹ کر گمنامی کے سکون میں پناہ لیتا ہے۔ عمر جتنی طویل ہوتی ہے، دنیا کے ہنگاموں سے بے تعلقی کی طلب اور بیزاری اتنی ہی شدید ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے جری لوگ

بھی عمر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں جن اصحاب کے عزم و حوصلہ اور جذبۂ عمل کو ماہ و سال کی اوس کبھی سرد نہ کرسکی ان کی تعداد صرف ہماری تاریخ میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی بہت کم ہے اور ان میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی شامل ہیں۔ نوّے سال کی عمر میں بھی وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے سرگرم رہے، ان کی جرات، استقامت اور لگن جوانوں کو بھی ششدر کرتی رہی۔ بستر مرگ پر بھی وہ اپنے فرض سے غافل نہ ہوئے اور ان کی وصیت بھی ان کے مشن کا حصہ تھی۔ مولوی صاحب کی متنوع زندگی کے صرف اسی ایک پہلو کو اگر ہم اپنے لئے مثال مقرر کرلیں اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں تو ہم ہر طوفان کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور تیز و تند بادِ مخالف کے سامنے بھی ہمارے چراغ روشن رہ سکتے ہیں!

مولوی صاحب نے ایک مفکر، محقق اور ادیب کی حیثیت میں اردو کو بہت کچھ دیا ہے۔ وہ ہماری قیمتی علمی اور ادبی اثاثہ ہے مگر اردو سے مرحوم کی وابستگی صرف ایک لسانی یا ادبی تعلق تک محدود نہیں تھی اس صورت میں وہ صرف قلم سے کام لیتے۔ میدان عمل میں اترنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے، مگر وہ اردو کو ذریعہ انقلاب سمجھتے تھے۔ اس کی مدد سے معاشرتی اور تمدنی انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ لسانی استعمار کو شکست دینے کی کوشش میں تھے ذہنی غلامی کی زنجیریں توڑنا چاہتے تھے۔ وہ اس ذریعہ سے قومی انفرادیت اور قومی وقار بحال اور قومیت کا احساس عام کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اردو کے معاملے میں انتہائی حساس تھے ان کا یہ مشن ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس معاشرتی، تمدنی اور ذہنی انقلاب کی رفتار بے حد سست ہے۔ اگر ہم مولوی صاحب کو اپنا محسن مانتے ہیں، ان کی خدمات کے معترف ہیں تو احسان شناسی کا (اور خود ہماری سربلندی کا بھی) تقاضہ ہے کہ ہم اس منزل تک جلد سے جلد پہنچنے کی فکر کریں جس پر مولوی صاحب کی نظریں ہمیشہ جمی رہیں، یہی بہترین خراج عقیدت ہے رسمی تعزیت اور نمائشی سوگ کے مولوی صاحب محتاج ہیں اور نہ ان جیسے باعمل شخص کی روح اس سے مطمئن ہوسکتی ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۶۱ء

ماہنامہ "مہر نیمروز" کراچی

سید نواب علی، سید یدالعلی۔ سید حسن امام، تمکین کاظمی، مولانا ابوالحسنات، خواجہ دل محمد۔ ڈاکٹر عبدالحمید پی۔ ایچ ڈی اور مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ جیسے اہل علم و فن کے اٹھ جانے کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے الوداع کہی۔

غم اس کا نہیں ہے کہ ان لوگوں نے کوچ کیا بزم ہستی میں کون ہے جو ہمیشہ کے لئے آیا ہو۔ یہاں کی نیرنگیوں میں سب سے نمایاں اور سب سے پائدار اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلوع و غروب ہی کا منظر تو ہے،

کھلنا اور مرجھانا، تھکنا اور تھکانا، جینا اور مرنا ـــــ
نبات ایک اخیر کو ہے زمانے میں ـــــ نہ جانیں
کب سے ہے اور کب تک رہے گا غم تو اس کا ہے کہ
یہ اٹھ جانے والی ہستیاں اپنے ساتھ بہت سی وہ خوبیاں
بھی لے جاتی ہیں جو پچھلے معاشرے نے اور ماضی کی صلاحیتوں
جدوجہد نے اپنی برسوں کی کمائی سے ان کو عطا کی تھیں۔ یہ
لوگ جس معاشرے کے پروردہ تھے وہ بڑی محنتوں مشقتوں
اور قربانیوں کے بعد بنا تھا۔

۱۸۵۷ء میں بعد اسلامیان برعظیم من حیث القوم
باغی قرار دے دئے گئے تھے اور ان کی حیات اجتماعی کے ایک
ایک شعبے کو باقاعدہ پروگرام بنا کر تباہ و برباد کیا گیا تھا۔ پوری
کوشش کی گئی تھی کہ اپنے درخشاں ماضی سے کوئی رشتہ ان
کا باقی نہ رہے۔ رشتہ باقی رہنے میں ان کے دوبارہ سر
اٹھانے کا خطرہ تھا، اس لئے وہ بری طرح پراگندہ اور
پریشان حال کر دئے گئے تھے۔ اگرچند حساس اہل دل
پیدا نہ ہو گئے ہوتے تو یہ قوم تو کب کی فنا ہو چکی تھی
مولانا قاسم نانوتوی اٹھے۔ مولانا سید احمد خان اٹھے اور ان
کے رفقا مولانا حالی۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ قاضی
رضا حسین۔ مولانا شبلی، نواب محسن الملک اور نواب
وقار الملک اٹھے، مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا شاہ
سلیمان پھلواروی اٹھے۔ ان کے رفقا آگے بڑھے۔ بانیان
انجمن حمایت اسلام لاہور ان کے رفقا اٹھے ان لوگوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کے صفحات پر
مرتسم ہو چکا ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مجلس ندوۃ العلماء اور انجمن حمایت اسلام
لاہور کی تحریک تعلیمی اور سرسید کی تحریک نے قوم میں زندگی اور معاشرہ اسلامی ذہنی زندگی
کا احساس پیدا ہو چکا ... [illegible]

شیخ عبدالقادر، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی،
مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ظفر علی خان۔ میاں شاہ دین
مولوی فضل الحق۔ سر شفیع۔ قاضی سلیمان منصور پوری۔ علامہ
سید سلیمان ندوی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرزا سلیمان
مولانا آزاد سبحانی۔ مولوی مظہر الحق۔ ڈاکٹر انصاری
حکیم اجمل خان۔ سید رضا علی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین۔ سر
عبدالرحیم۔ آغا خان۔ عزیز مرزا۔ پیر غلام مجدد سرہندی
حسین احمد مدنی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ نامور
فرزندان ملت ابھرے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
بھی اسی معاشرے کے پروردہ اور انہیں ناموروں میں
سے ایک بڑے نامور تھے،

وہ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے ۱۸۸۶ء میں
جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی تو ان کی عمر
پندرہ سولہ سال کی تھی۔ ۱۸۹۴ء میں مجلس ندوۃ العلماء
کی بنیاد پڑی تو وہ ۲۲ سال کے تھے۔ سر سید نے ۱۸۹۸ء
میں وفات پائی تو وہ ۲۶ سال کے تھے ۱۹۰۶ء میں
آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی تو ان کی عمر ۳۶ سال کی تھی،
اور حالی و شبلی نے جب اس جہان فانی سے کوچ کیا تو وہ
اپنی عمر کے چالیسویں چوالیسویں سال میں تھے اور آج
جب انہوں نے خود رخت سفر باندھا تو ان کی عمر شمسی
حساب سے ۹۱ سال ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے ایک موضع
سراوا میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد شیخ علی حسن تعلقہ
کے اور پیچ سے محکمہ مال گذاری ... البتہ ... [illegible]

وجہ سے وہ پنجاب میں رہتے تھے اس لئے ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم پنجاب کے اسکول میں ہوئی تھی مگر مڈل اسکول کے بعد علی گڈھ آ گئے اور اپنی تعلیم یہیں مکمل کی ١٨٩٥ء میں علی گڈھ سے بی اے کیا - بی اے میں ان کا سبجکٹ فلسفہ تھا جس کا اثر ان کے ذہن و فکر پر تمام عمر رہا لیکن وہ فلسفیوں کی طرح نظری نہیں بلکہ سرتاپا عملی تھے - ڈاکٹر سر ضیاء الدین، خواجہ غلام الثقلین، مولانا ظفر علی خان، چودھری خوشی محمد ناظر اور میر محفوظ علی بدایونی وغیرہ جیسے ذہین لوگ ان کے ساتھیوں میں تھے - ڈاکٹر صاحب نے بی اے پاس کرنے کے بعد مختلف ملازمتیں بھی کیں لیکن اصل خدمت ان کی وہی تھی جو ١٩١٢ء کے بعد ان کے سپرد ہوئی یعنی انجمن ترقی اردو کی ذمہ داری، انجمن ترقی اردو کے سب سے پہلے سکریٹری علامہ شبلی منتخب ہوئے تھے - ان کے بعد عزیز مرزا اور ان کے بعد ڈاکٹر عبدالحق ۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ ملت اسلامیہ پوری قوت کے ساتھ میدان سیاست میں اتر چکی تھی۔ مسجد شہید کانپور جنگ بلقان، جنگ عظیم، مسلم لیگ اور کانگرس اور مجلس خلافت اور پھر عہد خلافت سے لے کر مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ تک کی سیاسی کش مکش - ایک عجیب ہنگامہ خیز دور ہے - ساری قوم سیاسیات میں ڈوبی ہوئی تھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مجلس ندوۃ العلماء کے اجلاس کی وہ پابندی ختم ہو گئی۔ یہ دونوں جماعتیں رفتہ رفتہ پس منظر میں چلی گئیں مجلس ندوۃ العلماء کا آخری اجلاس ١٩٢٧ء میں ہوا جس کا آخری پیغام " فقہ اسلامی کی تدوین جدید " تھا۔ اس کی صدارت حکیم اجمل خان نے کی تھی اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آخری اجلاس ١٩٢٩ء میں پٹنہ میں ہوا۔ اس کا آخری اعلان یہ تھا کہ برعظیم کی لنگوا فرینکا اردو ہے ، یہ اعلان شیر بنگال ، مولوی فضل الحق کی زبان سے ہوا تھا مجلس ندوہ کی جگہ دارالمصنفین نے لے لی تھی - اور کانفرنس کی وارث انجمن ترقی اردو تھی - جسے اردو ہندی کے سیاسی جھگڑے نے اور نمایاں کر دیا تھا۔ اس کا مرکز پہلے اورنگ آباد میں رہا اور پھر دلی میں، اور پاکستان بنا تو ڈاکٹر صاحب اسے کراچی لے آئے ۔

ڈاکٹر صاحب نے کچھ کم پچاس سال انجمن کی سربراہی کی، انجمن ترقی اردو کو اگر سلطنت مغلیہ قرار دیں تو ڈاکٹر صاحب اس کے شہنشاہ اورنگ زیب تھے - ان کے کارناموں کا جائزہ لینے کے لئے دو چار صفحے کافی نہیں۔ انہوں نے محکمہ آثار قدیمہ کی خدمات بھی انجام دی ہیں اور نادر قلمی کتابیں برآمد کر کے شائع کی ہیں اور مقدمے تو بے شمار لکھے ۔ ان کے رفیق درس میر محفوظ علی بدایونی اپنے ظریفانہ انداز میں ان کو "مقدمہ باز" کہا کرتے تھے ۔ نئی نئی کتابیں خود بھی لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں وہ سر سید، حالی و شبلی کے وارث تھے اور بجائے خود مجتہد بھی ان میں بلا کی قوت عمل تھی - وہ جوانوں سے بھی زیادہ حوصلے اور ہمت کے ساتھ کام کرتے تھے اور جس بات کا فیصلہ کر لیتے تھے پھر کسی نہ کسی طرح اس کو پورا کر ہی کے دم لیتے تھے - اردو یونی ورسٹی کے قیام کی ان کو بڑی حسرت تھی اور یہ حسرت ان کے ساتھ گئی - آخر دم تک

ان کی زبان پر اسی کا نام تھا۔ کچھ دن اور زندہ رہتے تو اردو یونیورسٹی بھی قائم ہو جاتی۔ مگر خدا کو یہ منظور نہیں تھا اس نے ان تمام ذمہ داریوں اور عزائم کو جو صرف ایک ذات میں مرکوز ہو کر رہ گئی تھی، از سر نو قوم کے سر ڈال دیا ہے اس قوم کے سر جو اکثر و بیشتر سارے کام اپنے رہنما اور پیشوا کے سر تھوپ کر یوں بے نیاز ہو جایا کرتی ہے جیسے وہ بالکل اجنبی ہو۔

عبدالحق کا نام اردو کے ساتھ اور اردو کا نام عبدالحق کے ساتھ اتنا وابستہ ہے کہ جب ایک کو یاد کیا جائے گا دوسرے کا تصور خود بخود سامنے آجائے گا۔ تصوف کی اصطلاح میں اسی کو منزل بقا و فنا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے "فنا فی الاردو" ہو کر "بقا باالاردو" کا مقام پا لیا اور یہ مقام ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء

ماہنامہ "افکار" کراچی

وہ پیر جواں حوصلہ جس نے آخری سانس تک اردو کے پرچم کو سر بلند رکھا، اور ادب تہذیب اور ثقافت کا امین رہا — بالآخر سفر آخرت پر روانہ ہو گیا— یہ سچ ہے کہ وہ ہمارے درمیان نہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ جسمانی طور پر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا لیکن کیا ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچ سکتے ہیں کہ بابائے اردو جس نے نصف صدی سے زاید زبان و ادب کے ایوانوں میں فکر و عمل کی قندیل فروزاں رکھی۔ جو بذات خود ایک مقصد، ایک مشن اور ایک سچائی کا مینارہ نور تھا جس کی زندگی اور موت بھی نسلاً بعد نسل تاریخ کے طلبا کو درس بصیرت دے گی کبھی مر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں جب تک اردو زندہ ہے اردو کا محافظ بھی زندہ رہے گا۔ عہد غلامی سے دور آزادی تک ہماری جد و جہد کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ کوئی بھی نو آزاد ملک اور نو آزاد قوم اس وقت تک حقیقی آزادی، مسرت اور خوشحالی کا تصور تک نہیں کر سکتی جب تک اس میں فکر و عمل، ایثار پسندی، ان تھک محنت، بلند حوصلگی، فرض شناسی دیانت، سچائی، عدل اور مساوات جیسی اعلیٰ صفات پیدا نہ ہوں — ان صفات کے بعد ہی قومی کردار کی تعمیر ممکن ہے۔

بابائے قوم، بابائے ملت اور بابائے اردو جیسی تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیتوں کی جدائی کے بعد ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہئے کہ ہم نے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے حصول آزادی سے قیام آزادی کی چودھویں سالگرہ تک ملک و قوم کی سربلندی، سرفرازی اور استحکام کے لئے کیا کیا، اور کیا نہیں— اگر ہم صرف لغو دل خباری بیانوں اور عہد غلامی کی مردہ پرست روایات کے سہارے ہی آج تک زندہ رہے ہیں تو اب ہمیں اپنے نقطۂ نظر میں انقلابی تبدیلی پیدا کر لینا چاہئے۔ کیونکہ مثبت قدروں کو اپنائے بغیر حقیقی آزادی کی تکمیل ممکن نہیں۔ بابائے اردو کی آخری تمنا تھی، اردو یونیورسٹی۔ ملک و قوم نے بابائے اردو کی موت کا

جس پُر وقار اور وسیع پیمانے پر سوگ منایا، اور عوام سے لے کر صدر مملکت تک نے جس خلوص اور عقیدت سے اظہار غم کیا، اس کو دیکھتے ہوئے یہ گمان یقین بن چکا ہے کہ بابائے اردو کی آخری تمنا جس کے قیام کی جدوجہد کرتے کرتے ان کی سانس اکھڑ گئی۔ اب جلد سے جلد پوری کر دی جائے گی۔ اردو یونیورسٹی قائم ہو گئی تو سمجھئے ہم نے بابائی تمنا اور خواہش کا احترام ہی نہیں کیا بلکہ ایک زندہ متحرک اور باعمل قوم کی حیثیت سے اپنے علمی، ادبی اور تہذیبی مستقبل کو بھی محفوظ کر لیا۔ بابائے اردو سے بھی سچی مخلصانہ اور بے ریا عقیدت کی آخری آزمائش اردو یونیورسٹی اور صرف اردو یونیورسٹی کا قیام ہے جس کی ذمہ داری بابائے اردو کی وفات کے بعد پوری قوم اور پورے ملک کی ذمہ داری ہے۔ کاش ہم اس ذمہ داری سے جلد عہدہ برآ ہو سکیں تاکہ بابائے اردو کی روح کو ابدی سکون مل سکے۔ (ستمبر ۶۱)

ماہنامہ "نیرنگ خیال" لاہور

بابائے اردو مولانا عبد الحق کی وفات ایک قومی سانحہ ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور زندگی کے آخری لمحات تک آپ اپنے مشن کو خوش اسلوبی سے چلاتے رہے۔ اللہ پاک انہیں جزائے خیر دے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ بخشے۔

مولانا عبد الحق کی وفات پر ساری قوم نے رسنا بہت کچھ کہا ہے۔ اخبارات اور رسائل میں بھی بہت کچھ لکھا گیا، اور اکابرین قوم نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے۔ لاہور میونسپلٹی نے قرارداد تعزیت پاس کی اور اردو یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا۔

پاکستان کے صدر محترم جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مولانا کو خطابات اور انعامات سے نوازا۔ آپ کی علالت کے ایام میں طبی امداد دی، اور اب ذاتی خرچ سے مقبرہ بنوانے کا اعلان فرمایا ہے۔ جزاک اللہ۔

پاکستان کے صدر محترم کو اردو سے نہ صرف شغف ہے، بلکہ محبت ہے اور آپ ادبی کارکنوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی میں بیش از بیش حصہ لیتے رہتے ہیں۔

یہ سب علامات اس سلسلہ میں حوصلہ افزا ہیں کہ مولانا عبد الحق کی ایک عظیم یادگار قائم کی جائے جو ان کے عظیم کارناموں کی صحیح معنوں میں یادگار ہو اور یہ یادگار اردو یونیورسٹی کے قیام کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ مولانا عبد الحق مرحوم نے اردو یونیورسٹی کا ڈھانچہ تیار کیا ہوا ہے بلکہ اس کی داغ بیل بھی ڈال دی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے کم از کم ایک کروڑ

روپے کے چندہ کا افتتاح کیا جائے۔

ایک کروڑ روپے کی فراہمی چنداں مشکل نہیں ہے۔ مغربی پاکستان کی تمام میونسپل کمیٹیاں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس فنڈ میں چندہ دیں۔ مثلاً میونسپل کمیٹی لاہور کو اس مد میں پانچ لاکھ روپے کے عطیہ کا اعلان کرنا چاہئے اور یہ رقم ایک لاکھ روپے سالانہ کے حساب سے پانچ سال میں ادا کر دینی چاہئے۔ اسی طرح کراچی کارپوریشن دس لاکھ روپے کا اعلان کر کے اس رقم کو پانچ سال میں ادا کر سکتی ہے اس طرح ہر چھوٹی بڑی میونسپل کمیٹی اس فنڈ میں کچھ نہ کچھ چندہ ضرور دے۔

اس فنڈ کے لئے صدر محترم پاکستان حکومت کی طرف سے ایک معقول رقم کے اعلان کے ساتھ افتتاح فرما سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اس سلسلہ میں ایک کمیٹی بنا دی جائے جو مختلف ذرائع اور طریقوں سے ایک کروڑ روپے کی فراہمی کر کے یونی ورسٹی کے سرمائے کی تکمیل کر دے یا رائٹرز گلڈز اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ بہرحال جو بھی مناسب طریقہ ہو وہ اختیار کر لیا جائے۔"

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "ہم قلم" کراچی

سولہ ۱۶ اگست کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا انتقال ہوگیا اس سانحے پر ملک اور بیرونِ ملک کے گوشے گوشے میں ماتمی قراردادیں منظور کی گئیں۔ صدر مملکت پاکستان، مغربی اور مشرقی پاکستان کے گورنروں اور دیگر حکام اور ہندستان کے اکابر نے بطور خاص انجمن کو تعزیتی پیغامات بھیجے (صدر مملکت کا پیغام انہی صفحات پر نقل کیا گیا ہے)

ظاہر ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کے نام اور کام پر اتنی جلد کوئی معقول دستاویز تیار نہیں ہو سکتی۔ بہت سے جریدوں نے "عبدالحق نمبر" نکالنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں "ہم قلم" بھی اپنی حد تک اگلے شمارے میں بابائے اردو کو خراج عقیدت پیش کرے گا لیکن مناسب یہ ہے کہ مرحوم کے بارے میں ایک نہایت مبسوط اور مفصل دستاویز تیار کی جائے۔ اردو کالج کراچی کا مجلہ "برگِ گل" تقریباً ایک سال سے اس موضوع پر کام کر رہا ہے اور ہماری اطلاعات کے مطابق اچھے اچھے لکھنے والوں کی کاوشیں جمع ہو گئی ہیں۔ ہم اس موقف کی تائید کرتے ہیں کہ مولوی صاحب کے مداح دوست اور مورخ اپنی تخلیقات "برگ گل" کو بھیجیں تاکہ ایک نذرانہ کے شایانِ شان مرتب ہو سکے۔

ادارہ "ہم قلم" کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ مولوی صاحب کو مختصر سے اداریے میں خراج تحسین ادا کرے۔ وہ بلاشبہ اس برعظیم کی سب سے بڑی زبان کے سب سے بڑے محقق اور سب سے بڑے کارکن تھے۔ قدرت نے بھی انہیں طویل عمر عطا کی جس کے سبب اردو کو زیادہ سے زیادہ فوائد پہنچے۔ مقام

شکر ہے کہ اس بار برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار کسی غیر سیاسی سطح کے بڑے آدمی کو ان کی زندگی ہی میں شایانِ شان اکرام و اعزاز ملے۔

اکتوبر کے انقلاب سے پہلے مولوی صاحب پر دو برس سخت ابتلا کے گزرے۔ انجمن کی سابقہ مجلس نظما خود انہوں نے بنائی تھی۔ اس کے چند ارکین سے ان کے اختلافات پیدا ہو گئے تھے جن کی بنا پر انہیں طرح طرح کی جسمانی، ذہنی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ انجمن کے اشاعتی اور تحقیقی منصوبے بھی معطل ہو کر رہ گئے تھے۔

انقلاب کے بعد مولوی صاحب نے انجمن اور کالج کو صدر ایوب کے سپرد کر دیا جنہوں نے ایک ضابطہ بنا کر انجمن مولوی صاحب کو واپس کر دی۔ اور ان کی منشا کے مطابق ایک نئی عبوری انتظامیہ بنا دی اور حکم جاری کیا کہ انجمن کے لئے ایک نیا اور مستقل دستور بنایا جائے۔ اس زمانے میں انہوں نے اردو کالج کے حالات درست کئے، کئی عمدہ کتابیں مرتب کیں۔ کئی پرانی مطبوعات دوبارہ شائع کیں اور چند تحقیقی منصوبے مکمل کئے جن میں سب سے اہم قاموس الکتب ہے جس کی پہلی جلد پر خود انہوں نے بسترِ مرگ سے دیباچہ لکھا اور جو ان کے انتقال سے صرف چند روز پہلے شائع ہوئی۔ اس دوران میں اردو یونیورسٹی کی تحریک بھی اپنے شباب پر پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے بزبانی [illegible] خاصان اور پاکستانی عوام میں یعنی ہر سطح پر اس کے لئے یکساں جوش و خروش پیدا کر دیا تھا اور اب وقت آیا کہ ان کا منصوبہ عملی شکلیں اختیار کرنے لگے۔ مگر وہ جگر کے سرطان میں مبتلا ہو کر بہترین معالجے کے باوجود ختم ہو گئے۔ افسوس کہ انجمن کی نئی انتظامیہ ان کی زندگی میں ان کی خواہش کے مطابق ایک مستقل دستور نہ بنا سکی حالاں کہ وہ اپنی سفارشات مرتب کر چکی تھی۔

انقلاب کے بعد مولوی صاحب کی ذاتی زندگی اچھی گزری وہ ملک کے سربراہ سے جب چاہتے تھے مل سکتے تھے۔ انہیں ہر سرکاری تقریب میں سب سے نمایاں مقام ملتا تھا۔ صدرِ مملکت خود ان کی مشایعت کرتے تھے۔ ان کی علالت کا علم ہوتے ہی صدرِ مملکت نے انہیں اپنا ذاتی مہمان بنایا اور مری لے جا کر بہترین معالج مقرر کر دئے تھے۔ خود صدر کے ذاتی معالج مولوی صاحب کی خدمت پر مامور رہتے اور جب وہ لندن گئے تو صدر کے حکم سے ہارلے اسٹریٹ کے ماہرین سے مولوی صاحب کی طبی رپورٹوں پر مذاکرات بھی کئے گئے مگر انہیں آخر کار لاعلاج قرار دے دیا گیا۔ اس سرطان کا علاج ابھی دریافت نہیں ہوا اور آخر مولوی صاحب اپنی مرضی کے مطابق کراچی آ گئے۔ کراچی میں بھی وہ مہمانِ صدر کی حیثیت سے پاکستانی بحریہ کے اسپتال میں رکھے گئے۔ جہاں بحریہ کے کمانڈر اِن چیف ان کی عیادت کرنے جاتے تھے اور صدرِ مملکت روزانہ ٹیلیفون سے ان کی خیریت معلوم کرتے تھے۔

جب مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو کراچی کے سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر بند کر دیے گئے، بازار سنسان ہو گئے، اسکول اور کالج سوگ منانے لگے۔ ان کے جنازے کو بڑی عوامی اور سرکاری اعزاز سے لے جایا گیا اور انہیں عام قبرستان کے بجائے انجمن کی عمارت میں دفن کیا گیا۔

دوسری طرف عوام، خواص اور طلبا ان کے عاشق تھے۔ ان کی بیماری کے زمانے میں اخبار مجبور تھے کہ روزانہ ایک طرح کا بلیٹن جاری کریں۔ انجمن اور گلڈ کے دفاتر میں روزانہ سینکڑوں ٹیلی فون آتے تھے۔ جب وہ بحریہ کے اسپتال میں تھے تو وہاں کے حکام کو عیادت کرنے والوں کے ہجوم سے پریشان ہو کر انتظامی اقدامات کرنے پڑے، ان کا جنازہ چند ساعت میں ایک عظیم الشان جلوس کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

مولوی عبدالحق مرحوم نے زندگی بھی شاندار پائی اور موت بھی، زندگی بھر وہ اردو کا کام کرتے رہے اور موت کے بعد اپنی یادگار ایک مضبوط تحریک اور فیض جاریہ چھوڑ گئے، جسے اردو تحریک کہتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور اردو کالج کراچی، اس تحریک کی دو ابتدائی منزلیں ہیں مگر تحریک ہمہ گیر ہے اور ہر جگہ ہزاروں شکلوں میں جاری ہے۔ ہندوستان میں انجمن کی تحریکات نے جو روپ دھارے، وہ بھی مولوی صاحب کی اولین مساعی کے سلسلے ہیں۔ ان اداروں کے درخشاں کارنامے ہر مقام کے اردو دوستوں کے لئے باعث فخر ہیں۔

مولوی صاحب گلڈ کے اولین بانیوں میں تھے اور گلڈ کے قیام کے بعد بھی اس کی عملی سرپرستی فرماتے رہے۔ ہم نے اپنی بہت سی مشکلات ان کی سرپرستی میں حل کیں وہ بزرگوں کے بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی ترقی پسند مفکر بھی تھے۔ وہ ہر صحت مند تحریک کی حمایت کرتے تھے، اور اس کے لئے محنت شاقہ سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے آدم جی ادبی انعام کے سلسلے میں ججوں کے بورڈ کا مستقل صدر ہونا قبول کر لیا تھا اور ۱۹۶۰ء میں جب کتابیں پڑھنے کا وقت آیا تو حالانکہ ان کی صحت پہلے سے خراب ہو گئی تھی مگر انہوں نے مشاہرے پر ایک طالب علم کو ملازم رکھ لیا۔ جس کا فرض تھا کہ وہ مقابلے کی کتابیں انہیں پڑھ کر سنائے اور اس طرح انہوں نے پورے پچیس دن صرف ہماری کتابوں کی تشخیص میں لگائے۔

مولوی عبدالحق نے سر سید کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ہم لوگوں کو فخر ہے کہ ہم نے ان کی آنکھیں دیکھیں۔ وہ ہمارے تہذیبی ماضی کے امانت دار تھے اور ان سے ہمیں ہر میدان میں بڑی تقویت ملتی تھی آج وہ ہمارے درمیان نہیں۔ لیکن ان کا کام ہمارے درمیان ہے، جسے ان کی بصیرت کی روشنی میں ہمیں مکمل کرنا ہے، وہ انفرادی طور پر بھی، اجتماعی طور پر بھی؛

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور

مولوی عبدالحق کی موت اگر ایک فرد کی موت ہوتی تو اتنا بڑا قومی حادثہ نہ ہوتا مگر بابائے اردو کی موت تو ایک ادارے کی موت ہے، ایک ایسے ادارے کی موت جو کم و بیش پچھتر برس تک شب و روز مصروف عمل رہا ہے۔

ایسا فرد صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے جو فرد ہوتے ہوئے بھی ایک ادارہ بن جاتا ہے اور مولوی عبدالحق ایک ایسے ہی فرد تھے۔

مولوی عبدالحق صرف ایک ادارہ ہی نہیں تھے اور بھی بہت کچھ تھے۔

وہ اس محفل کی آخری شمع تھے جو سر سید، شبلی اور حالی کی جلوہ سامانیوں سے مستفید ہو چکی تھی۔

وہ عملی تفسیر تھے اس وضعداری کی جو ہمارے بزرگوں نے ایک روایت کے طور پر چھوڑی تھی۔

اور پھر وہ عبارت تھے اس جذبۂ ایثار سے جو روز بروز اپنی قدر و قیمت سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس دنیا میں لوگ مذہب پر بھی قربان ہوتے رہے ہیں — قربان گاہ سیاست پر بھی جانوں کے نذرانے پیش ہوتے رہے ہیں — اور ہر دور میں ایسے لوگ بھی موجود رہے ہیں جو وطن کی خاطر مٹتے رہے ہیں۔ مگر اپنی ساری زندگی کو صرف ایک زبان کے لئے وقف کر دینا ایک ایسا واقعہ ہے جس سے ایثار پیشگی کی تاریخ بہت کم آشنا رہی ہے۔

مولوی عبدالحق کا دوسرا نام اردو ہی ہے — اردو کی زندگی، اردو کی ترقی اور اردو کے فروغ کے لئے اپنا سب کچھ تج دینا — کوئی معمولی بات نہیں ہے — ایک ایسی بات ہے جو مولوی صاحب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے۔

مولوی صاحب کی کس کس خوبی کو گنوایا جائے — وہ مجسم ایثار تو تھے ہی۔ اس کے علاوہ جرأت و دلیری میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ صداقت شعاری اور راست گوئی کی خاطر مرحوم برصغیر کی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی ٹکرا گئے اور ان کے قدموں میں ذرہ برابر بھی لرزش نہ ہوئی۔

اصول کی شکست کو تو وہ اپنی زندگی کی شکست سمجھتے تھے اور ان کی زندگی پر شکست نے سایہ تک بھی نہ ڈالا تھا۔

بڑے بوڑھوں کی طرح اپنے خول میں بند ہونا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ ہر قدم پر انہوں نے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا تھا۔ ادب کی ترقی پسند تحریک اٹھی تو انہوں نے لبیک کہا۔ گلڈ معرض وجود میں آئی تو وہ اس کے بھی بنیادی رکن بن گئے۔

مولوی عبدالحق بہر صورت ایک انسان تھے۔ اور ہر انسان آخر کار فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے — مگر اردو جس کا دوسرا نام عبدالحق بھی ہے آج بھی زندہ ہے — اور زندہ رہے گی ÷ (ستمبر ۶۱ء)

ماہنامہ "الشجاع" کراچی

آنکھیں نمناک ہیں۔ دل سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اور قلم یہ لکھتے ہوئے کانپ رہا ہے، کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

اور — ۱۶ اگست کو علم و ادب کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ایک دور ختم ہو گیا — سرسید کے عہد کی آخری شمع بجھ گئی۔ بیسویں صدی کی وہ عظیم شخصیت رخصت ہو گئی جس نے اردو کی تہذیبی و لسانی حیثیت کو نمایاں کیا اور جس نے اردو کو نئی زندگی دی۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی دائمی مفارقت قوم کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ محقق، صاحب طرز انشا پرداز، اور ماہر لسانیات تھے، بلکہ کردار و عمل کے اعتبار سے ایک ایسی شخصیت تھے جو کسی قوم میں صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر یہ اولوالعزم انسان اردو کے بقا و تحفظ کے لئے پچاس سال تک ہر ہر مورچے پر اردو کے دشمنوں سے جنگ نہ کرتا تو آج اردو کی حیثیت کسی علاقائی زبان سے زیادہ نہ ہوتی اور ہماری یہ تہذیب و ثقافت تباہ ہو جاتی جس کے تحفظ کے لئے ملت اسلامیہ ہند نے قیام پاکستان کی ضرورت محسوس کی تھی — بابائے اردو کی پوری زندگی ایک درویش کی طرح گذری، ان کو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلہ کی پروا۔

ان کے کردار کی سب سے بڑی خوبی ان کی اصول پرستی تھی۔ وہ اردو کی ترویج و بقا کے لئے زندگی کے آخری سانس تک ایک مرد مجاہد کی طرح ڈٹے رہے اغیار کے طعنے، اپنوں کی مخالفت، عسرت، پریشانی اقتصادی بدحالی اور زندگی کے دوسرے صبر آزما اور حوصلہ شکن مراحل سے ان کو گزرنا پڑا۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی۔ اور وہ ان سب سے بے نیاز ہو کر اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف رہے اور انہیں دنیا کی کوئی طاقت اپنے اصولوں سے منحرف نہ کر سکی اور بالآخر اردو کی ترقی و بقا کے لئے انہوں نے اپنی جان قربان کر دی۔

بابائے اردو آج جسمانی طور پر ہم سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن جب تک اردو زبان زندہ ہے وہ زندہ رہیں گے کیونکہ عبدالحق اور اردو ادب ہم معنی الفاظ ہیں

اس عہد آفریں شخصیت کی جدائی نے ہماری ذمہ داریوں میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں

بابائے اردو کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ افسوس کہ یہ خواہش ان کی زندگی میں شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی، اس لئے اب یہ قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے محسن کی اس خواہش کا احترام کرے۔ (ستمبر ۶۱ء)

زندہ قومیں اپنے محسنین کی خواہشات کی تکمیل ان کی زندگی ہی میں کرتی ہیں۔ اگر ہم نے مرنے کے بعد بھی اپنے محسن کی اس خواہش کو پورا نہ کرسکے تو یہ نہ صرف ہماری بدنصیبی بلکہ ایک قومی المیہ ہوگا ؛ (ستمبر ۱۹۶۱ء)

روزنامہ "امروز" لاہور

بابائے اردو رحلت فرما گئے۔ اردو زبان ایک بے بدل مربی اور عظیم محسن سے محروم ہوگئی مولوی عبدالحق پیرانہ سالی میں بھی اردو کی خدمت سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہ ہوئے۔ بستر مرگ پر پڑے تھے۔ زندہ رہنے کی امید نہ رہی تھی لیکن اس عالم میں بھی دل اردو ہی میں اٹکا تھا۔ اردو ان کا اوڑھنا اور بچھونا بن گئی تھی۔ اردو ان کی زندگی کا محور تھی۔ اردو میں انہوں نے زندگی کی تمام رعنائیاں تمام خوبیاں۔ تمام حسن اور تمام لطافت سمودی اور پھر قریباً ایک صدی تک اسی جان محبوب کو اپنی تمام تر توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ اردو کا ستارہ گردش میں تھا۔ جب مولوی صاحب نے اسے سہارا دیا۔ اور آج جب وہ رخصت ہوئے ہیں، تو وہ کروڑوں لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ اسے آج ایک بہت بڑے ملک کی قومی زبان ہونے کا افتخار حاصل ہے۔

مولوی صاحب نے برصغیر میں انجمن ترقی اردو کے توسط سے اردو کو جو استحکام بخشا، فرقہ پرستوں، اور اردو کے کٹر مخالفوں کے سامنے جس پامردی، اور استقلال کا اظہار کیا۔ کسی زبان کی تاریخ اس کا جواب پیش نہیں کرسکتی۔ انہوں نے اپنی ہی یگانہ طرز نگارشات سے دامن اردو کو مزین نہ کیا، بلکہ مختلف علوم سے متعلق نہایت بیش قیمت کتابیں ہزاروں کی تعداد میں اردو میں منتقل کرائیں۔ یہ انجمن جب مولوی صاحب کی تحویل میں آئی بس نام کی انجمن تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کام نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی اغیار نے راہ میں لاکھ رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن مولوی صاحب کی قیادت میں یہ انجمن اپنی رفیع الشان منزل کی طرف ثابت قدمی سے رواں رہی۔

پاکستان قائم ہوا تو بوڑھے محقق ایک نیا ولولہ اور ایک نیا حوصلے کر اس نئے وطن میں آیا۔ اس شیدائے اردو نے یہاں اردو کو قومی زبان کا درجہ دلانے اور اسے کو یہاں کے کاروبار حیات کا جیتا جاگتا اور فعال جزو بنانے کے لئے ان تھک کوشش کی۔ اردو کالج قائم کیا۔ اردو یونیورسٹی بنانے کے لئے ایک منصوبہ مرتب کیا۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ منظم کیا۔ غرض وہ سب کچھ کیا جو کسی زبان کی ترقی اور توسیع کے لئے ضروری ہوتا ہے مولوی صاحب نے سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ حالی نذیر احمد، شبلی اور آزاد کی صحبتوں سے فیض اٹھایا تھا وہ اسی عہد کے نمائندے تھے۔ وہ اس دور کی وضعداری کے امین تھے۔ لیکن ان کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہی۔ وہ اپنے ماضی پر بھی نازاں تھے اور مستقبل کے بارے

میں بھی پر امید تھے ۔ وہ وسیع النظر اور وسیع المشرب بزرگ تھے ۔ انہوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا ، اور اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے وہ کچھ کیا، جو اٹل ارادوں اور مصمم عزائم کے حامل انسان ہی کر پاتے ہیں وہ ان لوگوں میں سے تھے ۔ مصلحتیں جن کو راہِ طلب پر قدم بڑھانے سے نہیں روکتیں ۔ جو کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتے ، اور ہر سنگِ راہ ان کے عزم کے لئے تازیانہ ہوتا ہے اور ہمت کو مہمیز کرتا ہے ۔ مولوی صاحب پیکر عمل تھے ۔ ایسی عمر میں کہ قوا مضمحل ہو جاتے ہیں ، اور فکر و نظر کی صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہیں ۔ وہ اپنے بے پناہ قوت ارادی کے سہارے دم واپسیں تک سرگرم عمل رہے ۔

اس بطلِ جلیل کی رحلت سے ہماری قومی زندگی میں جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ پُر ہوتا نظر نہیں آتا لیکن وہ ہمارے سوچنے سمجھنے اور عمل کے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں ، اگر ان کے مشن کی اہمیت سے ہم آگاہ ہیں تو اس کی تکمیل کے لئے اسی جوش اور ولولے سے کام لینا چاہئے ، جو مولوی صاحب سے خاص تھا ۔ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کی یاد کو زندہ رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اردو کو جو ہماری قومی زبان ہے ، اپنی زندگی کا فعال حصہ بنا لیں ۔ اس کی سرفرازی کے لئے وہ سب کچھ کریں ، جو خود نگر اور خود شناس قومیں اپنی زبانوں کے نکھارنے اور سنوارنے کے لئے کرتی ہیں ، اردو آج ایک مکمل زبان ہے ۔ وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اظہار و ابلاغ کا مکمل ذریعہ بن سکتی ہے ہم اسے عملاً یہ درجہ دے کر ہی یہ ثابت کر سکتے ہیں ، کہ ہم تاجدار اقلیم اردو کی عظمت اور اس کے نصب العین کی رفعت کے قائل ہیں ۔ (۱۰ اگست ۱۹۶۱ء)

روزنامہ "جنگ" کراچی

بابائے اردو علامہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق انتقال کر گئے ۔ اناللہ و انا الیہ راجعون

ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہو گیا ۔ قومی زندگی میں بہت بڑا خلاء پیدا ہو گیا ۔ بابائے اردو کے انتقال سے اردو یتیم ہو گئی ۔ وہ تہذیب بے سہارا ہو گئی جس کی امین اردو زبان ہے ۔ علامہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایک دور تھے ، ایک عہد تھے ۔ اس قوم کی قدیم مگر عظیم تاریخ سے سلسلہ ملانے والی آخری کڑی ٹوٹ گئی مولوی عبدالحق کا ماتم در اصل ایک پورے دور ، سر سید کے عہد سے اب تک کی عظیم تاریخ کا ماتم ہے ۔ اب سے ٹھیک نصف صدی پہلے بابائے اردو نے انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ کا عہدہ سنبھالا تھا ۔ انہوں نے پچاس سال کی اس مدت میں اردو زبان کو جو اس برصغیر کے کروڑوں انسانوں کی تہذیبی کوششوں کی یادگار ہے ۔ دنیا کی بڑی زبانوں میں شامل کرنے کے لئے جو کچھ کیا وہ اردو کی ساری تاریخ میں کسی بھی ایک شخص سے ممکن نہ ہو سکا تھا ۔ آج جب کہ بابائے اردو اس قوم میں نہیں ہیں تو کون ہے جو

اردو کی حالت پر تڑپے گا، کس کو خیال ہوگا کہ اردو کے لئے کون سی بات مضر کون سی بات مفید ہے۔ عبدالحق نے اپنی پوری زندگی اردو کے لئے وقف کر دی تھی۔ ان کے لئے زندہ رہنے کا صرف ایک ہی سہارا تھا جو اردو تھی۔ اردو کے ادیب تو بہت سے ہیں مگر کون ہے اس قوم میں جو صرف اردو کے لئے زندہ رہتا ہو اور جس نے اردو کی ترقی کی مہم میں اپنی جان دی ہو۔ حقیقت یہ ہے صدر انجمن ترقی اردو کی وفات سے اس قوم کی زبان اور تہذیب کی تاریخ میں ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جسے کبھی پُر نہ کیا جا سکے گا۔ ہر نامور شخص کی موت کو قومی سانحہ قرار دیا جاتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ بابائے اردو کی وفات ہی صحیح معنی میں ایک قومی سانحہ ہے یہ ایک فرد کا ماتم بھی ہے اور ایک عہد کا ماتم بھی ان کے ساتھ الا یک ایک پوری تاریخ مر گئی، وہ کیا مرے کہ ایک پورے عہد نے دم توڑ دیا۔ بابائے اردو آخری وقت تک اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے اور اسی کوشش میں ان کی صحت جواب دے گئی تا آنکہ آج وہ شخص ہم میں نہیں جس کی زندگی کا سب سے بڑا ارمان یہ تھا کہ وہ اردو یونیورسٹی قائم کر دے اور اردو زبان کے مستقبل کو محفوظ بنا دے ۔ خدا سکون مہیا کرے اس شخص کی روح کو جس نے اپنی ساری زندگی ایک مقدس کاز کے لئے قربان کر دی اور جس کی سب سے بڑی تمنا آخری وقت تک پوری نہ ہو سکی۔ بابائے اردو کی ذات بجائے خود مشن تھی۔ وہ ایک مشن کے لئے زندہ تھے ۔ اب اس مشن کو کون زندہ رکھے گا۔ موت کے وقت تو سارے عزائم ظاہر کئے جاتے ہیں، مرنے والوں کی یاد منانے والے بڑے بڑے عہد کرتے ہیں لیکن کون ہے جو اس عہد کو پورا کرے گا۔ کسے فرصت ہے کہ وہ اپنے مادی مقاصد کو بھلا کر اپنی زندگی اردو کے کاز کے لئے تج دے۔ آج جب ڈاکٹر عبدالحق ہم میں نہیں ہیں تو کوئی نظر نہیں آتا جو دنیا کی لذات کو تج کر اپنی زندگی اردو کے کاز کے لئے وقف کر دے جو بدقسمتی سے اب ایک نامقبول کاز کچھ زیادہ پسندیدہ نعرہ نہیں رہا۔ بابائے اردو کی موت پر بہت سے روئیں گے، جلسے ہوں گے، قراردادیں پاس ہوں گی، لیکن سوال یہ ہے اب کون اردو یونی ورسٹی بنائے گا۔ اب کس کو فرصت ہے کہ وہ اردو کے لئے تڑپے۔ واقعی اردو آج یتیم ہو گئی وہ شخص مر گیا، جو اس زبان کا آخری سہارا تھا۔ صدر انجمن ترقی اردو نے اردو کی جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف سب نے کیا ہے لیکن اب کہ وہ اس قوم میں موجود نہیں ہیں تو یہ اندازہ لگانا ممکن ہو سکے گا کہ اس قوم کو کتنا بڑا تہذیبی نقصان پہنچ گیا ہے۔ کتنی بڑی قوت اس ملت کے درمیان سے اٹھ گئی ہے۔ ایک بھیانک خلا ہے جو پوری قومی زندگی میں نظر آتا ہے۔ کاش بابائے اردو کی اس غم انگیز انتہائی الم ناک وفات کا اثر یہ ہو کہ اس مشن کو زیادہ زور اور زیادہ شدت کے ساتھ چلایا جا سکے، جو مرنے والے کو سب سے زیادہ عزیز تھا۔ کیا وہ لوگ جو بابائے اردو کے حادثۂ ارتحال کا غم منائیں گے اور یہ پوری قوم اس غم میں شریک ہے اب اس ذمہ داری کو محسوس کریں گے جو ان پر اس حادثہ کے بعد آ پڑی ہے ۔ بابائے اردو نے اپنی یادگار

کے طور پر بہت سے ادارے چھوڑے ہیں۔ انہوں نے بہت سی تحریکیں ورثہ میں اس قوم کو دی ہیں۔ ان تحریکوں کو زندہ رکھنا خاص طور پر اردو یونیورسٹی کو بنانا ہمارا قومی فریضہ ہے جس سے ہمیں عہدہ برآ ہونا چاہئے۔ کیا ہم بابائے اردو کی اس یادگار زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے اور اس شخصیت کے کارناموں کو زندہ رکھیں گے جس نے اپنی پوری عمر اس قوم کی تہذیب اور زبان کو بچانے میں صرف کردی اور جس کی وفات سے یہ ساری محفل سونی ہوگئی ہے۔ حق مغفرت کرے اس پاک روح کی جس نے بے غرض خدمت کرکے اس قوم کے عظیم سرمایوں کو بچانے کی تاریخی جدوجہد کی تھی اور توفیق صبر عطا کرے اس قوم کو جسے ایک عظیم شخصیت کی وفات سے ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا ہے۔

(۱۸ اگست ۶۱ء)

روزنامہ انجام کراچی

افسوس ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تقریباً ۹۲ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی وفات سے سرسید احمد خاں مرحوم کے دور کو ہمارے موجودہ دور سے ملانے والی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب مرحوم ان معدودے چند مشاہیر میں تھے جو زندگی کے مختلف کوچوں کی خاک چھاننے کی بجائے اپنے لئے صرف ایک شاہراہ متعین کرتے ہیں اور پھر آخری سانس تک اس شاہراہ پر اس قدر انہماک و استقامت کے ساتھ گامزن رہتے ہیں کہ راستے کی کوئی رنگینی و جلوہ سامانی دل کشی بن کر ان کے دامن کو نہیں لگا سکتی اور متعینہ سمت منزل سے ہٹا نہیں سکتی۔ آج سے ۷۰ سال پیشتر ۱۸۹۴ء میں مدرسۃ العلوم (علی گڑھ) (موجودہ مسلم یونیورسٹی) سے ڈگری لینے کے بعد ان کی نئی زندگی کا آغاز مدرسہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ہوا اور گل کدۂ علم کی عطر بیز کلیوں سے ان کا دل و دماغ کچھ اس طرح متاثر ہوا کہ زندگی کے دوسرے کوچوں کی ہما انگیزیاں ان کے لئے بے کیف ثابت ہوئیں اور مولوی صاحب نے سیاست و مذہب کی کرشمہ خیزیوں سے دامن بچا کر اپنی زندگی کا ہر سانس مشاہد علم و ادب کی زلفیں سنوارنے کے لئے وقف کردیا۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب مرحوم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے، اس طرح صرف یہی نہیں کہ ملک میں مولوی عبدالحق صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا۔ بلکہ ان کی منزل مقصود متعین ہوگئی اور انہیں علمی خدمات کے لئے بہت وسیع میدان مل گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد شعبۂ مذکور نے انجمن ترقی اردو کے نام سے ایک مستقل با اختیار ادارے کی شکل اختیار کرلی اور مولوی عبدالحق مرحوم کی زندگی کا ہر سانس اس کی خدمت کے لئے اس طرح وقف ہوا کہ انجمن ترقی اردو کی تاریخ دراصل مولوی عبدالحق مرحوم کی داستانِ حیات ہے۔ حیدرآباد دکن کے زمانۂ قیام میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے جو گہری دلچسپی ظاہر کی اور اس کے بعد برصغیر ہند و پاکستان میں اس پہلی اردو یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں

رکن رکین کی حیثیت سے زبان اردو کی جو بیش بہا خدمات
انجام دیں وہ کبھی فراموش نہ کی جا سکیں گی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی
میں تعلیم کے لئے مولوی صاحب موصوف کی زیر نگرانی مختلف
علوم و فنون پر بیسیوں بلند پایہ کتابیں زبان اردو میں تصنیف
کی گئیں یا مغربی زبانوں سے ان کا ترجمہ کیا گیا۔ مشہور کتاب
اصطلاحات علمیہ، جس میں نباتات، ارضیات، سیاسیات
الٰہیات، ہیئت، ریاضی اور آئین و دستور وغیرہ کی کئی
ہزار اصطلاحوں کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے اسی عہد کی مفید یادگار
ہے۔ بابائے اردو مولوی صاحب مرحوم جب تک اورنگ آباد
کالج کے پرنسپل یا دار الترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے انچارج یا
سہ ماہی رسالہ اردو کے مدیر کی حیثیت سے ریاست حیدرآباد
میں مقیم رہے انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر بھی ان کے ساتھ
دکن میں رہا۔ بعد میں جب انہوں نے دولت آصفیہ کو
خیرباد کہکر ہندوستان کا رخ کیا تو انجمن ترقی اردو کا دفتر
بھی ان کے ساتھ منتقل ہو کر نئی دہلی پہنچ گیا۔ ۱۹۳۶ء
سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے درمیانی عرصے میں بابائے
اردو نے ہندو لیڈروں کی جارحانہ فرقہ پرستی اور شرمناک
لسانی تعصب کے علی الرغم جس ہمت مردانہ کے ساتھ اردو
کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کا فرض انجام دیا اس
کی داد نہ دینا بے انصافی ہے۔ اس زمانے میں بابائے اردو
نے برعظیم کے طویل و مسلسل دورے کئے اور خاص کر جنوبی ہند
کے دور افتادہ علاقوں میں جہاں کہ اردو کا رواج نسبتاً
کم ہے۔ انجمن ترقی اردو کی متعدد شاخیں قائم کیں۔ تقسیم کے بعد
جب کہ درندگی و حیوانیت کے مسلح بھارتی بیچار لیڈروں نے فوج

اور پولیس کی شہ سے ہندوستان کو مسلمانوں کے لئے
دوسرا اسپین بنانے کے پرانے بھیانک خواب کی تعبیر حاصل
کرنے کی خاطر بہت وسیع پیمانے پر مجبور و مقہور مسلمانوں
کے خلاف قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور اکثر
کے وحشیانہ مظالم سے خاص دار الحکومت دہلی میں پنڈت
جواہر لال نہرو اور ان کے ارکان حکومت کی نگاہوں کے سامنے
کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شہید اور چار لاکھ جلاوطن ہوئے
تو بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کو بھی تباہ حال مسلمانوں
کے لٹے ہوئے قافلوں کے ساتھ جادۂ ہجرت پر گامزن ہونا
پڑا اور وہ اپنی ساری عمر کا بیش قیمت علمی اندوختہ دست
صفت اغیار کی بھینٹ چڑھا کر دہلی سے کراچی تشریف لائے
عمر کے آخری دور میں اپنی علمی سرگرمیوں کے بہترین
مراکز ہندوستان اور حیدرآباد سے مستقل مفارقت، ملی
کی ادبی محفلوں کی تاراجی، پرانے دوستوں کی جدائی اور
سب سے بڑھ کر دریا گنج دہلی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر
اور بیش قیمت کتب خانے کی تباہی جسے بابائے اردو نے
محنت شدید و سعی بلیغ سے جمع کیا تھا ایسے صدمات تھے
جنہیں بہ آسانی برداشت کیا جا سکتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بابائے
اردو نے یہ روح فرسا صدمات و مصائب حیرت انگیز ہمت
و استقامت سے برداشت کئے اور صرف برداشت ہی نہیں
کئے بلکہ تلافیٔ مافات کی زبردست کوشش بھی کی۔ انہوں نے
پاکستان میں صرف یہی نہیں کہ زبان اردو کے استحکام و
ترقی کا کام از سر نو پورے جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا
اور اس سلسلہ میں معیاری اخبارات و رسائل جاری کئے

بلکہ اردو کالج کے نام سے ایک ایسی عظیم الشان درس گاہ بھی قائم کر دی جہاں ایم۔ اے تک تمام مضامین کی تعلیم زبان اردو میں دی جاتی ہے اور اس کے معیار کے پیش نظر حکومت نے اسے باضابطہ طور پر تسلیم بھی کر لیا ہے بابائے اردو کی زندگی کی اب سب سے بڑی اور آخری خواہش یہی تھی کہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی طرز پر کراچی میں ایک عظیم الشان اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے اور اس کے لئے انہوں نے کمزور صحت اور ضعیفی کے باوجود زبردست جدوجہد شروع کر دی تھی لیکن افسوس ہے کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور اس بارگاہ سے ان کی حاضری کے لئے فرمان صادر ہو گیا جہاں ایک دن ہم سب کو جانا ہے۔

بابائے اردو بہ تقاضائے عمر اور اردو کی خدمات کے سلسلہ میں دن رات کی محنت شاقہ سے کمزور تو بہت ہو چکے تھے لیکن ان کی ہمت و بلند حوصلگی میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا وہ اردو کی حفاظت و حمایت کے لئے اسی طرح کمربستہ تھے۔ ثقل سماعت کی شکایت پیدا ہو گئی تھی، مگر صبح سے رات تک مشتاقان زیارت اور اردو دوستوں کا ہجوم رہتا تھا۔ علی الصباح خواہ کسی دوست یا مداح کے سہارے ہی اردو کالج سے برنس گارڈن تک چہل قدمی کے لئے ضرور جاتے تھے۔ گزشتہ چار ماہ سے طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی تھی اور وہ رہتی کہ انہیں علاج کی غرض سے جناح اسپتال کراچی میں داخل کر دیا گیا۔ سرطان جگر کی شدید تکلیف کے باوجود بابائے اردو کی بشاشت بذلہ سنجی، معمولات کی پابندی اور سب سے بڑھ کر محنت پسندی کا وہی عالم تھا۔ ڈاکٹروں کو ان کی تکلیف کا صحیح اندازہ بھی نہ ہوتا تھا اور عام طور پر یہی یقین کیا جاتا تھا کہ وہ ہفتہ عشرے میں صحت یاب ہو کر اسپتال سے واپس آ جائیں گے لیکن افسوس ہے کہ ان کی حالت بگڑتی گئی صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے علم و فن کے ایک سچے قدر شناس کی حیثیت سے بابائے اردو کے علاج کی نگرانی خود اپنے ذمے لی اور وہ صدر پاکستان کے مہمان کی حیثیت سے ۱۴ جون کو جناح اسپتال کراچی سے مری کے کمبائنڈ ملٹری اسپتال منتقل کر دئے گئے جہاں صدر پاکستان کے معالج خاص ان کی دیکھ بھال کرتے تھے لیکن افسوس ہے کہ بہترین علاج سے بھی بابائے اردو کی حالت افاقہ پذیر نہ ہوئی۔ بابائے اردو اصرار کر کے چند روز بیشتر مری سے کراچی واپس آ گئے، واپس کیا آئے یوں سمجھئے کہ خاک گور نے کشش کی اور وہ صدر پاکستان کی خواہش کے مطابق مری کے اسپتال میں قیام پذیر نہ رہ سکے۔ کراچی واپس آنے پر صدر پاکستان کے مہمان کی حیثیت سے ہی اسپتال میں ان کا علاج شروع ہوا لیکن حالت روز بروز بگڑتی گئی اور ڈاکٹروں نے سرطان جگر کو لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ افسوس ہے کہ صدر پاکستان کی ہمدردیاں ملک کے مشہور ڈاکٹروں کی بہترین چارہ جوئیاں اور قوم کی پرخلوص دعائیں بابائے اردو کو موت کے ہاتھوں سے نہ بچا سکیں اور زبان اردو کے اس محسن عظیم نے بارگاہ رب العزت میں زندگی کا نذرانہ پیش کر کے دنیا کے تمام مکروہات اور بیماری کے شدائد سے نجات حاصل کر لی،

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بابائے اردو کی وفات ایک ایسا زبردست قومی سانحہ ہے جس کی تلافی بہت مشکل سے کی جا سکے گی بابائے اردو اپنی ذات سے ایک مکمل تاریخ تھے۔ افسوس ہے کہ دنیا سے وہ ہستی اٹھ گئی جس نے سر سید اور نواب محسن الملک کے زیر دامن تربیت پائی تھی اور جو علی گڑھ کے طلبائے قدیم میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی، خادم کعبہ مولانا شوکت علی سید الاحرار مولانا حسرت موہانی اور بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان سے زیادہ سینئر تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ زبان اردو کو ڈاکٹر مولوی عبد الحق جیسا عاشق جانباز مشکل سے دستیاب ہو سکے گا۔ ہم بابائے اردو کے سانحۂ ارتحال پر جو درحقیقت ایک زبردست قومی سانحہ ہے، تہہ دل سے متاسف ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، زندگی کے آخری دور میں مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے کاش ہم سب کو بابائے اردو کی یہ آخری خواہش پوری کرنے کی توفیق نصیب ہو۔ (۱۸ اگست ۱۹۶۱ء)

روزنامہ "نئی روشنی" کراچی

اس عالم فانی میں جو آتا ہے اسے ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہی ہے کتنے پیغمبر، ولی، رشی، منی شہنشاہ، بادشاہ، امیر، فقیر، وزیر، لیڈر آئے اور چلے گئے کتنے عالم، فاضل، فلسفی، منطقی، سائنس دان، محقق آئے اور اپنے علم و فضل کا ڈنکا بجا کر رخصت ہوئے غرضیکہ اس کارگہ حیات کی ہر شے فانی ہے اور اگر دیکھا جائے تو اسی فنا میں بقا کا راز پنہاں ہے، اپنے اعمال اور کردار کی یادگاریہاں نقش غیر فانی بن جاتی ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے ———؟

بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم و مغفور جن کا انتقال کل ۹۲ برس کی عمر میں کراچی میں ہوا۔ انہی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی فنا میں بقا کا راز مضمر ہے گو مولوی صاحب موصوف داغ جگر دے کر رخصت ہوئے، ایسا داغ جگر جس کا اندمال برسوں بلکہ صدیوں مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولوی صاحب کی ذات جن قومی کارناموں کا پیکر تھی وہ کارنامے ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گے اور اس لحاظ سے مولوی عبد الحق صاحب مرحوم و مغفور کا شمار ان ہستیوں میں رہے گا جو ان ظاہر بین آنکھوں سے پردہ کر جاتی ہیں لیکن درحقیقت ابدی زندگی انہی کا حق ہوتا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب نے زندگی کی ۹۲ بہاریں دیکھیں، یہ بہاریں کسی عیش و نشاط زندگی کی بہاریں نہ تھیں، بلکہ قومی خدمت اور جذبۂ وطنیت کی بہاریں تھیں۔ انہوں نے ہاپڑ ضلع بلند شہر کے ایک اونچے گھرانے میں جنم لیا لیکن ان کی متحرک زندگی برصغیر میں نشان اتحاد کے لئے متحرک رہی، اور آخر میں مقصد کے لئے اپنے اسلوب پر انہوں نے جنگ کی تھی اسی کی خاطر انہوں نے وقت آیا تو ہجرت بھی کی، اور مقصد حیات کے سب سے بڑے گہوارے پاکستان کو اپنا وطن قرار

دیا۔ اسی کی آغوش میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو خواب استراحت ہوگئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

بابائے اردو کا مقصدِ حیات کیا تھا ــــــــ؟

وہ برصغیر میں لسانی اتحاد کے حامی تھے جس اتحاد کی بنیاد خسرو۔ جامی اور ولی نے ڈالی تھی۔ اور جس کا نام زمانے کے گرم و سرد اور ادب کے پیچ در پیچ منقلب ہونے کے ساتھ اردو قرار پایا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اسی زبانِ شیریں و دلکش کی خدمت اپنا شعار قومی تجویز کیا جس میں ایک عظیم سیاسی۔ عمرانی مصلحت بھی پنہاں تھی۔ جس کے تذکرے و تشریح کا یہ موقع نہیں ــــــــ ان کا سب سے بڑا مقصد جس کی جانب ہم سطورِ بالا میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہی "لسانی اتحاد" تھا، جو برصغیر کے مختلف الخیال و عقاید و رسوم و رواج کے پابند اجزائے پریشاں کو "ایک سطح" اور ایک عظیم برادری میں منسلک کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اس مقصد کے لئے اپنی "قربانی" پیش کی اور تمام املاک و جائداد انجمن ترقی اردو" کی قائم کردہ جماعت، جس کے وہ بانی تھے، اس کی تحویل میں دے دی۔ اور اس مقصدِ اردو کے لئے فقیری لے کر میدان میں آگئے۔ ان سطورِ مختصر میں ان کے اور انجمن کے کارنامے نہیں بیان کئے جاسکتے ان کی زندگی اور انجمن کے ادبی کارناموں کی جس میں بڑی گرانقدر تصانیف اور دیگر زبانوں کے علوم و فنون کے ذخائر کا اردو میں منتقل کیا جانا شامل ہے۔ اگر فہرست و تفصیل مرتب کی جائے تو دفتر کے دفتر بن جائیں لیکن ان کا ایک ہی کارنامہ جو وضع اصطلاحات سے متعلق ہے ایسا ہے کہ جس میں انگریزی داں طبقہ کے ان تمام دلائل کو لاطائل ثابت کر دیا، جو کہتے ہیں کہ اردو کا دامن حسین انگریزی علوم حاضرہ کی اصطلاحی و فنی وسعتوں کے تذکار میں اظہارِ مفہوم کے لئے تنگ تھا۔ اور متبادل الفاظ پیش کرنے میں قاصر ہے۔ مگر جو ڈکشنری انہوں نے مرتب کی وہ اس کا دندان شکن جواب ہے۔

سیاسی میدان سے گو بظاہر ان کا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن مولوی صاحب کی خدمت کے اس انوکھے رنگ سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ جب ہندو مہاسبھا، اور کھدر پوش، مہاسبھائی، کانگریسیوں نے، لسانی اتحاد کی شکست میں ہندو راج کی راہیں استوار کرنا چاہیں تو یہ مولوی عبدالحق صاحب ہی تھے جو واردھا کی گاندھوی اسکیم اور ان کی قائم کردہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑے ہوگئے اور "اردو" کے جواب میں "ہندی ہندوستانی" کے گاندھوی لسانی فلسفہ کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ مسئلہ لسانیات برصغیر پر حق گاندھی "خط و کتابت" جن ذی علم لوگوں کی نظروں سے گزری ہوگی، وہ اس کی شہادت دیں گے کہ واردھا کے سحر سامری کا مولوی عبدالحق نے کس شان موسوی سے

تاریخ پورے دبکچر کر رکھ دیا تھا۔ اور پھر جب آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ سنسکرتی بھاشا "کی ہندی ہندوستانی" کا نام دے کر ترویج متعصب اکثریت نے شروع کرادی تھی، تو یہ بابائے اردو ہی تھے جو اس کے خلاف ایک برق صاعقہ پاش بن کر گرجے اور برسے۔ یہ سر سلطان احمد کا دور وزارت اطلاعات ونشریات تھا۔ اس دور کے واقف شہادت دیں گے کہ اگر مولوی عبدالحق میدان میں نہ آجاتے تو تقسیم برصغیر کے تقریباً چار برس قبل برصغیر کی زبان ـــــ "آئیچا ئے" کی زبان بن جاتی۔ اور نہ معلوم ہماری تحریک حریت پاکستان کس حد تک متاثر ہو جاتی۔ یہ بابائے اردو ہی تھے جنہوں نے قائد اعظم بانیٔ پاکستان اور مسلمانوں کی قومی جماعت کو "بنائے پاکستان" کی لسانی وجہ کی جانب متوجہ کیا تھا۔ اور بتایا تھا کہ مسلم لیگ کے مطالبات میں اگر "اردو" کی لسانی اہمیت کو شامل نہ کیا گیا تو پھر تحریک "کلمنٹے" کی ایک ایسی بات سے خالی رہ جائے گی جو مسلمانوں کی قومی اور مذہبی روایات سے نزدیکی تعلق بلکہ ان کے مذہب و کلچر کی محافظ و پشتی بان ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کے مطالبات میں اردو کی لسانی وحدت شامل کی گئی۔ جو لوگ تحریک حریت کے سپاہی رہ چکے ہیں اور اب تک بقید حیات ہیں اور ان کی تخیلات میں ابھی کسی قسم کا اضمحلال پیدا نہیں۔ وہ اس کا اعتراف کریں گے کہ تشکیل پاکستان میں اردو کی لسانی وحدت "بھی ایک حصہ تھی۔ اور تقسیم سے قبل کے نعروں میں یہ نعرہ بھی محصول مقصد "کا کارگر حربہ ثابت ہوا تھا۔ جب پاکستان بنا تو ظاہر ہے کہ "اردو" نے بھی ہجرت کی۔ بابائے اردو اپنے آغوش اور دل کی گہرائیوں میں "اردو" کا جذبہ اور محبت اور اسے قومی و ملکی زبان بنانے کا ولولہ لئے ہوئے پاکستان تشریف لائے اور یہاں آکر بھی جلد بے بضاعتیوں کے باوجود اس مرد حق کوش نے اردو کی خدمت اور لسانی وحدت کے فرض کی تکمیل کا آغاز کر دیا۔ بابائے اردو کی چودہ سالہ کاوشوں اور انتھک مساعی اور انہماک نے جو کچھ کھویا یا ان کی کوششیں "بعض گھرانوں اور سازشوں" کی شرمناک رکاوٹوں کے باوجود جس حد تک بار آور ہوئیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ اگر مرحوم قائد ملت لیاقت علی خان کی مانند سابقہ حکومتیں ان کی تھوڑی سی بھی ہمت افزائی اور ان کے مجاہدانہ کردار کی قدر دانی کرتیں۔ تو کوئی شبہ نہیں کہ ان کی دلی خواہش اردو یونی ورسٹی کا قیام ان کی زندگی ہی میں بار آور ہو سکتا تھا۔ لیکن جو کچھ ہوتا رہا اور جو رکاوٹیں عاید کی جاتی رہیں، جن مشکلات اور پریشانیوں کا انہیں سامنا کرنا پڑا، اس کے باوجود انہوں نے اردو کالج، انجمن اور اس کے ملحقہ ادارے قوم کے سپرد بطور امانت کئے اور قوم کے لئے اردو کی خدمت اور یونی ورسٹی کے قیام کی ایک عظیم وصیت کر کے حق کو پیارے ہو گئے تھے۔ خداوند کریم اس کی تکمیل کی ذمہ داران انتظام کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بے جا نہ ہوگا۔ اگر ہم یہاں بانیٔ انقلاب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی ان مجاہدانہ سرپرستانہ نوازشوں

کا تذکرہ نہ کریں جو انہوں نے قوم کے اس مایۂ ناز ہستی بابائے اردو کی پشت پناہی کے طور پر اس کی جان بچانے کے لئے کیں۔ ان کی قدردانی علم و فضل لائق صد ستائش ہیں کہ بابائے اردو کی علالت شدید کی خبر پاتے ہی بابائے اردو کے علاج معالجہ کی جملہ آسائشوں کا حکم دے دیا گیا۔ مرحوم کو مری بلایا گیا۔ اپنے معالج ذاتی سے علاج کرایا گیا۔ خود ان کی عیادت کو تشریف لے جاتے رہے اور پھر جب بابائے اردو کو آرام گاہ آخری کی کشش کراچی لائی تو یہاں اپنے معالج کی حیثیت سے ان کے علاج کی ہدایات دی گئیں اور ان کی جان عزیز بچانے کی ہر ممکن سعی کی گئی۔ یہ صدر ایوب کی قوم پروری قدردانی اور قوم کے نمایاں کرداروں کی عزت افزائی کا مظہر تھا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے موت کا علاج نہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب رحلت فرما گئے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کی موت ایک عظیم ہستی ہی کی موت نہیں بلکہ تاریخ لسانیات اور ایک بڑے دور کا خاتمہ ہے، مولوی صاحب کی رحلت ایک عظیم سانحۂ قومی ہے۔ تمام پاکستان میں رنج و ملال کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے۔ بھارت اور دیگر مقامات پر بھی اس محسن اردو کے معتقدین یقیناً ملول ہوں گے۔ کوئی شبہ نہیں کہ خلا ان کی جدائی سے پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا محال ہے۔ برسوں اور صدیوں میں ایسی اولوالعزم ہستیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن ہمیں صدر پاکستان کی ذات گرامی اور ان کی قدردانی علم و فنون سے پوری توقع ہے کہ مرحوم کی یادگاروں کے تحفظ ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور آخری خواہش اردو یونیورسٹی کے قیام کا اہتمام و انصرام صدر محترم کی توجہات خصوصی سے یقیناً پایۂ تکمیل کو پہنچ کر رہے گا۔ یہی مرحوم کی روح کے چین و سکون کا سبب ہو سکتا ہے، اور یہی قوم کی خواہش ہے۔ (۲۰ اگست ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ شمع کراچی

آج بابائے اردو موجود نہیں مگر ان کا مقصد حیات ہمارے سامنے ہے اگر ہم ان کی خدمات کا کوئی صلہ ان کی وفات کے بعد دینا چاہتے ہیں تو ان کے مسلک کو اپنا کر ہی دے سکتے ہیں انہوں نے اردو کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اردو ہی سے ان کی شادی ہوئی، اور اردو ہی ان کی اولاد تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس صدی میں اردو ادب یا کسی اور ادب کے لئے کسی ایک انسان نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا حصہ ایک ہی مسلک پر ختم نہیں کیا۔

اردو کے معاملے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے بڑی بڑی شخصیتوں سے ہمیشہ ٹکر لی اور حتی الامکان کامیابی حاصل کی۔ اس آخری دور میں بابائے اردو کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے اس کے لئے وہ اپنی صحت کا خیال نہ کرتے ہوئے بھی عملی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اب اگر ہم ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور ان خدمات کا کوئی بدل اتارنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اردو یونیورسٹی جلد از جلد قائم کرا دیں۔

توقع ہے کہ اب اردو پہلے سے زیادہ ترقی کرے گی کیونکہ پہلے ایک ہی شخص پر تمام ذمہ داری تھی اور اب پوری قوم پر لازم ہوگیا ہے کہ وہ ان کے مسلک کو اپنا کر اردو سے اپنی محبت کا اظہار کریں۔ خیال رہے آج اردو ہی ایسی مشرقی زبان ہے جس کا جاننے والا دنیا کے ہر خطے میں آپ کو مل جائے گا دوسرے یہی زبان ہمارے تمام قومی تقاضوں کی آئینہ دار ہے اگر ہم نے اس کی طرف سے لاپرواہی برتی تو یقیناً یہ ایک قومی سانحہ ہوگا۔

ہمیں خوشی ہے کہ کراچی کے کمشنر مسٹر ملک نے ان کے انتقال کے فوری بعد اس قومی خدمت میں سب سے بڑھ کر دلچسپی کا اظہار کیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اردو یونیورسٹی کے لئے زمین وغیرہ کا انتظام خود کرا دیں گے تاکہ یہ کام عملی صورت اختیار کرے۔ اس موقع پر پاکستان کے باحیثیت اور مخیر حضرات کا بھی فرض ہے کہ وہ عملی حصہ لے کر ملک و قوم سے دلچسپی کا اظہار کریں اور اسی عمل سے بابائے اردو کی روح کو بھی سکون میسر ہوگا۔ (اکتوبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "ہومیو ڈاکٹر" حیدرآباد

مولوی عبدالحق صاحب نے اردو کی سربلندی اور سرفرازی کا جو بیڑا اٹھایا تھا مرتے دم تک اس کو نبھایا۔ انہوں نے اردو کے لئے آخری دم تک جدوجہد کی انہیں اس کٹھن کام میں بہت دشواریاں پیش آئیں وہ پریشان ضرور ہوئے لیکن مایوس کبھی نہیں ہوئے وہ عزم واستقلال کے مجاہد تھے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ حصول مقصد کے لئے سرگرم عمل رہے ان کی ہمت ان کی جرات ان کا استقلال نوجوانوں کو بھی شرماتا رہا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اردو کے لئے جو کام کیا آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی۔

بابائے اردو کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم ان کے کام کو تکمیل تک پہنچا دیں۔

(اگست ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "عصمت" کراچی

۱۶ر اگست کو کراچی میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدیر رسالہ اردو، صدر انجمن ترقی اردو، بانی اردو کالج اور محرک و مجوز اردو یونیورسٹی کا انتقال اردو دنیا کے لئے سانحہ عظیم ہے۔

مولوی صاحب ان بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے سرسید۔ مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کی آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور اردو کے اس دور کی یادگار تھے جس نے ڈاکٹر سر اقبال، علامہ راشد الخیری، مولانا شرر۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا ظفر علی خان اور سر عبدالقادر پیدا کئے تھے۔ مولوی صاحب کا انتقال ۹۱ سال کی عمر میں ہوا۔ اتنی طویل عمر اردو کے بہت کم ادیبوں نے پائی ہے لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی ادیب نے اتنے عرصے تک اردو کی خدمت نہیں کی جتنی طویل مدت مولوی عبدالحق

مسلسل طور پیہم اردو کی ترقی اور اردو کی توسیع کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ وہ اردو کے صف اول کے تنقید نگار تھے انہوں نے سینکڑوں کتابوں پر مقدمات، دیباچے، تقریظیں لکھیں اور تبصرے کئے۔ سینکڑوں شگفتہ اور پر اثر طبع زاد مضامین لکھے جو اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے نہ صرف بہترین ادبی تصانیف بلکہ علمی کتابیں اور گراں قدر ترجمے شائع کئے۔ جن کی تعداد پانسو کے قریب پہنچتی ہے۔ اردو کے لئے انہوں نے غیر منقسم ہند کے طویل دورے کئے اور اردو کے مسئلہ پر برسوں کانگریس سے جنگ کرتے رہے۔ گاندھی جی کی مخالفت اردو کا انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ قائد اعظم نے بھرے مجمع میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو ہوگی مگر پاکستان میں اردو کی طرف سے غفلت برتی گئی اس کا دکھ مولوی صاحب مرحوم سے زیادہ کسی کو نہ تھا۔

مولوی صاحب کی بیوی تھی نہ بچے۔ ان کی ساری دلچسپیوں کا مرکز اردو ادب اور اردو زبان تھی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق اردو کے بڑے حامی بہت بڑے ساعی بہت بڑے محسن تھے ان کی رحلت نے ہر اس شخص کو تڑپا دیا جس کے دل میں اردو کی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے

ستمبر ۱۹۶۱ء

ہفتہ وار "لاہور" لاہور

قضا و قدر کی مہلک اداؤں کو اپنی سخت جانی کے بل پر مسلسل تین ماہ تک ٹالتے رہنے کے بعد ۱۶ اگست ۶۱ء کو بالآخر انجمن ترقی اردو کے مدار المہام مولوی عبدالحق داعی اجل کو لبیک کہہ کر مولائے حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

اور یوں اردو زبان اپنے ایک ان تھک خادم سرپرست بلکہ محسن کی خدمات و عنایات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ مولوی صاحب کی عمر اس وقت ۹۲ برس کی تھی اور ان کی صحت جگر کے سرطان کے باعث (جس کا حتمی علاج برصغیر پاک و ہند میں کہیں نہیں ہوتا) بہت ہی کمزور ہو چکی تھی۔ آخری ہفتوں میں خود صدر مملکت نے بھی التفات خصوصی فرما کر ان کے علاج کا اہتمام کیا لیکن افسوس کہ خدائی فیصلوں کے آگے انسانوں کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اردو کا یہ بوڑھا جوان ہمت سرپرست اسے داغ مفارقت دے ہی گیا اور اس کے یوں اوجھل ہو جانے سے دنیائے ادب اردو میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو شاید ہی پورا ہو سکے!

مولوی صاحب مرحوم و مغفور سرسید احمد خان کی صحبتوں سے فیضیافتہ تھے۔ اردو سے تو انہیں عشق تھا اردو ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور ان کی یہی ایک ادا ایسی تھی، جس کے باعث ان کے طریق کار سے اختلاف رکھنے والے بھی (اس اختلاف کے باوجود) دل سے ان کی قدر اور ان کی جدوجہد کا احترام کرتے تھے۔ اس بیماری سے چند ماہ قبل انہوں نے اردو یونیورسٹی کے لئے قوم سے اپیلوں کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ خرابی صحت کے باعث وہ اسے بھی مستعدی سے

نہ چلا سکے ——— ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ ہمیں کسی بڑے کی بڑائی اسی وقت سمجھ میں آیا کرتی ہے جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور مولوی عبدالحق کی شخصیت میں تو اس کے علاوہ بھی کتنی ہی بڑائیاں اور جاذبیتیں تھیں قوم ان کا ایک لمبے عرصے تک کے لئے سوگ کیوں نہ سوگ منائے گی۔ لیکن خالی خولی لفظی سوگ کا فائدہ؟ ———

کیا ہی اچھا ہو اگر مرحوم کی روح کو تسکین پہنچانے کے لئے اردو کے دلدادگان سب سے پہلے ان کے اس مشن کی تکمیل کے لئے کمر بستہ ہو جائیں جو ادھورا رہ گیا ہے اور جسے وہ اوّل خرابی صحت کے باعث اور پھر قضا و قدر کا بلاوا آجانے کے سبب اپنی زندگی میں پروان چڑھتا نہیں دیکھ سکے۔ (۲۱ راگست ۶۱ء)

ہفت روزہ "ایشیا" لاہور

مولوی عبدالحق جو بابائے اردو کے نام سے معروف تھے ۹۲ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

وہ سنہ ۱۸۷۰ء میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جبکہ ابھی مادر ملت بانجھ نہیں ہوئی تھی اور اس کی کوکھ سے مولانا ظفر علی خان۔ مولوی محمود علی بدایونی۔ عزیز مرزا لکھنوی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد جیسے ذہین اور باہل کمال لوگ پیدا ہونے تھے۔ مولوی صاحب ہاپوڑ کے مشہور قصبے کے قریب دجرار سے تعلق رکھتے تھے۔ علی گڑھ کے ایم۔ اے او کالج میں جاتے ہی ان کے جوہر کھلے اور وہ ریاضی اور فلسفے کے ممتاز طلبہ میں شمار ہونے لگے۔ لیکن ان کا اصل مقام اس وقت متعین ہوا جب وہ حیدرآباد دکن پہنچے اور گیسوئے اردو سنوارنے لگے یہاں انہوں نے اپنی زندگی کا مشن دریافت کیا اور وہ اردو زبان کو اس کا مقام دلانا تھا یہ وہ دور تھا کہ "مسئلہ اردو زبان" چھڑ چکا تھا۔ اردو کو وطنی زبان کی مسند سے اتارنے کی منظم کوشش شروع ہو چکی تھی اور ہندی ہندو قوم کے پرجوش عمل کارکنوں کے دوش ہمت پر سوار ہو کر ملک پر چھانے لگی تھی۔ مسلمانوں کی معروف بے ہمتی بے عملی اور تعلیم یافتہ طبقے کی خود غرضی نے صرف ملازمتوں کو مقصد زندگی بنا دیا تھا اور کوئی کام یکسوئی محنت اور ایثار کے ساتھ کرنے کا دستور نہیں تھا۔ ایسے نازک وقت میں مولوی عبدالحق مرحوم نے عام دستور کے خلاف اپنی زندگی اردو کی ترویج ترقی اور حمایت کے لئے وقف کی۔ انجمن ترقی اردو میں روح عمل دوڑائی۔ ملک میں اس کا نظام قائم کیا اور جب پاکستان بنا تو اپنے اس "فرزند عزیز" کو سینے سے لگائے کراچی آگئے۔ انہوں نے ساری زندگی تجرد میں گزاری ان کا "اہل و عیال" "انجمن اور اس کے مقاصد تھے اور اسی کو پروان چڑھانے میں انہوں نے ساری زندگی گزار دی۔

مولوی عبدالحق مرحوم کی زندگی ان لوگوں کے لئے نمونہ ہے جو محض حصول معاش کو مقصد زندگی بنانے کی بجائے قومی بہبود کے کسی مسئلے کو نصب العین بنا لیتے ہیں۔ ایثار اخلاص۔ لگن محنت شغف جو اس کام کے لئے مطلوب ہیں وہ

وہ مولوی صاحب میں موجود تھے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہوں نے جو کام اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس کے لیے صحیح جانشین عطا کرے (۲۲ اگست ۶۱ء)

ہفت روزہ "اقدام" لاہور

۱۶ اگست کو صبح آٹھ بجکر پچپن منٹ پر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اللہ کو پیارے ہو گئے ——— جب موت نے زندگی کے دروازے پر دستک دی تو ۹۳ سالہ ناتواں مریض کی آنکھوں میں پل بھر کے لئے شفق کے سے رنگ جھلملائے اور پھر تاریکی چھا گئی ——— پھول میں خوشبو اور چاند میں جوت باقی نہ رہی ——— مولوی عبدالحق بیسویں صدی کے قیس تھے۔ قیس نے لیلیٰ کی لگن میں اپنا گریبان چاک کر دیا اور جب وہ جنون کے عالم میں صحراؤں کی خاک چھانتا ہوا موت کی دہلیز پر گرا، تو اس کے ہونٹوں پر لیلیٰ ہی کا نام تھا ——— مولوی عبدالحق کا دامن بھی لیلائے اردو کی لگن میں ہمیشہ چاک ہی رہا اور وہ ایک مجنوں کی طرح عمر بھر اسی محبوب کے گیت گاتے رہے۔ اسی کی حمد و ثنا میں مصروف رہے اور جب فنا کا قاصد ان کے پاس موت کا پیغام لایا تو اس گھڑی بھی ان کے ہونٹوں پر اردو کا نام تھا ع

کیا دوانے نے موت پائی ہے

پاکستان میں جن لوگوں کی موت کا قومی پیمانے پر سوگ منایا گیا ہے مولوی عبدالحق کا نمبر ان میں تیسرا یا چوتھا ہے کوئی ملک اپنے کسی فرزند کو اس سے زیادہ عزت نہیں دے سکتا اور مولوی صاحب بھی بجا طور پر اس عزت کے مستحق تھے انہوں نے اپنی ساری زندگی اردو کی خدمت اور اس کی بقا کے لئے جدوجہد میں بتا دی۔ وہ عقیدے کی پختگی اور عقیدے کی شگفتگی دونوں کی عظمت کی ایک زندہ مثال تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اردو کی سربلندی اور بقا کی خاطر مولوی صاحب نے ہمیشہ چومکھی لڑائی لڑی۔ متحدہ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ اس لڑائی میں انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں قدم قدم پر انہیں مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اس لڑائی میں جو دفاعی مورچے قائم کئے وہ کئی بار تباہ و برباد ہو گئے، مگر مولوی صاحب نے ہمت نہ ہاری۔ اور وہ ایک سچے مجاہد کی طرح میدان میں ڈٹے رہے۔ ——— آج وہ ہم میں موجود نہیں مگر ہر کوئی انہیں انجمن ترقی اردو کی شکل میں دیکھ سکتا ہے، اردو کالج میں ان کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی ہے اور اردو یونیورسٹی کے منصوبے میں ان کی روح تمام تر حسن اور رعنائی کے ساتھ موجود ہے ———

پاکستان میں اردو یونیورسٹی کا قیام ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی ایک ایسی آرزو تھی جو ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی ——— ہمیں پوری توقع ہے کہ حکومت عوام کے تعاون سے مولوی صاحب کی اس آرزو کو جلد سے جلد پورا کرنے کی کوشش کرے گی۔ اردو کے اس سب سے بڑے خادم کی خدمات کا یہ سب سے بڑا اعتراف ہوگا۔ (۲۰/۸/۱۹۶۱ء)

ہفت روزہ "مصور" کراچی

کراچی ۱۶ر اگست بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق تقریباً تین ماہ کی خطرناک علالت کے بعد آج صبح ۸ بجکر ۴۰ منٹ پر سول اسپتال میں ۹۲ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

بابائے اردو کو ان کی خواہش کے مطابق آج شام تقریباً سات بجے اردو کالج کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ بابائے اردو ہند و پاک کی سو سالہ ثقافت کی آخری شمع تھے جو آج بجھ گئی اور اسی طرح بابائے اردو کے ساتھ ایک دور گزر گیا۔ بابائے اردو تین ماہ سے سخت بیمار تھے ۵ر مئی کو جب ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو وہ جناح اسپتال میں داخل ہو گئے اور کچھ افاقہ نہ ہوا تو صدر پاکستان نے ان کو مری بلا لیا اور مری اور راولپنڈی ملٹری کمبائنڈ اسپتال میں صدر کے مہمان کی حیثیت سے علاج ہوا پھر ۱۱ر اگست کو تیز گام کے ذریعہ کراچی واپس آ گئے اور سول اسپتال میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی صدر صاحب کے مہمان کی حیثیت سے زیر علاج تھے لیکن حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی اور ڈاکٹروں نے سرطان جگر کو لاعلاج قرار دے دیا۔ افسوس ہے کہ صدر پاکستان کی ہمدردیاں، قوم کی پرخلوص دعائیں بھی بابائے اردو کو موت کے ہاتھوں سے نہ بچا سکیں۔ بابائے اردو کی وفات ایک ایسا زبردست قومی سانحہ ہے جس کی تلافی بہت ہی مشکل سے ہو سکے گی۔

بابائے اردو اپنی ذات سے ایک مکمل تاریخ تھے افسوس ہے کہ دنیا سے وہ ہستی اٹھ گئی جس نے سید اور محسن الملک کے زیر دامن تربیت پائی تھی بابائے اردو علی گڑھ کے طلبائے قدیم میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی اور بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان سے بھی زیادہ سینیر تھے۔ ہم بابائے اردو کے سانحۂ ارتحال پر تہہ دل سے متاسف ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آخری دور میں مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ خداوند کریم ہم سب کو بابائے اردو کی یہ آخری خواہش پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۲۰ر اگست ۱۹۶۱ء

رسالہ "خیال" کامٹی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
(اقبال)

خیال کی آخری کاپی پریس جا رہی تھی کہ ریڈیو سے یہ الم ناک اطلاع ملی۔ ہم اس آخر وقت بابائے اردو کی تعزیت میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ وقت اردو والوں کے لئے آنسو بہانے کا نہیں ہے بلکہ اردو کی بقا و ترقی کے لئے اپنی جدوجہد کو زیادہ تیز کر دیجیے

کہا ہے، خصوصاً پاکستان کے محبان اردو کے لئے آنے والا زمانہ سخت آزمائش کا ہے۔ بابائے اردو کی روح کو تسکین اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ ہم اردو کی خاطر انہیں کی طرح قربانیاں دینے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں اور اس کاز کو عملی جامہ پہنائیں جسے بابائے اردو نے ادھورا چھوڑا ہے۔

اگست و ستمبر ۱۹۶۱ء

"میرا رسالہ" کراچی

۱۶ اگست کی صبح، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اللہ کو پیارے ہو گئے ـــــ اردو کا آخری سہارا بھی ختم ہو گیا ـــــ اردو یتیم ہو گئی ـــــ دنیا میں بہت کم ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے مقصد کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیں۔ بابائے اردو کی وفات سے ملک و قوم کو جو نقصان پہنچا ہے اور جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ اردو زبان اپنے اس سچے پرستار کے لئے ہمیشہ تڑپتی رہے گی ـــــ بابائے اردو کی آخری تمنا یہ تھی کہ وہ اردو یونیورسٹی قائم کر دیں تاکہ قوم کے نونہالوں کو ان کی اپنی قومی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اور اب اس عظیم شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اردو یونیورسٹی کے قیام میں حصہ لے تاکہ بابائے اردو کا وہ مشن پورا ہو جائے جس کی تکمیل کے لئے وہ تمام عمر وقف کر چکے تھے۔

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "نقش" کراچی

مولوی عبدالحق نے ایک طویل عمر پائی۔ اس طویل عمر میں انہوں نے سرسید سے لے کر آج تک کی نسل کے لوگوں کو دیکھا اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ہر نسل کو متاثر کیا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے اور یہ بات بذات خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

مولوی عبدالحق اردو زبان کا "سمبل" ہیں عبدالحق کا نام اگر لغت میں شامل کر لیا جائے تو اس کے معنی صرف اردو زبان کی ترقی، ترویج، و اشاعت کے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کم از کم ہمارے ذہن میں تو دوسرے معنی نہیں آتے۔

مولوی عبدالحق نے ایک آزاد مرد کی طرح زندگی بسر کی اور زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا اور برتا اور ہر پہلو پر اپنی شخصیت کی چھاپ لگائی جو ان سے ان کے خلوص اور لہجہ کی مخصوصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ جب کوئی چھوٹا آدمی اس سے ملے تو اسے نہ اپنے چھوٹے پن کا احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ مولوی عبدالحق ایک ایسی ہی عظیم شخصیت کے حامل تھے۔

انجمن ترقی اردو مولوی صاحب کا وہ ترکہ ہے جو انہوں نے ہمارے لئے چھوڑا ہے اسے سنبھالنا اور سنبھال کر گیسوئے اردو کو سنوارنا اور اردو کے مقصد کو صحیح معنی میں آگے بڑھانا مولوی صاحب کی یاد تازہ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے تاریخ ان جانشینوں کے نام بھی سنہری لفظوں سے لکھے گی جو اس کام کو خلوص دل کے ساتھ خدمت سمجھ کر انجام دیں گے اور نہ صرف یہ بلکہ اردو یونیورسٹی کے خیال کو جلد از جلد عمل جامہ پہنائیں گے تاکہ اردو یونیورسٹی اردو تحریک کے لئے منارۂ نور بن کر پاکستان کی ساری یونیورسٹیوں کو "اردو یونیورسٹی" بننے میں مدد دے سکے۔

مولوی صاحب نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے وہ لوگ صدیوں بھی انجام نہ دے سکے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

(ماہ ستمبر ۱۹۶۱ء)

رسالہ "معارف" اعظم گڑھ

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی وفات دنیائے اردو کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ علمی و ادبی حیثیت سے اردو کے خدمت گزاروں کی کمی نہیں ہے، لیکن جس نے ہر پہلو سے اس کی خدمت کی اور اس کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور اس کی راہ میں اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کر دیا وہ تنہا مولوی عبدالحق کی ذات تھی۔ مولوی صاحب مرحوم سے پہلے اردو کی خدمت کا دائرہ محض اردو کی انفرادی علمی و ادبی تصانیف تک محدود تھا، اجتماعی کوشش اور تاریخی، لسانی اور سیاسی حیثیت سے اس کی خدمت کی، صرف بنیاد پڑی تھی، مولوی صاحب نے اس کا عظیم الشان قصر تعمیر کر دیا۔ اور اردو کی خدمت کی ایک عام لگن پیدا کر دی، ان کی خدمات اردو کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہیں اور جب تک اردو زبان باقی ہے ان کا نام بھی زندہ و پائندہ رہے گا۔

●

ان سے پہلے انجمن ترقی اردو کا کوئی وجود نہ تھا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ اردو کی خدمات بھی تھا۔ وہ بھی برائے نام اس کی کوئی حیثیت نہ تھی ۱۹۱۲ء میں جب مولوی صاحب اس شعبہ کے سکریٹری مقرر ہوئے تو اس نام کو اپنے ساتھ اورنگ آباد لے گئے اور اپنی ان تھک کوششوں سے چند دنوں میں اس کو ایک آل انڈیا ادارہ انجمن ترقی اردو بنا دیا۔ اس نے اردو زبان کی جو گوناگوں خدمات انجام دی ہیں ان سے ہر صاحب علم واقف ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر انجمن ترقی اردو نہ ہوتی تو اردو کو علمی زبان بننے میں بڑی دیر لگتی۔

مولوی صاحب کو اردو سے والہانہ عشق تھا انہوں نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا ان کو

سو تے جاگتے ۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کی دھن رہتی تھی ، اور ان کو اردو کی خدمت کے جو موقع بھی ملے ان سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا ۔ اردو کی پہلی یونیورسٹی مرحوم جامعہ عثمانیہ کی تشکیل میں بھی ان کا ہاتھ تھا ۔ پھر اس کے شعبۂ تالیف و تراجم کے سکریٹری اور آخر میں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے اور ان سب میں انہوں نے اردو کی خدمت اور ترقی کی نئی نئی راہیں پیدا کیں ، جامعہ عثمانیہ سے ریٹائر ہونے کے کچھ دنوں بعد انجمن ترقی اردو کو دہلی لے آئے ، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی آئندہ مشترک زبان کی بحث چھڑ چکی تھی ، مولوی صاحب اردو کے لئے سینہ سپر ہو گئے ، اور بالآخر ہندوستانی زبان پر سمجھوتہ ہوا ۔ عبدالحق راجندر پیکٹ کے نام سے موسوم ہے اور جس کو ہندوستان کی آزادی کے بعد طاق نسیاں کے حوالے کر دیا گیا ۔

•

ہندوستان کی تقسیم کے بعد مولوی صاحب کو ان کے حوصلے کے مطابق ہندوستان میں اردو کی خدمت کا میدان تنگ نظر آیا اس لئے پاکستان چلے گئے اور وہاں نئے سرے سے انجمن ترقی اردو کا شاخانہ قائم کیا اور اسی شان سے رسالہ اردو نکالا ۔ گو دستوری حیثیت سے پاکستان کی زبان اردو ہے ۔ لیکن وہاں بھی بڑے پیچیدہ لسانی مسائل ہیں اس لئے پاکستان میں بھی ان کو اردو کے لئے جنگ کرنا پڑی اور آخر تک لڑتے رہے ، اردو کے مسئلے میں پاکستان میں جو کامیابی بھی ہوئی ہے ، اس میں دوسرے حامیانِ اردو کی تائید و حمایت کے ساتھ مولوی صاحب کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے ، ان کے پیش نظر ایک اردو یونیورسٹی کا قیام بھی تھا اس میں تو وہ اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن ایک اردو کالج قائم کر دیا جو ان کی آخری آرام گاہ بنا ۔

•

خالص علمی و ادبی حیثیت سے بھی ان کی خدمات بڑی گرانقدر ہیں ، اردو کی تاریخ کی طرف سب سے پہلے انہی نے توجہ کی اور اس کی کڑیاں فراہم کیں دکنی نوادر کا سراغ لگایا اور ان کی اہمیت واضح کی اردو شعرا کے دواوین اور قدیم تذکروں کو تصحیح تحشیہ اور مبسوط مقدمات کے ساتھ شائع کیا بہت سی کتابوں پر مقدمے لکھے جو افادی پہلو سے مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں ، وہ صاحب طرز ادیب تھے ۔ ان کی تحریر سادگی و سلاست میں سہل ممتنع کی حیثیت رکھتی ہے ، اور سادگی کے باوجود خوشگوار ادبی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی ، ان کے ادبی مضامین ، تحریر کی سادگی و پرکاری کا ہیں ، غرض انہوں نے اردو کی خدمت کا کوئی پہلو اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ۔ اب اردو کے ایسے باعمل فدائی نہ پیدا ہوں گے ، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے ،

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

سہ ماہی "العلم" کراچی

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم بانی انجمن ترقی اردو کے سانحہ ارتحال سے ملت اسلامیہ پاک و ہند کے نشاۃ ثانیہ کے اس دور کا خاتمہ ہو گیا جس کی تخلیق و تعمیر کرنے والے بزرگوں کے حیات آفریں اور سیرت ساز خیالات اور سرگرمیوں سے نیز ان کی پرفیض صحبتوں سے مولوی صاحب مرحوم نے نہ صرف استفادہ کیا تھا بلکہ ان میں اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق خود بھی حصہ لیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے اقتدار و سیادت کی تاریخی حقیقت "تقدیر امم" کے اٹل اور مسلمہ قوانین و عوامل کے تحت اوراق پارینہ کی طرح فضا میں اڑتے ہوئے اور ادھر ادھر بکھرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور چشم بصیرت کے لئے درس و عبرت کا ایک طوفان سمیٹے ہوئے تھے

ع اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ بلبل نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی تھی داستاں اپنی

لیکن جہاں مایوسی و نامرادی نے قلوب کو مضمحل اور قوائے عمل کو شل کر کے پوری ملت کو بے بسی او شکستگی کا نشانہ بنا دیا تھا، وہاں چند مردان عمل کے دل و دماغ میں اسی تاریک فضا نے عبرت و جرات اور ہمت و استقلال کی وہ روشنی پیدا کی جس کی مدد سے اس گری ہوئی قوم کو سہارا دینے اور مسلم خوابیدہ کو بیدار کر کے "حصہ خود راز حریفاں گیر و گرم کار شو" کے مردانگی میدان میں سعی پیہم اور جہد مسلسل کے لئے تیار کرنے کی غرض سے ان کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ مولوی صاحب مرحوم نے اسی حیات پرور فضا میں سانس لی۔ انہی زعمائے ملت کے تاریخی کارنامے ان کی بیش بہا زندگی کے ایک اہم موڑ پر ان کی سیرت و کردار پر اثر انداز ہوئے اور دنیا جانتی ہے کہ اپنی ۹۲ سالہ متحرک۔ طوفان در آغوش، لیکن ٹھوس اور مفید کاموں سے آراستہ و پیراستہ زندگی میں مولوی صاحب مرحوم نے کس طرح اپنے آپ کو ملت مرحومہ کے ان رجال عظیم کا صحیح نمائندہ ثابت کیا۔

مولوی صاحب مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے بحیثیت ایک بلند پایہ انسان۔ ایک عظیم المرتبت ادیب محقق۔ مولف۔ مترجم، مصنف اور بے لوث خادم اردو مولوی صاحب کے منصب کا تعین کرنا یہ تو بعد میں آنے والے مورخین کا کام ہے اس وقت تو ہمیں یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب اس یتیم اردو کو بابائے اردو کی طرح والہانہ جوش، عزم و ایثار۔ ان تھک کوشش اور بے نظیر قربانیاں پیش کر کے پرورش کرنے اور پروان چڑھانے والا کہاں سے آئے گا! یوں تو مولانا کی ساری زندگی ہند و پاکستان کے اردو نواز کارکنوں اور نوجوانوں کے لئے ایک مثالی زندگی ہے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد جس پامردی، بے خوفی اور لگن کے ساتھ اردو کو بچانے کی کوشش کی۔ اور بالآخر پاکستان آ کر اردو کے تحفظ و ترقی کے لئے نیا میدان پیدا کیا اور پیرانہ سالی کے باوجود جوان ہمتی سے اس

کام میں لگے رہے ۔ اس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی انہی خصوصیات نے قوم کی نظر میں زندہ جاوید بنا دیا ہے اور یہ یقین ہے کہ قوم ان کے شایان شان ان کی یادگار جلد قائم کرے گی اور یہ یادگار اردو یونیورسٹی ہی ہو سکتی ہے جس کا نعرہ وہ آخری دم تک لگاتے رہے اس خصوص میں ہمیں اپنے محبوب صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی معارف پروری پر بھی کامل بھروسہ ہے کہ جس طرح انہوں نے بابائے اردو کی زندگی میں ان کی مثالی قدر دانی کی اسی طرح وہ مرحوم کی سب سے بڑی آرزو کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے ۔ (جولائی دسمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "جامعہ" دہلی

ڈاکٹر عبد الحق کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ اور تہذیب کا ایک دور رخصت ہو گیا جسے قرون وسطیٰ کا مقطع اور عہد جدید کا مطلع کہنا چاہیے مرحوم نے جو مجاہدانہ کارنامے اردو زبان کی حمایت و حفاظت اور اصلاح و ترقی کے سلسلے میں انجام دیئے وہ اس قدر نمایاں اور شور انگیز تھے کہ لوگوں کی ساری توجہ انہی پر مرکوز ہو گئی اور دوسری خصوصیات جو اہمیت میں کسی طرح کم نہ تھیں، عام نظروں سے اوجھل رہیں ۔

ڈاکٹر عبد الحق، سر سید احمد خاں کی لبرلزم (روشن خیالی یا آزاد خیالی) کی تحریک کے جسے مخالفین نیچریت کہہ کر بدنام کرتے تھے، شروع سے علم بردار تھے اور آخر تک رہے ۔ اگر ان کی تحریروں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، تو یہ معلوم ہوگا کہ مذہب کی عقلی تعبیر، رسوم و روایات اور اوہام و تعصبات کی تنقید، زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش جو لبرلزم کے بنیادی عناصر ہیں، ان کے ہاں اس قوت اور شدت سے نہ سہی جیسے خود سر سید یا چراغ علی حالی یا اعظم الثقلین کے ہاں پھر بھی واضح طور پر موجود ہیں ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ سر سید کے عام پیروؤں کی طرح ہندوستان کی سیاست میں انہوں نے برطانوی حکومت کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ جنگ آزادی کے سپاہیوں کی طرف رہے ۔ حیدر آباد کی ملازمت کی وجہ سے وہ اپنے سیاسی خیالات کا تحریر و تقریر میں اظہار نہیں کر سکتے تھے، لیکن ممتاز کانگریسی لیڈروں اور کارکنوں سے ان کی گاڑھی دوستی اور کانگریس کی تحریک آزادی سے ان کی گہری ہمدردی ان کے جاننے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہنگامی وجوہ سے جن کے بیان کرنے کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ گنجائش، ان کی ہمدردی کا رخ آخر میں کانگریس سے مسلم لیگ کی طرف اور ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہو گیا، مگر یہ بھی یقینی ہے کہ غلامی کی طرف یا بدیسی حکومت کی طرف کبھی نہیں ہوا ۔

جب ڈاکٹر عبد الحق کی سیرت کی مفصل اور مکمل تصویر صفحۂ تاریخ پر کھینچی جائے گی تو اس میں بشریت کی

خامیاں اور کمزوریاں بھی ضرور رہیں گی۔ مگر مجموعی طور پر ایک باکمال انشا پرداز، ایک بالغ نظر نقاد، ایک دیدہ ور محقق، ایک روشن خیال اور ترقی پسند دانشور کی جھلکیاں نظر آئیں گی اور جو رنگ سب پر غالب ہوگا وہ ایک مجذوب مجاہد کا ہوگا جو نصف صدی تک اردو کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر پہلے ہندوستان میں اور پھر پاکستان میں بلا اندیشۂ سود و زیاں بے جگری کے ساتھ مخالف قوتوں سے لڑتا رہا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی

بابائے اردو مولوی عبدالحق تین چار ماہ کی علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ ایسا سانحہ ہے جس کا صدمہ ہمیشہ رہے گا۔ مولوی صاحب نے جس خلوص کے ساتھ اردو کی خدمت کی ہے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی انہوں نے اپنا سارا کتب خانہ انجمن ترقی اردو کو دے دیا، نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی بھی اس کی نذر کر دی۔ وہ ایک زبردست انشا پرداز، اور غیر جانبدار نقاد اور محقق تھے۔ ان کی ذات ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی وہ ایسے دور کے نمائندے تھے جو ان کی ذات پر ختم ہوگیا۔

ان کی کتابیں اردو علم و ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کی آخری خواہش اردو یونیورسٹی کا قیام تھا یقین ہے کہ موجودہ دور کے مسلمان اس یادگار کو قائم کر کے دم لیں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کے شبستان خاک کو اپنے انوار رحمت سے بھر دے۔ ان کے مرنے سے اردو یتیم ہوگئی ہے۔ (اگست ۶۱ء)

ماہنامہ "کتاب نما" دہلی

دنیائے اردو نے یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی کہ ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ۹۱ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ زبان اردو کی خدمت صرف کیا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو کو اس درجہ پر پہنچانے میں مرحوم کی کوششوں کو بہت دخل ہے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے بانی تھے۔ عرصہ تک اس کے سکریٹری رہے، اور تن من دھن سے اس کی خدمت کرتے رہے تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

انتقال کی خبر پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے اس سلسلہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین، جامعہ نگر کا بھی ایک تعزیتی جلسہ ۲۷ اگست کو ہوا جس کی قرارداد ذیل میں درج کرتے

ہوئے ادارہ کتاب نما بھی مرحوم کی مغفرت کے لئے دست بدعا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ جلسہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کی وفات پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے ہوئے یہ امید رکھتا ہے کہ اردو کے خادم مرحوم کی شخصیت اور مثال سے فیضان حاصل کریں گے اور اس کی بقا اور ترقی کے لئے دل و جان سے کوشش کرتے رہیں گے۔ (ستمبر ۶۱ء)

ماہنامہ "حرم" لاہور

۱۶ر اگست کو اردو زبان کے محسن ڈاکٹر مولوی عبد الحق انتقال فرما گئے یقیناً یہ ایک قومی صدمہ ہے ——— کہنے کو مرحوم نے ایک زبان کے تحفظ و بقا اور ترویج و اشاعت کے لئے کوشش کی لیکن حقیقتاً وہ ایک پاکیزہ کلچر کی تشکیل اور ایک اہم تحریک کو فروغ دینے میں معاون رہے اور یوں انہوں نے قوم کے بنیادی مقاصد کے حصول میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

اردو زبان کو ایک کلچر اور ایک تحریک قرار دینا شاید بعض لوگوں کو مبالغہ معلوم ہو لیکن جب اس زبان کے مزاج، کشادہ دامانی، تاریخ اور ان اثرات پر غور کیا جائے گا جو اس کی وجہ سے مرتب ہوئے تو اس نظریئے کی صداقت تسلیم کرنا پڑے گی۔ یہ بات پورے پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس زبان کے میٹھے بولوں نے ہمارے سینوں میں خودداری اور خود اعتمادی کی حرارت باقی رکھی اور اس حرارت کے بل پر ہم اپنی آزادی کی جنگ جیتنے کے قابل ہو سکے علاوہ ازیں یہی زبان ہے جو ہمارے بہتر مستقبل کی تعمیر میں قیمتی مدد دے رہی ہے۔

بابائے اردو کی وفات کے المناک سانحے پر ان تمام باتوں کا اعتراف کیا گیا ہے اگر ان بیانات کو جمع کیا جائے جو ہمارے سرکاری اور علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے دیئے گئے ہیں تو بابائے اردو کی بڑی ہی عظیم اور بڑی ہی خوب صورت تصویر تیار ہو جاتی ہے۔ احسان شناسی اور قدردانی کا یہ مظاہرہ ایک اچھی علامت ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑا جائے گا۔ جسے مرحوم نہایت خلوص اور انہماک سے انجام دے رہے تھے۔

اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ بابائے اردو کی یاد تازہ رکھنے اور اردو زبان کو امداد ترقی دینے کے لئے سب سے پہلے اس کام کو پورا کیا جائے جو ان کی سب سے بڑی تمنا تھی ——— وہ ہے ——— اردو کالج کراچی کو اردو یونیورسٹی کی شکل دینا۔

(ستمبر ۶۱ء)

ماہنامہ "سفینہ" کراچی

وہ ہوا عشق میں جو ہونا تھا
اور کیا آگے داستاں کہئے

لیلائے اردو کا عاشق صادق تخمیناً نصف صدی اس کے گیسوئے مشکبار کی شانہ کشی کے فرائض انجام دینے کے بعد آخر سولھویں اگست کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اس فرض شناس پیر کہن سال وجواں ہمت اور پیکر عزیمت و استقلال نے انتہائی صبر آزما حالات اور نہایت نازک و ناسازگار لمحات میں بھی اس شمع حریم شاہ جہانی کو تند باد مخالف سے بچانے کے لئے دانش و تدبیر کی روشنی میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ زبان خامہ پہ بے ساختہ کلمات احسنت و مرحبا آتے ہیں۔ شاید میرؔ نے اس میر کاروان اردو ہی کے لئے کہا تھا ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق برّد اللہ مرقدہٗ کی صحت پر کثیر الاشتغالی نے بھی اثر ڈالا لیکن عسکری انقلاب سے قبل حزب مخالف کی دو سالہ ریشہ دوانیوں نے مرحوم کو شدید روحانی، ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائیں۔ ایسی شدید و سمع خراش جن کے باعث نہ صرف فرائض منصبی کی بجا آوری میں تعطل پیدا ہو گیا بلکہ مولوی صاحب کی حساس طبیعت کے زیر اثر دل و دماغ بھی ماؤف ہو کر رہ گئے۔ آج عبدالحق اس بزم آب و گل میں نہیں ہیں لیکن ان کے جاہ و شہرت پسند مخالفین کے ضمیر کی آواز یہی ہوگی کہ انہوں نے ایک بزرگ قوم مخلص، بے لوث اور اردو کے سچّے فدائی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ کسی صورت میں بھی سرمایہ ناز نہیں ہو سکتا۔

ہم نے پابندئ رسوم و روایات ورثہ میں پائی ہے لہٰذا بابائے اردو کی یاد میں تعزیتی جلسوں کا انعقاد، تعزیتی قراردادوں کی اشاعت، رسائل و جرائد کا تعزیتی نمبر منظر عام پر لانا شعراء کا قطعات تاریخ لکھنا۔ رجالِ شعر و ادب کا بہ شکل نظم و نثر خراجِ عقیدت پیش کرنا بھی رسمی باتیں ہیں۔ اگر ہمیں بابائے اردو سے واقعی عقیدت و ارادت ہے تو من حیث القوم ہمارا فرض اولین، اردو یونیورسٹی کی تشکیل و تعمیر ہونا چاہئے یہی بابائے اردو کی آخری خواہش تھی، اور دنیائے فانی سے رخصت ہوتے وقت یہی حسرت وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت اہل پاکستان کی نگاہیں بابائے اردو کے ہمدرد، قدر دان اور مخلص دوست صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ناخن عقدہ کشا پر مرکوز ہیں۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "حور" لاہور

وہ اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، اور جس مشن کے لئے ان کی ساری زندگی وقف رہی وہ مشن ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ ان کی یاد کا سب سے بڑا خراجِ تحسین یہ ہے کہ ہم اس کے مشن کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کی کوشش کریں تاکہ مرحوم و مغفور کی تمام زندگی جن مقاصد کے لئے وقف رہی ان کو پورا ہوتے دیکھ کر ان کی یاد ہمیشہ دلوں میں تازہ رہے۔

اردو ہماری قومی زبان ہے، ہمارے درمیان اس کی اشاعت اور ترویج ہمارا ایک قومی فریضہ ہے۔ اس حقیقت میں تو مطلقاً کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قومی زبان کے بغیر کسی قوم میں آزادی کا امتیاز پیدا نہیں ہوتا۔ کیا ہمارے لئے یہ امر قابلِ توجہ نہیں ہے کہ ہمارا تمام سرکاری اور کم و بیش تمام غیر سرکاری لکھت پڑھت کا کام ایک ایسی زبان میں ہوتا ہے جس میں ہزار خوبیاں ہوں جس کی لاکھ اہمیت ہو لیکن اس کے باوجود وہ ہماری قومی زبان نہیں ہے۔ اس خلا کو جتنی جلدی پورا کر لیا جائے ہمارے قومی مستقبل کے اتنا ہی مفید ہوگا۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر بابائے اردو نے پاکستان میں اعلیٰ سطح کی ایک اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی مہم شروع کی تھی، اگر ملک میں اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے تو اس کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ ہمارے راستے سے وہ رکاوٹ دور ہو جائے گی جس کی وجہ سے فی الوقت اردو کو سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے نجی اداروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔

اردو چونکہ ایک باضابطہ زبان ہے اس لئے اس کو باضابطہ طور پر سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو صرف اسی طریقے پر پورا کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہوگا کہ ملک کے خواص اور عوام کا بھی اس میں کچھ کم دخل نہیں ہوگا۔ اردو کا مسئلہ ایک قومی مسئلہ ہے، اس لئے اس کا تعلق ساری قوم سے ہے۔

بابائے اردو کی روح ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم ان کے ادھورے مشن کو پورا کریں اور اس طرح ایک زندہ اور باعمل قوم ہونے کا ثبوت دیں۔

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "برہان" دہلی

افسوس ہے، پچھلے مہینے ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ۹۲ برس کی عمر میں کراچی میں انتقال کیا اور کراچی میں دفن ہوئے۔ وہ غالباً علی گڑھ کے سب سے پہلے طالب علم تھے جنہوں نے سر سید احمد خان، مولانا

شبلی، مولانا حالی اور اس زمانے کے دوسرے اکابر علم و ادب سے استفادہ کیا اور ان کی صحبتوں اور مجلسوں سے فیض پایا تھا۔ وہ ۱۸۷۰ء میں ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ یہاں مڈل تک تعلیم پائی، پھر علی گڑھ چلے آئے اور یہاں سے ۱۸۹۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد حیدرآباد منتقل ہوگئے جہاں ان کی زندگی کے بہترین ایام بسر ہوئے۔ ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ پھر انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس سے ترقی کی تو اورنگ آباد کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ اس کے بعد مولوی وحید الدین سلیم کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ موصوف جہاں اور جس حیثیت میں رہے اپنی لیاقت و قابلیت، حسن کارکردگی اور فرض شناسی کے باعث نمایاں اور ممتاز ہو کر رہے لیکن قدرت نے جس اصل کام کے لئے پیدا کیا تھا اور جس کے باعث انہیں بڑی شہرت اور عظمت نصیب ہوئی وہ ابھی اپنی تکمیل کے لئے ان کے واسطے چشم براہ تھا۔ چنانچہ جب وہ انسپکٹر آف اسکولز تھے انہیں دلی (۱۹۱۲ء میں) انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ انجمن اب تک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن مولوی عبد الحق صاحب نے اس کو اتنی ترقی دی کہ وہ جلد ہی ایک مستقل انجمن بن گئی اور اس کی سرگرمیوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

انجمن کے سکریٹری منتخب ہوتے ہوئے کر اپنی زندگی کے آخری سانس تک موصوف نے اردو زبان و ادب کی ہمہ جہتی خدمات جس محنت و استقلال، عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کے ساتھ کم و بیش ایک نصف صدی تک انجام دی ہیں وہ صرف اردو زبان و ادب کے حلقوں میں نہیں بلکہ تاریخ کے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ دینے کے لئے کافی ہیں۔ وہ بیک وقت اردو کے صاحب طرز ادیب اور محقق بھی تھے اور بلند پایہ خاکہ نگار و لغت نویس بھی، اونچے درجے کے مؤلف و مصنف بھی اور مترجم بھی، وہ خود بھی بے تکان اور پابندی سے کام کرتے تھے، اور دوسروں سے کام لینا اور انہیں کام کا آدمی بنانا بھی خوب آتا تھا۔ بڑھاپے میں اس مستعدی اور حاضر حواسی سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے کہ اچھے اچھے نوجوان بھی ان کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے تھے۔ انہیں اردو زبان کے ساتھ سچ مچ والہانہ عشق تھا اور اس کے لئے انہوں نے اپنی ہر چیز قربان کردی تھی۔

تقسیم کے بعد موصوف دلی سے کراچی منتقل ہوگئے (اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا یہ انتقال بہت ہی مجبوری کی حالت میں ہوا اور نہ وہ ہندوستان میں ہی رہ کر اردو کے لئے مرجانے کی آس لگائے بیٹھے تھے) ان کا خیال تھا وہاں اردو کو مخالفوں سے واسطہ اور اپنوں کی بے توجہی کا گلہ نہ ہوگا، لیکن اس کے برعکس انہیں وہاں بھی اردو کے لئے اپنوں اور بیگانوں سے وہی جنگ کرنی پڑی جو وہ ہمیشہ کرتے چلے آئے تھے، پاکستان

کی موجودہ حکومت نے بے شبہ ان کی قدر شناسی کی اور اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ حکومت کی توجہ اور امداد سے رہا کام خاطر خواہ انجام دے سکیں مگر اب ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا تھا۔ شعر

ہائے کس وقت ہوئیں دونوں مرادیں حاصل
یار بالیں پہ جو آیا تو قضا بھی آئی

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۶ اگست کو ۹۲ سال کی عمر پاکر انتقال کر گئے۔ سرسید، حالی اور شبلی کی آنکھیں دیکھنے والی شمع اردو گل ہو گئی، وہ اردو کی انجمن کے سب سے روشن، سب سے تابندہ اور سب سے منور چراغ تھے۔ یہ شمع گل ہو کر اردو والوں کے دلوں میں تاریکی پیدا کر دی ہے۔

مولوی صاحب مرحوم جنہیں ہم "اردو والے" بابائے اردو کہتے تھے اور بڑے چاؤ سے کہتے تھے۔ اپنی دھن کے پکے تھے۔ اونچے درجے کے مؤلف تھے، باکمال انشا پرداز تھے، منفرد مقدمہ نگار تھے۔ دیدہ ور محقق تھے۔ بالغ نظر نقاد تھے اور ان سب سے بڑھ کر مولوی عبدالحق اردو کے مجاہد اور سپاہی تھے۔ پون صدی سے زیادہ اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے عمل کے ذریعے اپنے کردار و گفتار اور رفتار کے ذریعے مولوی صاحب نے اردو زبان وادب کی بے لوث اور مردانہ وار خدمت انجام دی۔ اسی سبب وہ مخدوم ہوئے محترم ہوئے، سربلند ہوئے اور پھر زندۂ جاوید ہو گئے آخری وقت تک تصنیف و تالیف میں منہمک رہے قدیم و نایاب کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ ان پر حواشی و مقدمے لکھے، نامساعد اور مخالف حالات میں اردو زبان کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ گوشے گوشے میں اسے متعارف کرایا۔ بلاشبہ وہ اردو کے حق میں مسیحا نفس "فرد فرید" تھے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے بانیوں میں سے ایک تھے، ترقی پسند دانشوروں میں وہ اگلے وقتوں کے ہوتے ہوئے بھی وسیع النظر اور روشن خیال رہنما رہے۔ مادہ پرست رجحانات کے علمبردار ہونے ہوئے بھی مولوی عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کے جذبات کو منظر عام پر لانے میں بڑی خدمت انجام دی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد چنے گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عملاً اس کے صدر اور ناخدا بن گئے تھے۔ اپنی اولوالعزمی اور ایثار پسندی کے سبب آپ نے اردو کو متمدن اور ثقہ زبان بننے میں جس لگن سے خدمات انجام دیں، اس کا اعتراف ہر اردو دوست کو ہے۔ اردو قواعد کی تدوین اور انگریزی اردو لغت کی اشاعت ہی نہیں بلکہ انجمن کا قیام اور احیاء ہی آپ کی اور ہم اردو والوں کی بخشش کے لئے کافی سرمایۂ فخر و مباہات ہے۔ اس قدر جامع کمال شخصیت کی زندگی میں عیب بھی تھے، اور

عیب ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ مگر بقول ڈاکٹر زور ان کے ہنر عیب پر بھاری ہیں اور اگر ان کا دسواں حصہ بھی آج کسی اور کو مل جائے تو اردو کے دن پلٹ جائیں۔"

جناب ڈاکٹر زور نے مولوی صاحب کی رحلت پر تعزیتی بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ مولوی صاحب اردو کی نہ صرف ایک تاریخ تھے۔ بلکہ تاریخ بنانے والوں میں وہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ سرسید کی آنکھیں دیکھنے والوں اور ان کی طرح قوم کی خدمت کی تڑپ رکھنے والوں میں وہ شاید آخری شخص تھے۔ وہ کیا اٹھے کہ قدیم تہذیب و سیاست کی بساط ہی الٹ گئی۔ دبستان حالی انہی کی بنائی ہوئی تھی اور وہی اس کے آخری رکن تھے ان کی وفات سے اب یہ دبستان بھی ختم ہو گیا ہے

سب رس، اور ادارہ ادبیات اردو مولوی صاحب کی زندگی ان کے کاموں کے راستے پر رواں دواں ہے ہم اپنے اس محسن عظیم کی رحلت پر کسی کو پُرسہ دیں؟ کس کے آنسو پونچھیں۔ یہ غم اردو کا ہے اور اس غم میں ہم سب بادیدۂ گریاں شامل ہیں۔ (ستمبر و اکتوبر ۶۱ء)

ماہنامہ "سات رنگ" کراچی

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، بابائے اردو طویل علالت کے بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ اور ہماری علمی دنیا میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی جسے اور کوئی نہیں بھر سکتا۔ بابائے اردو کی شخصیت بھی رنگا رنگ تھی۔ اور ان کے کارنامے بھی گوناگوں تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ہماری تہذیب کے آخری نمائندے تھے۔ ان کے بعد اب وہ باتیں کتابوں ہی میں پڑھی جائیں گی جنھیں ہم ان کی شخصیت میں جیتا جاگتا پاتے تھے، خلوص، بے ریائی، حق گوئی، ایثار اور محبت کی کتنی ہی قدریں تھیں جو ان کے ساتھ ہی گئیں اور اب کبھی میں نظر آئیں گی تو انہیں کی ایک نشانی بن کر۔ ان کی شخصیت ہماری تہذیب کی ایک زندہ تاریخ تھی۔ انہوں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں اور پچھلے ۶۰-۷۰ برس میں ہماری قومی اور ملی زندگی میں جو انقلاب رونما ہوئے ان میں ان کا ایک نمایاں حصہ رہا تھا۔ خاص طور پر اردو زبان کے تحفظ، بقا اور ترقی کے سلسلہ میں اب تک جو کچھ ہوا ہے اس کا سہرا تنہا انہیں کے سر جاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اردو کا لفظ کبھی ہماری زبان پر آئے اور اس کے ساتھ ہی بابائے اردو کا تصور نہ پیدا ہو۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اردو اور عبدالحق ایک ہی چیز کے دو نام ہوں۔

بابائے اردو کی آخری خواہش یہ تھی کہ پاکستان میں جلد از جلد ایک اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کی زندگی میں اس مقصد سے پورا اتفاق نہ رہا ہو۔ لیکن اب ان کی موت کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ان سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کے اس مقصد پر متفق ہو گئے ہیں۔

اور خواہ ان کی یادگار کے طور پر ہی سہی بہرحال ان کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی تائید میں ہیں۔ ہم اس صورت حال کو امید کے لئے ایک نیک فال تصور کرتے ہیں اور یقیناً یہ ان کی پرخلوص زندگی ہی کا ایک نتیجہ ہے کہ ہم سب اس مقصد پرمتفق نظر آتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جن لوگوں کو اردو اور بابائے اردو کے مقاصد سے عملی دلچسپی رہی ہے اور اس سلسلہ میں اپنی مساعی جمیلہ نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ انہیں تیز سے تیز تر کر دیں گے۔ بابائے اردو کی خدمات کا یہ ہم سب کی طرف سے سب سے بڑا اعتراف ہوگا۔

پچھلے دنوں بابائے اردو کی آخری باتیں ان کے دوستوں اور رفیقوں کے مضامین کے ذریعہ عوام تک پہنچی ہیں جن میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ وہ آخری وقت اردو اور صرف اردو کے بارے میں سوچتے رہے مگر ان کی خواہش تھی کہ مغربی ادب کی بعض اہم کتابوں اور شعری تخلیقات کو اردو میں منتقل کر دیا جائے۔ کیا اچھا ہو اگر انجمن ترقی اردو اب اپنی پہلی فرصت میں اسی کام کی طرف توجہ کرے اور ان حضرات سے اس کام کی تکمیل کرائے جو اس کے حقیقی معنوں میں اہل ہوں۔ اس سے نہ صرف بابائے اردو کی خواہش پوری ہوگی بلکہ اردو زبان میں ایسی گرانقدر چیزوں کے ترجمے سے ایک ضروری اور قابل قدر اضافہ بھی ہوگا ہمیں امید ہے کہ انجمن کے اراکین اردو یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ساتھ اس کام کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہ کریں گے۔ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۲)

ماہنامہ "تحریک" دہلی

اردو دنیا میں ایک مجاہد کی حیثیت سے ان کو اتنی شہرت ملی ہے کہ ان کی دوسری قابل قدر حیثیتوں کا اکثر اوقات پورا اعتراف نہیں ہوتا۔ نثر میں وہ صاحب طرز تھے۔ مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خان کی نثر کے مقابلے میں ان کا طرز تحریر سادہ تھا لیکن ان کی تحریر بڑی ہی جاندار ہے وہ قاری کو مرعوب کرنے کی بجائے اسے اپنی بات سمجھانے میں زیادہ یقین رکھتے تھے اور تصنع سے بالکل کام نہ لیتے تھے۔ ان کے طرز تحریر کا یہ پہلو بڑا ہی قابل قدر ہے اور اگر اردو کو واقعی عوام رس بننا ہے تو اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

ایک محقق کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ ممتاز تھا وہ زندگی بھر اردو کے علمی سرمائے میں اضافہ کرتے رہے اور آخری وقت تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام نے جو حصہ لیا تھا اسے منظر عام پر لاکر انہوں نے بہت بڑی خدمت سر انجام دی ہے کیونکہ اس سے اس خیال کی تردید ہوتی کہ اردو کی ترویج مسلمانوں کے حاکمانہ اقتدار کا نتیجہ تھی۔

اردو قواعد کی تدوین بھی انہیں کا کارنامہ ہے یہ قواعد واقعی اردو کی قواعد ہے اور فارسی قواعد کا ضمیمہ نہیں۔ انگریزی اردو لغت شائع کرکے بھی انہوں نے بہت بڑی خدمت سر انجام دی تھی۔ اب وہ اردو کی ایک مستند لغت بھی ترتیب دے چکے تھے لیکن اس کی اشاعت سے پہلے ہی چل بسے۔

یہ سب خدمات اتنی شاندار ہیں کہ ان میں سے کوئی
ایک خدمت بھی اردو کی تاریخ میں انہیں دوام بخش سکتی
تھی۔ ان سب کی بنا پر انہیں بابائے اردو کہنا ایک حقیقت
کا اعتراف ہے جس میں مبالغے کا کوئی شائبہ نہیں

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

ماہنامہ "نوائے ادب" بمبئی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی موت ایک ناقابل
تلافی سانحہ ہے، اور شاید عرصہ تک ایسا مرد اردو پیدا نہ کر سکے
گی اور اس زمانے کو ایک ایسا سچا مجاہد جو اس کی راہ میں اپنی
جوانی، اپنا بڑھاپا، اپنی صحت، اپنی کمائی اپنا تن من دھن
قربان کردے نہ ملے گا۔ اردو سے ان کا یہ عشق ہمارا خیال
ہے کہ نتیجہ ہے اس اثر کا جو انہوں نے سرسید کی صحبت میں اردو
کی حفاظت و ترقی کی کوششوں کو دیکھ کر لیا۔ سرسید کی
زندگی کے آخری چالیس برس بڑی حد تک اردو کی حفاظت میں
گزرے اور مرنے سے پہلے جو آخری مضمون وہ لکھ رہے
تھے وہ اردو کی مدافعت میں تھا۔ پھر محسن الملک کے زمانے
میں۔ اس مسئلہ نے جو تکلیف دہ صورت اختیار کر لی تھی
اس کو نزدیک سے دیکھنے والوں میں یہ بھی تھے اور شاید
انہیں چیزوں نے ان کو اردو کا سب سے بڑا محافظ، مجاہد
اور مربی بنا دیا۔ وہ شروع ہی سے محمڈن ایجوکیشنل
کانفرنس کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے اور جب ۱۹۱۲ء میں
وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے تو اس زمانے
کے حالات کے مطابق اردو کے خزانے کو تراجم و تصنیفات
کے ذریعے مالا مال کرنے کا انتظام کیا اور اسی طرح
در اصل علمی حیثیت سے جامعہ اردو کی بنیاد رکھنا شروع کی
عملی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سے لے کر
آخر تک بڑی حد تک اس کے روح رواں رہے۔ اس کے ساتھ
ہی انہوں نے اردو کی اہمیت دکھانے اور کانفرنس کی حلقہ بگوشی
سے نجات دلانے کے لئے انجمن ترقی اردو کو ایک مستقل کل ہند
ادارہ بنا لیا اور اس کا سب سے پہلا شاندار اجلاس ۱۹۱۶ء
میں لکھنؤ کی اسی بارہ دری میں ہوا جس میں چار سال پہلے
۱۹۱۲ء میں سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ اس کے چند
برسوں کے بعد ہی انہوں نے سہ ماہی رسالہ "اردو" نکالنا
شروع کیا۔ جوں جوں اردو کی تحریک بڑھتی گئی ان کا دائرہ
عمل بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ انجمن کی تصانیف کی تعداد سے
اس کے ادبی کارناموں کا اندازہ ہو سکتا ہے، اس میں بھی
مختلف حیثیتوں سے وہ شریک غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔
جوں جوں اردو کی تحریک بڑھتی اور اہم ہوتی گئی
ان کا حلقۂ عمل بھی بڑھتا گیا۔ اس انجمن ترقی اردو کی جو مترو ہ
رالبعہ و رانی کے محدود احاطہ میں بند تھی سارے ہندوستان
میں شاخوں کا جال بچھ گیا اور پھر اردو کے متعلق جو مسئلہ
بھی پیدا ہوا اس کے حل و نظم میں ڈاکٹر عبدالحق سب سے آگے
سینہ سپر تھے۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر تقسیم کے پہلے فضا بہت زیادہ
مسموم نہ ہو گئی ہوتی تو اردو کا مستقبل اس ملک میں کافی محفوظ
مستحکم اور متعین ہو چکا ہوتا۔ اس کا اندازہ اس لغت کی جو اب
ناپید ہو گیا ہے، ترتیب و تکمیل سے ہو سکتا ہے جو مولانا

نے راجندر عبدالحق معاہدے کے بعد مرتب کیا تھا تقسیم کے بعد مولانا پاکستان چلے گئے۔ ان کی زندگی کے چند آخری برسوں نے ان کو بڑی حد تک مایوس کر دیا تھا اور اگر موجودہ حکومت کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو معلوم نہیں ان کا کیا حال ہوتا۔ اس مایوسی نے ان کی بیماری دل کو ناسور جگر کی شکل دے دی اور ان کا کام تمام کر دیا۔

مولانا کی زندگی ایک دردمند انسان، ایک شفیق معلم، ایک ژرف نگاہ محقق، ایک دبستان انشا کے بانی اور ایک نڈر مجاہد کی حیثیت سے ایک مثالی زندگی ہے مجھے بھی اس مجاہد اردو کے زیر علم عرصہ تک کام کرنے کی عزت حاصل رہی ہے اس مجاہد اعظم نے اپنی عمر اردو کی حفاظت کے جہاد میں گزار دی وہ تھک چکا تھا اور اب اسے ابدی آرام کی ضرورت تھی۔ ہمارا فرض ہے کہ اگر ہم اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس ایثار و قربانی اور علم و عمل کی معزز ہستی کی پیروی کریں۔

(اکتوبر ۱۹۶۱ء)

پندرہ روزہ "ترجمان" علی گڑھ

کراچی ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اپنی طویل علالت کے بعد ۹۲ سال کی عمر پاکر اس عارضی دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولوی عبدالحق برصغیر ہند و پاک کی وہ واحد شخصیت تھے جنہوں نے اپنی تمام عمر یکسوئے اردو میں شانہ کرتے گزار دی۔ مرحوم نے اپنا تمام سرمایۂ حیات اردو کے لئے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے اردو کی حمایت صرف زبان اور قلم سے نہیں کی، بلکہ اپنے دل۔ اپنے جسم اور اپنے کمائے ہوئے سرمایہ سے کی تھی۔ ان کا اوڑھنا بچھونا اردو تھا۔ اردو کے مسئلہ پر ملک کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں سے ان کے اختلافات رہے لیکن انہوں نے ہمیشہ ہندوستان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔

ان کے ساتھیوں میں سرکشن پرشاد شاد۔ سر تیج بہادر سپرو۔ اور پنڈت کیفی جیسے مخلص اور علم دوست بزرگ بھی تھے۔ اردو کی حمایت میں مولوی صاحب کو اپنوں اور غیروں سے بڑی بڑی اذیتیں پہنچیں مگر ان کے عزم میں کبھی شکستگی پیدا نہیں ہوئی وہ اس راہ کے خارزاروں سے واقف تھے ان کی نظر بڑی مردم شناس تھی انہوں نے اردو کی حمایت بانگ دہل کی مصلحت، شخصیت، وقت اور دولت کے پیمانوں سے اردو کو نہیں ناپا۔ انہوں نے ہر نازک موڑ پر اردو کی تائید کی جبکہ ان کے بعض رفیق خاموش رہنا مصلحت سمجھتے تھے۔

بدقسمتی سے تقسیم نے انہیں ان کے وطن سے دور کر دیا تھا، وہ کراچی نہیں جانا چاہتے تھے لیکن جب ان کے رفقا، تقسیم کے بھیانک حالات سے متاثر ہوگئے تو مجبور ہوکر مولوی صاحب نے ترک وطن کا ارادہ کیا۔

مولوی صاحب ہاپڑ ضلع میرٹھ کی تحصیل میں پیدا

ہوئے۔ علی گڑھ ایم۔ اے کالج سے بی۔ اے کیا۔ سر سید علیہ الرحمۃ کی آنکھوں کو دیکھے ہوئے تھے۔ ان کے سچے عاشق تھے اور یہ عشق مرتے دم تک قائم رہا۔ سینکڑوں نایاب اور قدیم کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ بیسیوں کتابیں تصنیف کیں اور بے شمار شعرا اور ادبا کی کتابوں پر مقدمے اور دیباچے لکھکر ان کو ملک میں متعارف کردیا۔

مرحوم نے انجمن ترقی اردو کی اپنے خون سے آبیاری کی۔ اپنی تمام جائیداد فروخت کرکے اس کو بنایا زندگی بھر جو کمایا وہ انجمن کو دیا۔ دوسرے عثمانیہ یونیورسٹی کو بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان اداروں نے اردو کی بڑی خدمات انجام دیں، افسوس کہ آج یہ دونوں ادارے بھی مرحوم ہوکر رہ گئے۔

کراچی میں مولوی صاحب نے لاکھوں سائنس کی اصطلاحات کو اردو کے قالب میں ڈھالا، اردو لغت کی ترتیب میں کئی سال صرف کئے ـــــ مگر افسوس کہ یہ دونوں کام سرمائے کی کمی کے باعث نا تمام رہے۔

گزشتہ تین سال سے وہ کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی جدوجہد میں تھے اور اس کے لئے بہت کچھ کرلیا تھا۔ اس یونیورسٹی کو بنانا مولوی صاحب کی صحیح یاد کو قائم کرنا ہے جو لوگ پاکستان میں بابائے اردو سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ مولوی صاحب کے چھوڑے ہوئے کاموں کو تکمیل پر پہنچائیں۔

ادارہ مولوی صاحب کی وفات کو ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقے کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے اور خداوند کریم سے دست بدعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحوم مولوی صاحب کی روح کو اپنی لامحدود رحمتوں سے نوازے، آمین ۔ (۲۰ اگست ۱۹۶۱ء)

ہفت روزہ "جھنکار" کراچی

دنیا کی ہر چیز فانی ہے، انسان آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، مگر ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنہوں نے اپنے لئے زندگی نہ گزاری ہو بلکہ ایک مقصد کے لئے زندہ رہے ہوں، ایسے تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

بابائے اردو انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بابائے اردو کی موت نے ایک ایسا خلا پیدا کردیا ہے جس کا پر ہونا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ ان کی موت نے اردو کو بیوہ کردیا ہے۔

وہ اردو، جس کے متعلق بابائے اردو نے کہا تھا کہ "میں نے اس لئے شادی نہیں کی کہ میری شادی اردو سے ہوچکی ہے۔"

بابائے اردو کی عمر کے آخری پچاس سال اردو اور صرف اردو زبان کی بقا اور ترویج کے لئے بسر ہوئے ہیں۔ یہ پچاس سال ایک تاریخ ہیں ایک ناقابل فراموش دور ہے، یہ ایک ایسے فرد کا ماتم ہے جسے ہم ایک عہد کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اردو زبان کے لئے یہ تڑپ، یہ بے قراری یہ

بے چینی اب کس میں ملے گی ۔ کون زود ہوگا جس کی زبان سے ہر وقت اردو، اردو کی آواز نکلے گی ــــ بابائے اردو کی موت پر لاکھوں نے آنسو بہائے ہیں۔ اب جلسے ہوں گے تقاریر ہوں گی۔ مگر بابائے اردو کی طرح ایک مقصد کے لئے زندگی گزارنے والا کوئی فرد نظر نہیں آئے گا ــــ اب کوئی ایسا فرد نہیں ملے گا جو اردو، اردو پکارتا رہے۔ ــــ یا اب ایسا کوئی فرد نظر نہیں آئے گا جو اسی تڑپ کے ساتھ ان کے مشن کو پورا کرنے کی سعی کرے ــ اردو یتیم ہوگئی ۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ ان کے عقیدت مند، ان کے دوست اور ان کے احباب اس بات کے لئے کوشاں ہو جائیں کہ وہ بابائے اردو کے مشن کو پورا کرنے کے لئے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیں اردو یونیورسٹی بنانا ہمارا قومی فریضہ ہے، اور فریضہ کو ادا کرنے کے لئے لوگوں کو سامنے آنا چاہئے۔ اور اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ خلوص نیتی سے اردو یونیورسٹی بنا کر ہی بابائے اردو کی یاد کو تازہ رکھ سکتے ہیں اور یہی ان کی محبت ہے ۔

ہم بابائے اردو کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں ۔ خداوند تعالےٰ بابائے اردو کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے بھائی اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔ آمین

(۲۲ اگست ۱۹۶۱ء)

ہفتہ وار "نئی جمہوریت" کراچی

ہم نے "نئی جمہوریت" کے گزشتہ شمارے میں بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب کی تشویشناک حالت کا تذکرہ کیا تھا۔ یوں تو بابائے اردو کی ظاہری کیفیات سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ چند دنوں کے مہمان ہیں تاہم دل قبول نہ کرتا تھا کہ وہ اس دنیا کو خیرباد کہہ جائیں گے ــ مگر ــ وقت کا فیصلہ اٹل رہا اور بابائے اردو لاکھوں دلوں کو سوگوار کر کے چلے گئے۔

بابائے اردو کی ذات، اردو زبان کا سمبل بن چکی تھی۔ ان کی تمام زندگی اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لئے وقف رہی گزشتہ نصف صدی میں بابائے اردو کی خاطر جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں۔ انہوں نے انگریز حکمرانوں، راجوں مہاراجوں، نوابوں، سیاسی لیڈروں، غرض کہ ہر اس طاقت نے اردو کی بقا اور استحکام کے لئے ٹکر لی، جو اپنے اقتدار کے زعم میں اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ بابائے اردو کے حوصلے تمام عمر توانا تازہ اور جوان رہے۔ دنیا میں کوئی ایسی شخصیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی جس نے بابائے اردو کی طرح اپنی تمام زندگی کسی زبان کے مفاد کی خاطر تج دی ہو۔

بابائے نے اپنے ٹھوس علمی کارناموں سے اردو زبان کی تاریخ میں ایک زرین باب کا اضافہ کیا۔ تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف کے شعبوں میں بابائے نے اپنی مساعی

جمیلہ سے ایک نئی روح پھونک دی ۔ اردو ہمیشہ ان کے ان کارناموں کی احسان مند رہے گی ۔

بابائے اردو جیسے بے غرض، ایثار پسند اور پُرخلوص افراد آج کمیاب نہیں تو نایاب ضرور ہیں ان کی شخصیت میں بڑا وقار ضبط اور استحکام تھا ۔

بابائے اردو نے انتہائی مشکلات میں بھی صبر و ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ پچھلے دنوں چند محسن کشوں نے بابا کو جسمانی اور روحانی تکالیف پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ان کی برائے نام آسائشوں مثلاً پانی، پنکھے اور ٹیلی فون کے سلسلے منقطع کرا دئے ۔ بابا چاہتے تو ان کے خلاف سخت سے سخت اقدام اٹھایا جا سکتا تھا لیکن انہوں نے تو اپنی شخصیت سے ذاتی اغراض کا تصور ہی نکال دیا تھا ۔ وہ بولتے تھے تو اردو کے لئے، ہنستے تھے تو اردو کے لئے ۔ جاگتے تھے تو اردو کے لئے، سوتے تھے تو اردو کے لئے ان کی زندگی کا دوسرا نام اردو تھا ۔

بابائے اردو کی ذات درحقیقت ایک مستقل ادارہ تھی جس سے ہزاروں افراد کی تربیت اور شخصیتوں کی تعمیر ہوئی ۔ بابا میں بلا کی اخلاقی جرات تھی ۔ اتنی بڑی اخلاقی جرات کے حامل کسی فرد کا اس دور میں ملنا تقریباً ناممکن ہے ۔ دنیا کی کوئی قوت انہیں ان کے خیالات کے اظہار اور ربجۃ عزائم کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکتی تھی ۔

کسی آدرش کی خاطر زندہ رہنا ہی حقیقی زندگی گزارنا ہے لیکن ایسی زندگی گزارنا حلقۂ صد کام نہنگ سے گزرنے کے برابر ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے بابا کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی ۔ ایک صدی کی تمام زندہ روایات پرمشتمل ان کی شخصیت ہماری قومی زندگی کے محرکات میں سے ایک تھی ۔

آج بابا ہم میں موجود نہیں، ہمارے قلب و روح ان کے غم میں سوگوار ہیں اگر ہم اپنے جذبات کی قدر کرنا جانتے ہیں تو ہمیں بابائے اردو کی آخری خواہش کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے جس کی تکمیل کے لئے وہ آخری سانس تک جدوجہد کرتے رہے ۔

یعنی اردو یونی ورسٹی کا قیام ۔ ہم بابائے اردو کی یادگار قائم کرنے کے خواہاں ہیں ۔ اردو یونی ورسٹی سے بڑھ کر کوئی اور یادگار بابائے اردو کے شایان نہیں ہو سکتی ۔

اگر ہم بابائے اردو کے ان عزائم کا تھوڑا سا بھی اثر قبول کرلیں جو آخری دم تک ان کی رگوں میں جاری و ساری رہے تو ہمارے لئے اردو یونی ورسٹی کا قیام کوئی مشکل کام نہیں ۔

اردو سے محبت اور بابائے اردو سے عقیدت کا عملی ثبوت ہم اردو یونیورسٹی کے قیام کی خاطر جدوجہد کرکے ہی دے سکتے ہیں ۔

اردو یونی ورسٹی کا قیام بابائے اردو کی خواہش کی تکمیل کے پردے میں دراصل ایک عظیم الشان ادارہ کا قیام ہوگا، جس میں قومی زندگی کے تمام تقاضوں کو سامنے رکھ کر شخصیتوں کی تعمیر ہو سکے گی ۔

(۲۹ر اگست ۱۹۶۱)

ہفت روزہ "الہام" بہاولپور

۲ہ ۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کے ساتھ اردو کی سو سالہ تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہو گیا۔ مسلم ثقافت کی ایک قدیم نشانی مٹ گئی۔ قومی تحریک کا ایک عظیم مینارہ زمیں بوس ہو گیا۔ عزم و استقلال کا سیل رواں بحر فنا میں گم ہو گیا۔ اب اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان بنانے کے لئے کون سر دھڑ کی بازی لگائے گا۔ اردو کی عظمت و وقار کو بلند کرنے کے لئے کون خون پسینہ ایک کرے گا۔ کس میں یہ ہمت ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے اپنی زندگی کی تمام خوشیاں تج دے اور اردو کے فروغ کے لئے دشمن تو دشمن دوستوں سے بھی وار سہے اور ہمت نہ ہارے۔

یہ تمام خوبیاں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی شخصیت میں بیک وقت مجتمع تھیں وہ اردو کے شیدائی ہی نہیں اس لشکر کے سپہ سالار بھی تھے۔ انہوں نے جب اردو کی شکست یا فتح کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تھی وہ برابر اس میں قوت و توانائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، انہوں نے اپنی ہمت اور جرات سے مخالف فوجوں کو بارہا زیر کیا۔ اپنی فتوحات کے جھنڈے ہندوستان کے ہر گوشے میں گاڑے۔ دشمنوں سے اردو کی برتری و فضیلت کو منوایا۔ اردو کا یہ مرد مجاہد اب اپنی عمر کی آخری منزل میں پہنچ چکا تھا۔ کہن سالی نے قوی مضمحل کر دئے تھے۔ لیکن اس کی رگیں اردو کے نام پر اب بھی پھول جاتی تھیں۔ اردو کی مخالفت کرنے والوں کے لئے اب بھی اس کا خون جوش کھاتا تھا۔ اردو کی ترقی کے لئے بڑی سے بڑی مہم سر کرنے کی اب بھی اس میں ہمت تھی۔ وہ برابر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ منزل جس پر پہنچنے کے بعد اردو اپنی ترقی کے منتہا کو پہنچ جاتی۔

۲ہ ۔ یہ منزل مقصود ابھی دو گام باقی تھی کہ رشتۂ حیات کے منقطع ہونے کا وقت آ پہنچا۔ اردو کی شمع روشن کو موت کے اندھیرے میں کھو گیا۔ بزمِ اردو آج سوگوار ہے، ادب و شعر کی محفلیں اداس ہیں۔ ہر بہی خواہ اردو کی آنکھ اپنے محسن کی جدائی سے نمناک ہے۔ یہ صدمہ ایسا معمولی نہیں، کہ کوئی دو چار دن رو کر اسے بھول جائے۔ اس صدمے کی تلافی کیسے ممکن ہے۔ بابائے اردو کا بدل کہاں سے آئے گا۔ وہ جو جگہ خالی کر گئے ہیں اسے کون پُر کریگا۔

ہاں ایک صورت ہے جو اس غم کو بھلا سکتی ہے اور اپنے محسن کی جدائی کا احساس دل سے دور کر سکتی ہے اور وہ بابائے اردو کی اس تحریک کا ثبات ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھا۔ اگر ہم اس تحریک کو زندہ رکھیں اور جس جوش و ولولے سے وہ اردو کی خدمت کر رہے تھے، ہم بھی اس کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں، تو ایک حد تک بابائے اردو کی جدائی کا غم کم ہو سکتا ہے، وہ اردو کو واحد قومی و سرکاری زبان بنانے کے ہی متمنی نہ تھے ان کی کوشش تھی کہ یہ زبان دنیا کے تمام علوم کو اپنے میں سمونے کے قابل بن جائے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے اردو یونیورسٹی

کے قیام کی زبردست جدوجہد کی تھی۔ ان کا یہ خواب بھی ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ کاش، بابائے اردو کا سوگ منانے والے ان کے اس نا تکمیل کاموں کی طرف توجہ دیں۔ اور پہلے سے زیادہ جوش و خروش کا ثبوت دے کر بابائے اردو کے مشن کو پورا کریں۔

(۲۱ اگست ۱۹۶۱ء)

"ترجمان سرحد" پشاور

بابائے اردو مولانا عبدالحق بانی و صدر انجمن ترقی اردو کا ۱۶ اگست کو بعمر ۹۰ سال کراچی میں انتقال ہو گیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مولانا عبدالحق کی وفات بلا مبالغہ پاکستان کے لئے ایک قومی سانحہ ہے، اردو ملک کی قومی زبان ہے۔ قائد اعظم خود اسے قومی زبان تسلیم کر چکے ہیں اور اب بھی اس کی حیثیت اصولاً یہی سمجھی جاتی ہے لیکن ملک پر افرنگ زدہ طبقہ کا غلبہ ہونے کے باعث اسے قومی زبان بنانے سے برابر گریز کیا جا رہا ہے، جو بعض حالتوں میں شرمناک رہا ہے۔ مولانا عبدالحق اس سارے دوران میں اردو کو قومی زبان بنانے کے لئے مساعی کرتے رہے۔ اس کے لئے انہوں نے کبھی کسی بڑے سے بڑے قاہر حاکم کے عتاب کی پرواہ کی اور نہ کبھی کوئی لالچ انہیں اس مہم سے باز رکھ سکی۔ اردو کالج کا قیام بھی ان کی اسی مہم کا ایک قابل قدر نتیجہ ہے اب کہ ان کی مساعی کے بارآور ہونے کے آثار پیدا ہونے لگے تھے، آپ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے ہیں یقین ہے کہ اردو نواز صدر مملکت مولانا مرحوم کے اس کام کو جاری رکھ کر اردو کو جلد ملک کی دفتری اور سرکاری زبان بنا دیں گے۔ یہ ملک کی ایک بڑی خدمت ہے، نیز مرحوم کی آخری خواہش اردو یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے بھی کوئی مناسب اقدام کریں گے۔

ہم مولانا عبدالحق کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے، انجمن ترقی اردو کے کارکنوں اور قوم سے دلی ہمدردی کرتے ہیں۔

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

روزنامہ "کلیم" سکھر

اس دنیائے بے ثبات میں یوں تو سب کچھ فانی ہے اور آج جو ہستیاں ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہیں کل ان کی جدائی میں آنسو ضرور بہانا ہیں لیکن بعض جلیل ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں صدیاں اور نسلیں بھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ دنیا میں آئے دن لوگ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں لیکن ایسی اموات بہت ہی کم ہوتی ہیں جن کا ماتم قومیں کریں اور جن کا سوگ سلطنتیں منائیں۔ پاکستان اپنی چودہ سالہ زندگی میں ایسی کئی ہستیوں سے محروم ہو چکا ہے جن کی موت پر قوم نے خون کے آنسو بہائے ہیں اور آج ڈاکٹر

مولوی عبدالحق کی رحلت نے ملت پاکستان کے ان رنجوں میں ایک کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق جو کل قوم و ملک کی بہت سی امیدوں کا سہارا تھے آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں اور اردو زبان کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ جسے انہوں نے سب سے زیادہ چاہا، پیار کیا، بنایا سنوارا اور جس کی خدمت میں اپنی زندگی کا ایک ایک قیمتی لمحہ صرف کر دیا۔ ان کی موت سے اردو ادب، اردو زبان، علم اور ثقافت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ان کی زندگی ایک عظیم مشن کے لئے وقف تھی اور وہ یہ کہ اردو پھلے پھولے اور برصغیر کی قومی زبان ہو۔ تقسیم کے بعد جب بھارت کی انتہائی متعصب فضا میں ان کے لئے کسی جدوجہد کا امکان نہ رہا تو وہ پاکستان آ گئے اور اسی نصب العین کو اپنایا کہ اردو قومی زبان ہو، کیونکہ صرف اسی زبان میں یہ خصوصیت ہے کہ آزاد قوم کی حیثیت سے ہماری روایات ثقافت و تہذیب اور علم و ادب کو نہ صرف زندہ رکھے بلکہ ترقی کی طرف لے جائے۔ چنانچہ آپ نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے ذریعے جو خدمات انجام دی ہیں انہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انتہائی عزم، جذبہ بانی اور ذمہ دارانہ رویہ کو اپنا کر انہوں نے اردو کے فروغ کے لئے جو کام شروع کر رکھا تھا اس نے پوری قوم کے دل میں ان کے لئے خاص وقار اور محبت پیدا کر دئے تھے۔

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اپنے آخری وقت میں اردو کی ایک عظیم لغت کی تیاری اور اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے کوشاں تھے اور افسوس ہے کہ ابھی ان کے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے تھے کہ موت نے انہیں چھین لیا۔ مولوی صاحب موصوف نے اپنی زندگی اور زندگی کی جدوجہد سے قوم کے ہر فرد کو ایک سبق اور ایک پیغام دیا ہے، اور وہ یہ کہ اگر کسی کو اپنے مقصد، اور اصول کی کامیابی کے لئے صحیح لگن ہو تو پھر کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے مشن کو جاری رکھیں۔ حق اور صداقت کے مکمل احساس کے ساتھ ترقی اردو کے لئے ان کے بتلائے ہوئے راستوں پر چلیں اور ان عظیم منصوبوں کی تکمیل کریں جس کے لئے مرحوم نے آخری سانس تک جدوجہد کی ہے۔

یہ نقصان ایک عظیم قومی نقصان ہے اور قوم جتنا بھی رنج و غم کا اظہار کرے کم ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق مرحوم کی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی تحریک مٹنے نہ پائے اور جو کام وہ شروع کر چکے تھے تکمیل تک پہنچایا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کمی کو دور کرنے کے لئے مناسب افراد نیک نیتی اور خلوص عمل کے ساتھ میدان میں آ کر پاکستان کی قومی زبان اردو کی ترقی و ترویج کے لئے اس کام کو جاری رکھیں گے جو مولانا مرحوم نے باقی چھوڑا ہے

(۱۰ راگست ۱۹۶۱ء)

روزنامہ "آفاق" لاہور / لائل پور

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی وفات کے ساتھ ہماری لسانی تاریخ کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ ویسے خود بابائے اردو نے اپنی اکیاسی سالہ زندگی میں کئی دور شروع اور ختم ہوتے دیکھے۔ ان کی قومی خدمت کی زندگی کا آغاز سرسید احمد خان کے زمانے سے شروع ہوا اور صدر ایوب خان کے زمانے میں موت کے ساتھ ساتھ تمام ہوا۔ گویا ہماری قومی زندگی کی ایک پوری تاریخ ان کی ذات میں سمٹی ہوئی تھی۔ یہ تاریخ برعظیم کے مسلمانوں کی زندگی میں وہ بس تبدیلیاں لائیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو بہت سے مصائب و مشکلات جھیلنے کے بعد ایک نئے نہج پر اپنی زندگی کا آغاز کرنا پڑا جس کی داغ بیل سرسید احمد خان نے ڈالی تھی۔ سرسید تحریک، تحریک خلافت، تحریک پاکستان، یہ مختلف تحریکیں اور زمانے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور زبان کی تحریک کے حوالے سے مختلف قومی تحریکوں میں شریک بھی رہے۔

اردو ہندی کا سوال سرسید احمد خان کے زمانے ہی میں شروع ہو چکا تھا اور مولوی عبدالحق سرسید کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے تھے، انہیں کے سائے میں مولوی صاحب کے قومی شعور کی نشو و نما ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا شبلی کے انتقال کے بعد وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہوئے۔ اس وقت سے آخر دم تک وہ جماعت کے سکریٹری رہے اور اپنی ذات میں اردو کی تحریک بن گئے۔

سرسید احمد خان کے وقت سے تقسیم کے وقت تک مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں اردو کے مسئلہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی سیاسی محاذ پر مختلف دوروں میں ہمارے مختلف قائدین نے قوم کی رہنمائی کی، مگر زبان کے محاذ پر ہر دور میں مولوی صاحب قیادت کرتے نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی نے جب اپنا تعلیمی منصوبہ پیش کیا اور اردو کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تو مولوی عبدالحق نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔

یوں سمجھنا چاہئے کہ بابائے اردو نے زبان کی تحریک کو مسلمانوں کی اجتماعی سیاسی تحریک سے مربوط کیا، اور اردو کو آزادی کی جدوجہد کا ایک جزو بنا دیا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ اجتماعی نصب العین کے لئے زندگی کو اس طرح تج دینا مسلمانوں کی ایک عظیم روایت کی یاد دلاتی ہے اور اب جبکہ یہ روایت ہماری قومی زندگی کا جزو نہیں رہی ہے بابائے اردو کا یہ طور اور بھی قابل قدر نظر آتا ہے۔

اردو کو ابھی ایسے رہنماؤں کی ضرورت تھی۔ بابائے اردو کے انتقال سے ہماری قومی زبان اپنے ایک ان تھک سپاہی سے محروم ہو گئی ہے۔ کاش اردو کے نام لیوا زبان کے لئے زندگی کو تج دینے کی اس روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔

(۱۷ اگست ۱۹۶۱ء)

روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال سے اردو ایک محقق اور ایک عالم کے علاوہ ایک ایسے خدمت گذار سے محروم ہوگئی۔ جو اردو کی ترقی اور توسیع کے لئے مسلسل جہاد کرتا رہا۔ اردو کی پچھلی ۵۰ سال کی تاریخ میں مولوی عبدالحق کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کی تحریک کے ساتھ زبان و تہذیب کے جو مسائل زیر بحث رہے۔ اور اردو، ہندی و ہندوستانی کی جو بحثیں ہوئیں۔ مولوی عبدالحق نے ان میں اہم حصہ لیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب بات ہے۔ کہ وہ پاکستان میں اردو کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ وہ انجمن ترقی اردو کو بھی مستحکم بنیادوں پر قائم نہ کر سکے۔ غالباً مولوی صاحب نے یہ سمجھا تھا کہ پاکستان میں اردو کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ لیکن پاکستان نے مولوی صاحب کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ ایک زمانہ تو ایسا بھی آیا کہ انجمن ترقی اردو کے دفتر سے بھی وہ محروم کر دیئے گئے۔ پریذیڈنٹ ایوب خاں نے مولوی صاحب کی ضرور قدر کی۔ لیکن یہ اس وقت ہوا جب کہ مولوی صاحب عملاً کسی خدمت کے قابل نہیں رہے تھے۔

مولوی عبدالحق کا حیدرآباد اور عثمانیہ یونیورسٹی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ مولوی صاحب کو کراچی میں بھی حیدرآباد کی یاد آتی رہی ہے معترف تھے۔ کہ انھوں نے حیدرآباد میں کچھ حاصل کیا۔ عبدالحق صاحب کی علمی خدمات کا حقیقی آغاز حیدرآباد ہی [illegible] تھا۔ اردو کی ترقی کے لئے مولوی صاحب [illegible] خدمات اور مولوی صاحب کی نثر اردو [illegible] کی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت کی حامل [illegible] ——— خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ آمین!

(۱۹۶۱/۹/[illegible])

"رہنمائے تعلیم" دہلی

یہ رنج و غم سے بھرپور اندوہناک خبر دنیائے اردو ادب میں نہایت ملال کے ساتھ سنی جائے گی۔ کہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے پریذیڈنٹ اور کرتا دھرتا مولوی عبدالحق صاحب اپنی ۹۰ سال کی عمر میں ۱۶ راگست ۱۹۶۱ء کو رحلت فرماگئے ان کی دائمی مفارقت دنیائے اردو کے لئے ایک عظیم صدمہ ہے۔ گویا اردو کے شائقین، خدام اور اردو سے محبت کرنے والے اپنے ایک عظیم صدمہ محترم دوست سے محروم ہو گئے آپ جب دہلی میں مقیم تھے۔ تو میں ایک دفعہ ان کی جائے رہائش پر ان کے دیدار حاصل کرنے

...ار روپیہ نقد بطور انعام
...ے مصرف میں نہیں لائے اور
...شاعت کے کاموں میں اسے
...ل کوشش سے کراچی میں اردو کالج قائم
...ساب انکا ارادہ اردو یونیورسٹی قائم کرنے
...کو آپ پہ بڑھاپا چھا چکا تھا مگر آپ کی ہمت
اور ارادی قوت کافی جوان تھی۔ کہا کرتے تھے۔ کہ
کسی مقصد کی تکمیل کے لئے عظیم جد وجہد کی
ضرورت ہوتی ہے۔ آپ یہ معلوم کرکے حیران
ہوں گے۔ کہ آپ نے ساری عمر شادی نہیں کی۔
ایک مرتبہ ایک اخبار نویس کے سوال پر آپ
نے فرمایا۔ کہ عرصہ ہوا میں نے اردو سے شادی
کرلی تھی۔ اس لحاظ سے آج ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ
اردو بیوہ ہوگئی" ادارہ رہنمائے تعلیم"
مولوی عبدالحق صاحب کی وفات کو اردو
زبان کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار
دیتا ہے۔ اور دعاگو ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ مرحوم
کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور پس ماندگان
کو صبر و حوصلہ بخشے۔ آمین۔ (راقم جگت سنگھ

رانا محمد بیار الحق اشک

قطعہ تاریخ وفات بابائے اردو

د۔ باغ جہاں گشت چو عبدالحق ضیف
از ہجر از بیدمگی ماں بے کیف
(مغزاب مراشک خبر داد و طیف
ویرانہ شد گلشن اردو صد حیف

١٣٨١ھ

...ی خدمت
...نمائے تعلیم کے خاص نمبروں
...میں اک تہلکہ سا مچادیا ہے
...پ لوگ اور
...کی وجہ سے بابائے اردو کہتے ہیں۔ مگر
آپ حقیقت میں بابائے تعلیم ہیں۔ خدا آپ کو خوش
رکھے اور آپ اسی طرح اردو زبان کی خدمت پر تلے
رہیں۔" آپ عظیم ادیب محقق اور محسن طبیعت کے
مالک تھے۔ ان کی زندہ دلی مشہور ہے نیک لوگوں کا
اردو کے سچے خادم تھے اور بڑی پر لطف گفتگو سے
لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔ غرضکہ ایک بے نظیر
شخصیت تھے۔ آپ نے انجمن ترقی اردو ہند کی بنیاد
رکھی بہت دیر تک بڑے زور شور اور شغف و انہماک
کے ساتھ اردو کی بہتری۔ اہمیت، اور ضروریات سے
متعلق جان توڑ مساعی جمیلہ سے کام لیتے رہے جب
ملک کی تقسیم ہوئی تو آپ پاکستان چلے گئے اور کراچی
میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے نام سے کام شروع
کردیا۔ اور خوب کام کیا۔ انکی خدمات کے صلہ میں

روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال سے اردو ایک محقق اور ایک عالم کے علاوہ ایک ایسے خدمت گذار سے محروم ہوگئی۔ جو اردو کی ترقی اور توسیع کے لئے مسلسل جہاد کرتا رہا۔ اردو کی پچھلی ۵۰ سال کی تاریخ میں مولوی عبدالحق کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں (آزادی) کی تحریک کے ساتھ زبان و تہذیب کے جو مسائل زیر بحث رہے۔ اور اردو، ہندی و ہندوستانی کی جو بحثیں ہوئیں۔ مولوی عبدالحق نے ان میں اہم حصہ لیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب بات ہے۔ کہ وہ پاکستان میں اردو کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ وہ انجمن ترقی اردو کو بھی مستحکم بنیادوں پر قائم نہ کر سکے۔ غالباً مولوی صاحب نے یہ سمجھا تھا کہ پاکستان میں اردو کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ لیکن پاکستان نے مولوی صاحب کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ ایک زمانہ تو ایسا بھی آیا کہ انجمن ترقی اردو کے دفتر سے بھی وہ محروم کر دیئے گئے۔ پریذیڈنٹ ایوب خاں نے مولوی صاحب کی ضرور قدر کی۔ لیکن یہ اس وقت ہوا جب کہ مولوی صاحب عملاً کسی خدمت کے قابل نہیں رہے تھے۔

مولوی عبدالحق کا حیدرآباد اور عثمانیہ یونیورسٹی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ مولوی صاحب کو کراچی میں بھی حیدرآباد کی یاد آتی رہی ہے۔ وہ معترف تھے۔ کہ انھوں نے حیدرآباد میں بہت کچھ حاصل کیا۔ عبدالحق صاحب کی علمی و ادبی خدمات کا حقیقی آغاز حیدرآباد ہی سے ہوا تھا۔ اردو کی ترقی کے لئے مولوی صاحب کی خدمات اور مولوی صاحب کی نثر اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت کی حامل رہے گی ——— خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ آمین! (۱۸/۸/۶۱ء)

"رہنمائے تعلیم" دہلی

یہ رنج و غم سے بھرپور اندوہناک خبر دنیائے اردو ادب میں نہایت ملال کے ساتھ سنی جائے گی۔ کہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے پریذیڈنٹ اور کرتا دھرتا مولوی عبدالحق صاحب اپنی ۹۳ سال کی عمر میں ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو رحلت فرمائے ان کی دائمی مفارقت دنیائے اردو کے لئے ایک عظیم صدمہ ہے۔ گویا اردو کے شائقین، خدام اور اردو سے محبت کرنے والے اپنے ایک عظیم صدر محترم دوست سے محروم ہو گئے آپ جب دہلی میں مقیم تھے۔ تو میں ایک روز ان کی جائے رہائش پر ان کے دیدار حاصل کرنے

ہوگیا۔ اسوقت آپ سو رہے تھے۔ میں نے تھوڑا انتظار کیا۔ اتنے میں آپ جاگ اٹھے میری اطلاع پاتے ہی میرے پاس تشریف لے آئے اور فوراً مجھے اپنی بغل میں لے لیا۔ فرمایا آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی میں نے عرض کیا جناب میں تو آپ کا ایک ادنےٰ خادم ہوں۔ فرمایا اجی سردار صاحب آپ نے اردو کی خدمت کیا کم کی ہے میں تو ایک ادارہ کے نام سے کچھ کر رہا ہوں۔ اور آپ تن تنہا اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ رسالہ رہنمائے تعلیم کے خاص نمبروں نے تو اردو اور صحافت میں ایک تہلکہ سا مچا دیا ہو

مجھے آپ سے ملکر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے لوگ اردو کی خدمت گزاری کی وجہ سے بابائے اردو سمجھتے ہیں۔ مگر آپ حقیقت میں بابائے تعلیم ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ اسی طرح اردو زبان کی خدمت کرتے رہیں۔" آپ عظیم ادیب محقق اور محسن طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی زندہ دلی مشہور ہے نیک لوگوں کا اردو کے سچے خادم تھے اور بڑی پر لطف گفتگو سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔ غرضکہ ایک بے نظیر شخصیت تھے۔ آپ نے انجمن ترقی اردو ہند کی بنیاد رکھی بہت دیر تک بڑے زور شور اور شغف و انہماک کے ساتھ اردو کی بہتری۔ اہمیت، اور ضروریات سے متعلق جان توڑ مساعی جمیلہ سے کام لیتے رہے جب ملک کی تقسیم ہوئی تو آپ پاکستان چلے گئے اور کراچی میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے نام سے کام شروع کیا۔ اور خوب کام کیا۔ انکی خدمات کے صلہ میں

پاکستان سرکار نے ان کو دس ہزار روپیہ نقد بطور انعام عطا کیا۔ مگر آپ اسے اپنے مصرف میں نہیں لائے اور اردو کی ترویج اور اشاعت کے کاموں میں اسے لگا دیا۔ ان کی کوشش سے کراچی میں اردو کالج قائم ہوا۔ اور اب انکا ارادہ اردو یونیورسٹی قائم کرنے تھا۔ گو آپ پر بڑھاپا چھا چکا تھا مگر آپ کی ہمت اور ارادی قوت کافی جوان تھی۔ کہا کرتے تھے۔ کہ کسی مقصد کی تکمیل کے لئے عظیم جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے۔ کہ آپ نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ ایک مرتبہ ایک اخبار نویس کے سوال پر آپ نے فرمایا۔ کہ عرصہ ہوا میں نے اردو سے شادی کر لی تھی۔ اس لحاظ سے آج ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ اردو بیوہ ہو گئی! ادارہ "رہنمائے تعلیم" مولوی عبدالحق صاحب کی وفات کو اردو زبان کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیتا ہے۔ اور دعاگو ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور پس ماندگان کو صبر و حوصلہ بخشے۔ آمین۔ (راقم جگت سنگھ

رانا محمد بہاء الحق اشک

قطعۂ تاریخ وفات بابائے اردو

در باغ جناں گشت چو عبدالحق ضیف
از ہجر او زندگی ملئے کیف
(اشک) خراب مرا اشک خبر داد طیف
ویرانہ بشد گلشن اردو صد حیف

۱۳ ۸۱

قدرت اللہ شہاب

مولانا عبدالحق کی یاد میں

بابائے اردو کی وفات کی خبر سن کر ایسا محسوس ہوا گویا ہمارے سر سے ایک شفیق اور مہربان کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ جو ہر وقت ہماری مدد اور رہنمائی کے لئے تیار رہتا تھا۔

ابھی یہ کل کی بات نظر آتی ہے۔ کہ کراچی میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اس روز جب ہم نے گلڈ کی ممبر شپ کا رجسٹر کھولا تو سب سے پہلے بابائے اردو نے اپنی سفید شیروانی کی جیب سے نیلے رنگ کا قلم نکال کر رجسٹر میں سر فہرست اپنا نام لکھا۔ جب رجسٹر میں "عبدالحق" کے دستخط ثبت ہوئے تو یہ نظر آتا تھا کہ سرسید۔ حالی۔ شبلی سے لے کر اقبال تک اور اقبال سے لے کر ہماری سب سے کم عمر ممبر ڈھاکہ کی ام عمارہ تک ادب اور ثقافت کی ایک مکمل تاریخ گلڈ کو اپنی شرکت سے نواز رہی ہے۔

اس کے بعد جب بھی گلڈ کا کوئی اہم اجلاس ہوا بابائے اردو اپنی مجبوری اور بیماری کے باوجود اس میں ضرور شرکت کرتے ایک بار ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ ہم نے سوچا کہ ان کو گلڈ کے جلسے میں شامل ہونے کو تکلیف نہ دی جائے۔ ابھی جلسہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ لیکن جو صاحب نشینین کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے جلسہ گاہ میں پہنچے۔ وہ "بابائے اردو" تھے آتے ہی بگڑ کر بولے۔ "آجکل سعادت مندی کا مفہوم بگڑ گیا ہے آج کل کے نوجوان چاہتے ہیں کہ بزرگوں کا نام تو لیا جائے، ان سے کام نہ لیا جائے۔ لیکن یاد رکھو، عبدالحق کے ہاتھ پاؤں ابھی چلتے ہیں تمہارا پیچھا آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ تم ایک مفید تحریک چلا رہے ہو"

دو ماہ قبل جب صدر مملکت کی دعوت پر بابائے اردو مری کے فوجی ہسپتال میں داخل ہوئے تو صدر ایوب ان سے ملنے کئی بار ہسپتال گئے اور ہر بار واپسی پر صدر ایوب نے نہایت عقیدت سے یہی کہا کہ اگر انسان کی زندگی پہ کسی بلند مقصد کا جنون چھا جاتے تو وہ مولوی عبدالحق کی طرح بڑھاپے، بڑھاپے اور بیماری میں بھی تندرست رہتا ہے۔

جس وقت مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ جگر کے سرطان کا مرض لاعلاج طور تک بڑھ چکا ہے تو انھوں نے صدر ایوب سے اصرار کیا کہ انھیں کراچی بھیج دیا جائے تاکہ وہ اپنے آخری ایام انجمن اردو کے قدموں میں گذار سکیں۔

۱۵ اگست کی صبح کو جب تیز گام گاڑی راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن پر آ کے لگی۔ تو فوجی ہسپتال کے وردی پوش جوانوں نے مولوی صاحب کا بستر بہت بڑی احتیاط سے ان کے کوپے میں پہنچا دیا۔ ایوان صدر کے

جلیل قدوائی

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا....

صدا گونجی ہوئی ہے "ہائے اردو" / جہاں سے اُٹھ گئے بابائے اردو
نہیں ویراں ہوئی اک انجمن ہی / کہ سونی ہو گئی دنیائے اردو
محبانِ ادب کم ہیں کہ ایسا / کہاں سے لائے اب شیدائے اردو
سنبھالے جیتے جی کیا خوب امروز / نہ جانے کیا ہو اب فردائے اردو

بابائے اردو کی زندگی سے ہمیں دو سبق ملتے ہیں۔ ایک زندگی میں کسی اعلیٰ مقصد اور نصب العین کو تلاش کرنا، دوسرے اس مقصد کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دینا آپ دیکھیں گے کہ ایسی زندگی میں ہمہ وقت جوانی کا جوش اور عزم اور حوصلہ نیز غیر معمولی توانائی لگن اور وسعت کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں چونکہ وہ بلند مقصد سامنے ہوتا ہے اسے پورا کرنے کی خاطر اپنی زندگی میں بڑی احتیاط کے ساتھ باقاعدگی، بے پایاں انسان خود پیدا کر لیتا ہے حالی نے کیا خوب کہا ہے :-

ہو جب کر دو آغاز کوئی کام بڑا / ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

بلاشبہ بابائے اردو ہر لحاظ سے مولانا حالی کے سچے جانشین اور پیرو تھے اور اپنے انداز تحریر میں حالی کے نقش قدم پر چلنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی زندگی کو بھی حالی کے بتائے ہوئے مندرجہ بالا اصول پر ڈھال لیا تھا ـــــ اردو کیلئے انہوں نے جو کام کیا وہ سینکڑوں آدمیوں اور تنظیموں کا کام تھا اگر ان کے ہزاروں ادبی پسماندگان میں سے کوئی ایک بھی ان کا صحیح جانشین نکل آئے تو آجکل کے ترقی یافتہ وسائل کی بدولت وہ اردو کو ساری دنیا میں مقبول بنا سکتا ہے ـــــ مگر اصل امتحان تو یہ دیکھنا ہے کہ ان کی آخری تمنا اردو یونیورسٹی کو اینٹ اور گارے کیلئے خاک و خون کون پیش کرتا ہے ؎ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ÷ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد!

صفحہ ۲۲۶ سے آگے:- ایک ڈاکٹر ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے آکسیجن کے سلنڈر اور دواؤں کے ڈبے کو بے چین رکھنے تھے مولوی صاحب نے آنکھیں کھول کر سب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہر ایک کو باری باری خدا حافظ کہا ان کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک اور آواز میں وہی مخصوص گرج تھی۔ ایسی گرج اور چمک نے پچھلی نصف صدی کے ہر سیاسی ثقافتی اور ادبی طوفانوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا اور آج اگرچہ ان کا جسم خاکی زیر زمین چلا گیا ہے لیکن ان کی شخصیت کی چمک اور ان کے عظیم کارناموں کی گونج ہماری تاریخ میں ہمیشہ زندہ و سلامت رہے گی (بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ اکتوبر ۶۱ء)

مجید شاہد

اعظم خان

اعظم خان کراچی کے ایک اسکول میں دسویں جماعت کا طالب علم ہے۔ وہ اپنے وطن سوات سے کراچی اس لئے آیا کہ یہاں تعلیم حاصل کر سکے۔ بابائے اردو کی بیماری کا حال اس نے اخبارات میں پڑھا۔ اور ان کے پاس جناح اسپتال پہنچا اور ان کی خدمت اور تیمارداری میں مصروف ہو گیا تقریباً تین ماہ تک اس نوعمر طالب علم نے جس توجّہ سے بابائے اردو کی بے لوث خدمت کی اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ بابائے اردو اس طالب علم پر بہت شفقت فرماتے تھے، اور کہتے تھے "میری جتنی خدمت اس طالب علم نے کی ہے، زندگی بھر میں کسی نے نہیں کی" صرف بابائے اردو نے نہیں بلکہ پوری قوم نے اس نوعمر طالب علم کے جذبۂ خدمت کو سراہا صدر مملکت پاکستان نے بھی اس کی ہمت افزائی کی اور تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیا۔۔۔ مجید شاہد صاحب نے اعظم خان کے جذبہ خدمت سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی ہے جسے ہم معاصر انجام پشاور (۲۰/۹/۱۹۶۱ء) کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ (ادارہ)

ایک پشتو بولنے والا جیالا نوجوان
جس کی تربیت ہوئی گہوارہ گل پوش میں
وہ جو کھیلا فطرتِ آزاد کے آغوش میں

جو پلا پوسا زمیں پر لالہ و گل کی طرح
شورخ جھرنے لوریاں دیکر سلاتے تھے جسے
نیند آجاتی تھی جس کو پتھروں کی سیج پر

ہاں اٹک کے پار پشتر دیس کا وہ نوجواں
عام لوگوں کی طرح ملت کا اک گمنام فرد
علم کا طالب مگر سرچشمۂ عزم و عمل

چل کے اتنی دور سے آیا کراچی دیس میں
تاکہ اس بستی کے فرزانوں پہ ثابت کرسکے
آہنی سینہ گدازِ قلب سے معمور ہے

ایک اعظم خان جس نے سرزمینِ پاک پر
خانماں برباد لوگوں کو بسانے کے لئے
بستیاں تازہ بہ تازہ نو بہ نو آباد کیں

ایک اعظم خان جس نے والہانہ عزم سے
خدمتِ بابائے اردو کا شرف حاصل کیا
وہ بھی ان کی زندگی کے آخری ایام میں

ان گنت ماتم گساروں میں کوئی ایسا بھی تھا
بے غرض تیماردار و باوفا خدمت گذار
ایسا مقصد، ایسا جذبہ، ایسی دھن، ایسی لگن

صرف دکھلاوے کا ماتم کرنے والوں میں کہاں
زندہ باد اے سرگروہ دردمنداں زندہ باد
اور کوئی ہو نہ ہو، اردو تیری ممنون ہے

بسلسلہ ص۱۲۰

تیاری میں بڑی دیر لگ گئی۔ مترجمین نے عموماً بے پروائی برتی اور کام بہت ناقص رہا۔ موصوف کو دیدہ ریزی سے نظرِ ثانی اول سے آخر تک کرنا پڑی، اور آخر میں انہیں بڑا سہارا ڈاکٹر سید عابد حسین (جامعہ ملیہ والے) کا ہاتھ آ گیا ——— یہی وہ کتاب ہے جو برسوں بعد انگلش اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری کے نام سے طبع ہوئی۔

اسی بنا پر موصوف کا ارادہ اس کے مقابل اردو سے انگریزی ڈکشنری تیار کرانے کا تھا اور اردو کا ایک ضخیم و فاضلانہ لغت بڑے اہتمام سے تیار کرانا تھا چنانچہ یہ کام مولوی احتشام الدین دہلوی ایم اے (علیگ) سے شروع بھی کرا دیا تھا۔ ان مولوی صاحب کو لغت کے کام سے خاص مناسبت تھی۔ بڑی جامعیت کے ساتھ وہ کام کر رہے تھے کہ بیچارہ کا بلاوا اللہ کے ہاں سے آ گیا اور کام ناتمام رہ گیا۔ دہلی میں مرحوم کے مسودۂ اوّل کے کچھ اجزا نظر سے گزرے تھے اور دل بے اختیار داد و تحسین پر مجبور ہو گیا تھا ——— عجب نہیں کہ دوسرے بیش بہا مسودوں اور کتابوں کی طرح یہ مسودہ بھی دہلی میں ۱۹۴۷ء کی آتش زنی کی نذر ہو گیا ہو۔

۱۹۱۷ء میں حیدری صاحب (بعد کو حیدر نواز جنگ) اور راس مسعود صاحب (بعد کو مسعود نواز جنگ) نے مل کر جو عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی اور ملک میں پہلی بار ایک اردو یونیورسٹی کا تخیل عملی شکل میں پیش کیا اس میں بھی بڑا دخل موصوف ہی کی تحریک کو تھا۔ یونیورسٹی کلاسوں کے کھلنے سے قبل نصابی کتابوں کی تیاری کے لئے ایک "سررشتۂ تالیف و ترجمہ" قائم ہوا۔ موصوف مترجمین کے صدر یا سررشتہ کے ناظم قرار پائے اور موصوف ہی کی تحریک پر میں بھی بہ حیثیت مترجم فلسفہ و منطق، تار پر لکھنؤ سے طلب کیا گیا۔ دوسرے مترجمین الیاس برنی مرحوم، قاضی تلمذ حسین مرحوم، سید ہاشمی فرید آبادی وغیرہم تھے۔ میں تو کچھ کم ایک سال بعد استعفا دے کر لکھنؤ واپس چلا آیا۔ موصوف بھی کچھ روز بعد اورنگ آباد واپس چلے گئے۔ ابھی اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہو کر وہ ہی ایک سال وہاں رہنے پائے ہوں گے کہ ان کے رفیقِ قدیم مولوی وحید الدین سلیم کے انتقال سے خود عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسری کی جگہ خالی ہو گئی اور غالباً ۱۹۲۱ء میں موصوف اس جگہ پر آ گئے۔

چند سال بعد جب اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تو اردو کے کام کو مزید ترقی دینے کی دھن میں مرکز انجمن کو دہلی منتقل کرا لائے اور اب کام کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ پنشن کے بعد لوگ عموماً آرام ہی کیا کرتے ہیں مولوی صاحب میں اس کے برعکس اور زیادہ مستعدی و سرگرمی پیدا ہو گئی اور جہاں تک کام کرنے کا تعلق ہے ۹۰، ۹۲ سال کے سن میں موصوف کی جوانی گویا از سر نو لوٹ آئی اور اب وہ تحریکی کام کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں دورے بھی کثرت سے کرنے لگے۔ کبھی چندے کی غرض سے اور کبھی تحریک کو پھیلانے اور اردو کے سیاسی حریفوں سے نپٹنے کے لئے۔ چنانچہ واردھا میں گاندھی جی سے ان کا مکالمہ و مناظرہ اس دور کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

انہیں بڑی خوشی اور زبردست کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب انہوں نے گاندھی جی کے دست راست بابو راجندر پرشاد سے یہ معاہدہ منظور کرالیا کہ ملک کی آئندہ زبان "ہندوستانی ہوگی، دیوناگری اور فارسی دونوں لکھاوٹوں میں" ـــــ تاریخ کی اس ستم ظریفی کو کون پا سکتا تھا کہ اس محترم و مقدس نوشتے کی مٹی پلید اس وقت پلید ہوگی جب بابو صاحب ـ ڈاکٹر راجندر پرشاد ہوکر جمہوریہ ہند کی کرسی صدارت کو زینت دے رہے ہونگے۔

موصوف زندگی بھر بیوی بچوں کے بکھیڑوں سے آزاد رہے اور پوری یکسوئی کے ساتھ وقت کا ایک ایک لمحہ اردو کے کام کے لئے وقف رکھا۔ شادی سرے سے کی ہی نہیں۔ ایک پرانے رفیق منشی ظفر الملک علوی مرحوم کا کوروی سے یہ روایت سننے میں آئی تھی کہ شادی ٹھہر گئی تھی، مگر بارات جس وقت پہنچی، اسی وقت کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا جس سے متاثر ہوکر موصوف نے عمر بھر مجرد رہنے کا عہد کر لیا ـــــ میں نے ایک زمانے میں اپنے معاصرین کے کچھ قلمی خاکے تیار کر ڈالنے چاہے تھے۔ ان میں ایک عنوان رکھا تھا "بوڑھا کنوارا"۔ اس سے اشارہ انہی مرد باہمت کی جانب تھا اور اس میں تصریح تھی کہ انہیں جو عشق صادق بیاہتا بیوی سے ہوتا تھا قدرت نے وہ ساری توانائی ان کے دل میں اردو کے لئے منتقل کر دی۔

مستقل کتابوں کے علاوہ درجنوں مقدمے لکھ ڈالے اور درجنوں ہی تبصرے۔ کسی ظریف نے (اور وہ غالباً ان کے ہمدم و مخلص سید محفوظ علی بدایونی مرحوم تھے) ان کا لقب ہی اس وقت "اردو کے مشہور مقدمہ باز" رکھ دیا تھا۔ ہزاروں صفحے خود لکھ ڈالے، اور ہزارہا، ہزار ہا کیا معنی لاکھوں لاکھ صفحے دوسروں سے لکھوا لئے ـــــ اردو میں جیسا کہ تحریر تھا ظاہر ہی ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی تحریر پر بھی عبور حاصل تھا چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لندن) کے پہلے ایڈیشن میں جو مقالہ "اردو" پر ہے وہ انہیں کے قلم سے ہے،

اخلاقی خوبیاں بھی بہت سی جمع تھیں، دیانت سچائی، فرض شناسی، مروت، تواضع، فیاضی، مہمان نوازی، تنگ دستوں، پست حالوں کے ساتھ ہمدردی، متانت، اخلاص، اپنے کو پیچھے رکھ کر دوسروں کی حوصلہ افزائی اتنی خوبیوں کی جامعیت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔

صحت کا زندگی بھر خاص اہتمام رکھا۔ صبح سویرے بہت دور تک پیدل چلنے کی عادت پابندی سے جاری رکھی۔ غذا اعلیٰ قسم کی پسند کرتے خصوصاً چائے، لیکن مقدار کی مقدار ہمیشہ کم ہی رکھتے، اور ملیں مسی کے بعد غسل کا التزام رکھتے ان احتیاطوں کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ صحت بہت اچھی رہی اور بیمار کبھی شاذ و نادر ہی پڑتے ـــــ کام کی مصروفیت کے آگے بیمار پڑنے کی فرصت ہی انہیں کب ہوتی۔

موصوف کے مذہبی عقائد سے متعلق چہ میگوئیاں ان کے مخلصوں، رفیقوں کے حلقوں میں بھی ہوتی رہی ہیں مگر مجھ سے جو روایت ان کے ایک نامور ہم نام اور بڑے بزرگ، مسلمان، فضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرانی مرحوم نے بیان کی ہے وہ بجائے خود بہت وزن رکھتی ہے روایت

سے پہلے سن لیجئے کہ شہر مدراس میں ایک بڑا وسیع علاقہ اڈیار کہلاتا ہے جو ہندوستان ہی کے نہیں، روئے زمین کے تھیا سوفسٹ گروہ کا مرکز ہے۔ اس احاطہ میں جہاں ہر مذہب و ملت کی عبادت گاہیں بنی ہوئی ہیں وہیں مسلمانوں کی ایک مسجد بھی ہے۔ افضل العلماء مرحوم بیان کرتے تھے، کہ بابائے اردو مدراس آئے ہوئے تھے میں انہیں سیر کرانے اڈیار بھی لے گیا۔ شام ہو رہی تھی۔ مسجد کی ویرانی دیکھ کر بابائے اردو بہت ہی متاثر ہوئے اور بولے کہ نماز کہیں ادا ہو یا نہ ہو یہاں ضرور ہی پڑھنی چاہیے۔ چنانچہ یہ کہہ کر بڑھے اور خود ہی بہ آواز بلند مسجد میں نماز مغرب کی اذان دی۔

غیرت دینی کا یوں ثبوت دے گزرنے والے کے ساتھ حق تعالیٰ رحمت و مغفرت کا جو بھی معاملہ فرمائیں کم ہے: (صدق جدید لکھنؤ۔ یکم ستمبر ۱۹۶۱ء)

بقیہ:—

بابائے اردو کی شخصیت نگاری

(بسلسلہ صفحہ ۱۴۲)

منافقت کے احساس نے مولوی صاحب سے یہ مضامین لکھائے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے شخصیتوں کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ زندگی سے بھرپور ہیں۔ یہی بات اس طرح بھی کہی جاسکتی ہے کہ مولوی صاحب نے یہ مضامین لکھنے کے لئے ہم عصروں کے مرنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ ان کو موجودہ پاکروں کی تسکین کے لئے ان کی لفظی تصویریں تیار کرلیں اور یہ اچھا ہی ہوا کہ مولوی صاحب نے کسی زندہ انسان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اگر چند ہم عصر کے مضامین متعلقہ لوگوں کی زندگی کے دوران میں لکھے جاتے تو اردو ادب ایک متاع گراں مایہ سے محروم رہ جاتا۔

چند ہم عصر جہاں دوسروں کی داستان ہے وہیں اس میں خود نوشت سوانح عمری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان خاکوں سے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ان کے سوانح نگار کے لئے بنیادی مواد اسی کتاب سے مل سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہنی رجحان کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کا مشاہدہ بھی اسی دریچے سے ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگیوں کو مولوی صاحب نے اپنا موضوع بنایا ہے، ان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت خود مولوی صاحب میں بھی موجود ہے وہ سرسید کی طرح ثقافتی رہنما ہیں، حالی کی طرح سادگی پسند ہیں محمد علی جوہر کی طرح جذباتی ہیں۔ میرن صاحب کی طرح وضع دار ہیں اور نام دیو مالی کی طرح کام سے عشق رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اردو ادب کو شخصی مرقع نگاری کا سلیقہ سکھایا ہے۔ انسان کو سمجھنے کا انداز دیا ہے، شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کی راہ سجھائی ہے۔ یہ مرقعے زندگی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ان سے زندگی بسر کرنے کے فن کی نزاکتوں کا پتہ چلتا ہے اور نشیب و فراز زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مرقعے اردو کے سوانحی ادب کی آبرو ہیں:

(روزنامہ جنگ کراچی)

۲۳ اگست ۱۹۶۱ء

حمایت علی شاعر

بابائے اردو

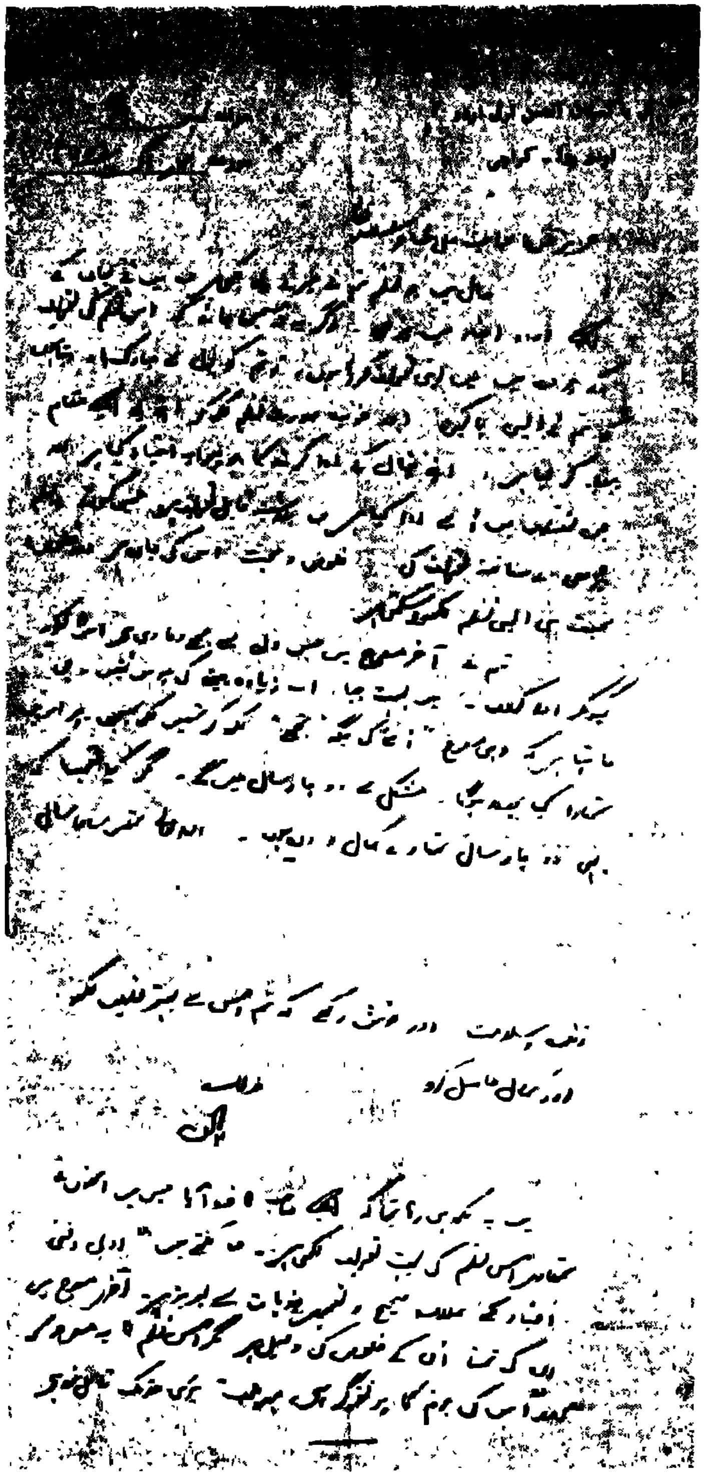
ایک دعا—جو قبول نہ ہو سکی)

اک چراغ کہ روشن ہے انجمن کے لئے
اک دماغ نہ مشعل ہے اہل فن کے لئے
جل رہا ہے کہ اوروں کو روشنی مل جائے
وں کی آنچ، نگاہوں کا نور زندہ رہے
ال و خواب کی راہوں کا نور زندہ رہے
یں یہ حرف تمنا کے پھول ہنستے رہیں
ہاں دل کے یہ ننھے رسول ہنستے رہیں

ر یہ بات کہ دل کو زباں نصیب نہیں
، فکر کو حسن بیاں نصیب نہیں
ں یہ کاغذی پھولوں کی مسکراہٹ ہے
یں جھوٹے نگینوں کی جگمگاہٹ ہے
ت درد کو اذن فغاں نصیب نہیں
، زمیں ہے جسے آسماں نصیب نہیں

سوچتا ہوں کہ وہ ہے چراغ آخر شب
اس کی بزم کا ہر نغمہ گر ہے مہر بہ لب (۱)
جانے وقت کی تقدیر میں لکھا کیا ہے
اغ آخر شب کی حیات کا، کیا ہے
ا کرے کہ اسے میری زندگی مل جائے

بابا نے اپنے خط میں اس مصرع کی طرف
ں طور سے اشارہ کیا ہے، خدا کرے
ری "مہر بہ لبی" کو زباں مل جائے۔



ھائے آفتاب اردو غروب ہوگیا *

۱۹۶۱ع



قطعہ تاریخ وفات

از

افسر صدیقی امروہوی

حسرتا ! بابائے اردو کی الم افزا وفات — کیا کہوں کیا خاطر محزوں کا عالم ہوگیا
بزم ارباب ادب پر چھاگئی اک بے بسی — چہرۂ اہل بصیرت روکش غم ہوگیا
اب وہ نقد و تبصرہ کی جلوہ افروزی کہاں — یک بیک شیرازۂ تحقیق برہم ہوگیا
اس طرح اب کون ہوگا وقف اردوئے قدیم — جس کے دم سے تھا یہ ہنگامہ وہ بیدم ہوگیا
از سر اندوہ افسر نے کہی تاریخ فوت — دفتر اردو کا اک اجلا ورق کم ہوگیا

۱۳۸۱ھ

* نتیجۂ فکر مولوی زکریا مائل

زیر اہتمام محمد مصلح الدین سعدی (عثمانیہ) منیجر انجمن پریس نے چھاپ کر دفتر انجمن ترقی اردو پاکستان
اردو روڈ کراچی سے شائع کیا قیمت فی پرچہ :- ایک روپیہ پچھتر پیسہ قیمت سالانہ :- پانچ ا
مدیر :- مشفق خواجہ